تیس سال بعد

پہلا سفر اور ہمارے کتب خانے

دو کتابیں یکجا، اضافوں کے ساتھ

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

956.1 Abdi, Raza Ali
Tees Saal B'ad / Raza Ali Abdi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2012.
230pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

2012

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2579-5
ISBN-13: 978-969-35-2579-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

تمیں سال پہلے

ننھے بچے کا پہلا قدم۔۔۔اس کا پہلی بار ماں کہنا۔۔۔اسکول میں پہلا دن۔۔۔پہلی ملازمت۔۔۔پہلی محبت

یہ سب یوں یاد رکھا جاتا ہے جیسے ساری دنیا کی تاریخ ایک طرف اور اُس ماں کے لاڈلے کی زندگی دوسری طرف۔

مجھے بھی اسکول میں اپنا پہلا دن یاد ہے' اپنی کسی شرارت کی وجہ سے نہیں' اپنی حماقت کے ہاتھوں۔

سوال تھا۔ بیس میں پانچ کتنی بار شامل ہیں؟

میں نے لکھا۔ پتہ نہیں۔

یہ جواب بھی کچھ اتنا غلط نہ تھا۔ خود ہی سوچئے کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بیس میں پانچ کتنی بار شامل ہے تو اسکول جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اس سے میں نے جو بات سیکھی وہ پانچ کا پہاڑا یا تقسیم کا عمل نہیں تھا۔ اس سے میں نے جو بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی وہ یہ کہ زندگی کے ہر میدان میں پہلا قدم اٹھا کر انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا ضرور ہے۔ ایسا تجربہ آخر میں ہم سے یہ سطر لکھواتا ہے کہ پس اس سے ثابت ہوا کہ معاملہ یوں ہے' یوں نہیں۔

اب یہ سطر میں شروع ہی میں لکھتا چلوں کہ زندگی میں پہلا سفر کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ پس اس سے ثابت ہوا کہ کسی جگہ کو پہلے پہل دیکھنے سے جو اچھوتے مشاہدے ہوتے ہیں' اسی مقام کو بار بار دیکھیں تو اس کا اچھوتا پن جاتا رہتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار راولپنڈی گیا' اور یہ بات سنہ ساٹھ کی ہے' تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا

کے صدر کے علاقے میں بجلی کے کھمبے نہ تو سڑک کے کنارے لگے ہیں اور نہ بیچوں بیچ' بس عجب بے تکی سی جگہ لگے ہیں اور سارا ٹریفک ان سے بچتا بچاتا چل رہا ہے اور روز کے روز اس راہ سے گزرنے والوں کو احساس تک نہیں کہ یہ بے ڈھب کھمبے ہر ایک کی راہ میں حائل ہیں اور یہ کہ یہ کیسے نرالے کھمبے ہیں کہ سڑک کے کنارے پر نہیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہی سڑک کبھی تنگ تھی اور اس کے کنارے کھمبے لگے ہوئے تھے۔ کسی نے آ کر سڑک چوڑی کر دی تو وہی کھمبے سڑک کے بیچ میں آ گئے۔

اسی طرح ایک بار میرا خیر پور جانا ہوا۔ شہر کی بہت مصروف سڑک کے کنارے میں نے عجیب منظر دیکھا' یا یوں کہیے کہ مجھے عجیب لگا۔ اور وہ یہ کہ کوئی شخص وہاں کوڑے کے ڈھیر پر اپنا بھاری بھرکم لیکن بیکار ٹرک پھینک گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ کوڑے کے ڈھیر پر وہ ٹرک کافی عرصے سے پڑا زنگ کھا رہا تھا۔ اوپر سے غضب یہ کہ بلدیہ سمیت کسی کو یہ احساس تک نہ تھا کہ کوڑے کے ڈھیر پر کوئی اپنا بیکار ٹرک پھینک گیا ہے۔

کچھ عرصے بعد میرا دوبارہ خیر پور جانا ہوا۔ اس مرتبہ یہ بی بی سی کا دورہ تھا اور ہمیں وہاں سے خیر پور کے بارے میں کچھ پروگرام نشر کرنے تھے۔ اس میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں کہ کوڑے کے ڈھیر پر وہ ٹرک اسی طرح پڑا تھا۔ بس یہ ضرور ہے کہ اس کو کچھ زیادہ زنگ لگ گیا تھا۔ میں نے علاقے کے لوگوں کو دکھایا۔ انہوں نے حیرت سے دیکھا اور منہ سے کہے بغیر صاف صاف کہا' کوڑے کے ڈھیر پر ٹرک پڑا ہے تو کیا ہوا؟' اسی شام ریڈیو پر اس کا ذکر نشر ہو گیا۔

اگلے روز میرا ادھر سے گزر ہوا تو نہ صرف وہ ٹرک بلکہ اس کے نیچے جمع مہینوں پرانا کوڑا بھی اٹھایا جا چکا تھا البتہ میری تصور کی آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ اُٹھانے والوں نے دل ہی دل میں میری شان میں کیا کیا نہ کہا ہوگا مثلاً یہ کہ آ گئے ولایت سے فلاں کے فلاں۔

پس اس سے جو کچھ ثابت ہوا اب اس کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں۔

یہ بات ۱۹۸۲ء کی ہے۔ مجھے بی بی سی لندن سے وابستہ ہوئے پورے دس برس ہو رہے تھے۔ میں بہت سے مقبول پروگرام نشر کر چکا تھا اور برصغیر میں ہمارے سامعین مجھ سے خوب خوب واقف تھے۔ حکام بالا نے اُس وقت فیصلہ کیا کہ مجھے پاکستان اور بھارت کے دورے پر بھیجا جائے۔ دو باتیں طے ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ میں مختلف شہروں میں اپنے سننے والوں سے ملاقاتیں کروں۔ دوسرے یہ کہ پرانے پرانے کتب خانوں کا جائزہ لوں اور ایک پروگرام ترتیب دوں جس کا بنیادی خیال یہ ہو کہ ہمارے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ میری تصنیف 'کتب خانہ' میں اس کا سارا احوال درج ہے۔ بعض لوگ کتاب کے نام سے خدا جانے کیا سمجھ بیٹھتے ہیں اور اسے نہیں پڑھتے ورنہ کتابوں کے خزانوں کا حال خود کسی خزانے سے کم نہیں۔

اس موضوع پر ریڈیو کا دستاویزی پروگرام بھی نشر ہوگیا اور اس پر مبنی کتاب بھی وجود میں آ گئی۔ مگر اس سفر کا دوسرا پہلو تاریکی ہی میں رہ گیا۔ اور وہ یہ کہ میں شہر شہر گیا اور ان گنت لوگوں سے ملا۔ یہ تو کوئی جان ہی نہ سکا کہ میں نے کہاں کہاں کیا کیا دیکھا' مجھ پر کہاں کیا گزری اور میں نے اپنے مشاہدے کی جھولی میں کیا کیا بٹورا۔ کہنے کو تو یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن اب پلٹ کر دیکھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ وہ جو پہلا پہلا مشاہدہ تھا' وہ جو اَن دیکھے نظارے تھے' وہ جو ہر بات نئی نئی تھی اور وہ جو نئے نئے سفر میں ایک عجب سا ولولہ ہوتا ہے اس نے ذہن پر کیسے کیسے نقش ابھارے' اُن کا ذکر تو رہ ہی گیا۔

اس واقعے کو اب تیس برس ہونے کو ہیں۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور ان لمحوں کو سوچنے کے جتن کرتا ہوں تو کچھ دھواں دھواں سا نظر آتا ہے۔

ایسے میں ایک عجب واقعہ ہوا۔ میرے کاغذوں کے ایک پلندے سے وہ تحریری یادداشتیں نکل آئیں جو میں نے اُن ہی دنوں جب ساری یادیں تازہ تھیں' درج کر لی تھیں' کچھ ریڈیو پر سنانے کو اور کچھ بعد میں لکھنے کے خیال سے۔ اب تین دہائیوں کے بعد جو انہیں پڑھا تو لگا کہ یہ میری نہیں' کسی اور کی تحریر ہے۔ جو کچھ میں نے پڑھا وہ ذہن میں کہیں محفوظ نہ تھا۔ اوپر سے یہ کہ اُس میں کھوج لگانے کے عمل نے کچھ اور طرح کی تاثیر شامل کر دی تھی۔ وہی جس کے بعد کہہ سکتا ہوں کہ پس ثابت ہوا کہ اہل انگلستان جو ہر بات کے نوٹ بناتے جاتے ہیں' اس میں بھی غضب کی حکمت ہے۔

کہہ نہیں سکتا کہ یہ میرے تجربے ہیں' یا مشاہدے یا اُن کونپلوں کا احوال جو اب پک جانے والی فصل سے کتنی جدا اور کس قدر مختلف نظر آتی ہیں۔

یہ فیصلہ میں اپنے قاری پر چھوڑتا ہوں' خصوصاً ایسے قاری پر جس کی نگاہ سے میری دوسری تصانیف گزری ہیں۔

اس پرانے جذبے کی جدید تحریر کو شائع کرنے کا ایک مقصد یہ دیکھنا بھی ہے کہ سنہ اسّی کی دہائی کے شروع برسوں میں برصغیر میں زندگی کا ڈھب کیسا تھا اور بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت لوگ کیسے جیتے تھے۔ کیونکر زندہ رہتے تھے۔

یہ قدر میری دوسری کتابوں میں بھی مشترک ہے۔ جرنیلی سڑک' شیر دریا اور ریل کہانی میں زور سفر کی روداد پر نہیں' بلکہ بعد والوں کے لئے سفر کے لمحات کا ریکارڈ چھوڑ جانے پر ہے۔ اُس وقت زندگی کس طور پر گزر رہی تھی' یہ رقم کر جانے پر ہے۔

اپنے اس سفر میں جن نوجوانوں سے ملا تھا' اب کسی کے بقول ان کے بالوں سے برف الجھنے لگی ہوگی'

جن ڈھلتی عمر کے شفیق اور کرم فرمانے والوں کی رفاقت میں عنایات کی جھڑی لگی تھی وہ کب کے سدھارے اور یہ احساس چھوڑ گئے کہ جس قدر میں انہیں سوچتا ہوں اسی قدر وہ بھی مجھے یاد کرتے ہوں گے۔

سارے احساس محو ہو جاتے ہیں' محبتوں کا احساس مٹائے نہیں مٹتا۔ میری یہ تحریر بھوپال کے جہاں قدر چغتائی مرحوم سے لے کے سندھ کے الغوزہ نواز خمیسو خان تک بے شمار نفیس انسانوں کے نام ہے کہ جب تک میں ہوں' اپنی ہتھیلیوں میں ان کی ہتھیلیوں کی وہ ہلکی ہلکی سی حرارت محسوس کرتا رہوں گا۔

رضا علی عابدی

لندن۔ جنوری ۲۰۱۰ء

آج تیس سال بعد

ہمارے ایک استاد تھے۔ بے حد نیک اطوار' خوش اخلاق اور بچوں سے پیار کرنے والے۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ ان جیسے بھلے مانس دو چار ہی دیکھے ہوں گے۔ اکثر یاد آتے ہیں اور جب کہیں فرشتہ صفت لوگوں کی بات ہوتی ہے تو میں اُن ہی کی مثال دیا کرتا ہوں۔ مجھے نہ صرف وہ' ان کی شکل وصورت اور اُٹھنا بیٹھنا یاد ہے بلکہ جس طرح اپنی ماں کی پرستش کرتے تھے' وہ بھی اچھی طرح ذہن میں محفوظ ہے۔

بس ایک غضب ہے۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ انہیں میرے بارے میں سب کچھ یاد ہوگا۔ تعلیم سے میری دل چسپی اور ان کی ہدایتوں پر پابندی سے عمل کرنا وہ بھولے نہیں ہوں گے۔ اس کا سبب بھی ہے۔ وہ ہر روز' بلا ناغہ' اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے' ایک بار کسی حادثے میں ان کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی تو وہ اپنی ڈائری املا بول کر مجھ سے لکھواتے تھے۔ ایک بار تو امتحان کا پرچہ بھی اسی طرح لکھوانے چلے تھے لیکن کسی کے مشورے پر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ کس غضب کا اعتماد تھا۔

مگر پھر وہی چھوٹی سی بات۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں۔

میں اپنے اطراف میں دیکھتا ہوں۔ کتنے تھوڑے سے لوگ ہیں جو ہر روز اپنی ڈائری لکھتے ہیں۔ لیکن کتنے بہت سے لوگ ہیں جو اخبار میں اپنی قسمت کا حال دیکھتے ہیں' کسی کو دست شناسی کا دعویٰ ہو تو جھٹ اپنی ہتھیلی اس کے آگے پھیلا دیتے ہیں' کوئی زائچہ نکالنے کا ہنر جانتا ہو تو وہ بھی نکلوا لیتے ہیں۔ نجومیوں کی کتاب 'آپ کا سال کیسے گزرے گا' بھی پڑھتے ہیں اور لوگوں سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھتے پھرتے ہیں۔

ان سب کو اپنا مستقبل جاننے کی نہیں' آنے والی خوشیوں کی نوید سننے کی تمنا ہوتی ہے۔

ایک بار مجھے ایک ٹیلی وژن شو میں مہمان بنایا گیا جس میں پہلے ایک دست شناس صاحب اس روز کے

مہمان کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر جو کچھ بھی بتاتے تھے' سب اچھا اچھا ہوتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کبھی کوئی ناپسندیدہ بات نہیں بتاتے۔ کہنے لگے کہ ٹیلی وژن والوں کی ہدایت ہے کہ صرف اچھی اچھی باتیں بتایا کرو۔

پس ثابت ہوا کہ لوگ مستقبل میں صرف خوشیاں تلاش کرتے ہیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ ماضی کی خوشیوں سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنے کے کتنے کم جتن کرتے ہیں۔ بس کچھ فوٹو گراف' کچھ ویڈیو' کچھ آڈیو' بہت کم ان کا ذکر' کبھی کبھار ان کی بات اور بس۔

سچ تو یہ ہے کہ بڑی بڑی خوشیاں تو اکثر یاد رہتی ہیں لیکن وہ جو چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہوتی ہیں جو سرشاری کا خوشگوار احساس چھوڑ جاتی ہیں اور جو مل کر کسی بڑی خوشی کا سبب بنتی ہیں' انہیں یاد رکھنے میں جو لطف ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو انہیں کسی نہ کسی طرح یاد رکھ پاتے ہیں۔

ان باتوں کا زیادہ واضح احساس مجھے اُس وقت ہوا جب میں اپنی یہ ۱۹۸۲ء کی یادداشتیں ترتیب دینے بیٹھا۔ ان صفحات میں موسم بہار کے ان تمام جھونکوں کا ذکر آیا جو میرے وجود کے دریچے سے اندر آئے تو اپنے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں بھی لائے۔ وہ مجھے اتنی ہی عزیز ہیں جتنے شفاف گل دانوں میں آراستہ بڑے بڑے گل دستے۔

وہ ساری یادیں تازہ ہو جانے کے بعد کا مرحلہ ان سے بھی بڑھ کر نکلا۔

میں نے ٹھانی کہ اس داستان میں جن لوگوں کا ذکر آیا' انہیں تلاش تو کروں' ان کی خبر گیری کروں اور معلوم کروں کہ تین دہائیاں گزرنے کے بعد کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

اس جستجو میں کچھ دل دکھانے والے مرحلے بھی آئے کہ جن بزرگوں کے قرب کا میں نے فیض اٹھایا تھا' ان میں سے کتنے ہی چل بسے۔ چند ایک ابھی سلامت ہیں اور ان کا ہونا یوں غنیمت ہے کہ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی جیسی مثال وہ ہیں' کچھ عرصے بعد ان کا ذکر بھی رہ جائے گا تو میں اسی کو بہت جانوں گا۔

لیکن اس تلاش میں دل اس وقت کھل اٹھا جب یہی کوئی تیس سال پہلے ملنے والے پھولوں جیسے بچے اب ملے تو ان کی شادابی دیکھ کر میں کچھ یوں مسرور ہوا جیسے ان کی آج کی کامرانیوں میں کچھ تھوڑا بہت دخل میرا بھی ہے۔ ایک نسل کا اٹھ جانا اور نئی نسل کا اس کی جگہ لینا' وقت کی رسدگاہ میں یہ منظر دیکھ رہا ہوں تو ایک یہی احساس جاگ رہا ہے کہ مشاہدے بھی کسی نعمت سے کم نہیں کہ یہ بھی بڑا سرور عطا کرتے ہیں۔

میں نے ایک کام کیا ہے۔ ہر باب میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے، اُن سب کو تلاش کیا ہے۔ کسی کو ڈاک کے ذریعے، کسی کو ٹیلی فون پر اور چند ایک کو نئے زمانے کے کمپیوٹر پر۔ اس کے بعد میں نے ہر باب کے آخر میں 'تیں سال بعد' کے عنوان سے لکھا ہے کہ کون کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ ہر باب ۱۹۸۲ء میں لکھا گیا اور ضمیمہ ابھی ۲۰۱۲ء میں۔

پہلا پڑاؤ

ڈیزل کے دھوئیں میں اٹا ہوا کراچی اب بھی بڑا دل کش شہر ہے۔ یہی کراچی تو تھا جہاں ابھی تیس بتیس سال پہلے تک لوگ ہر شام نہا دھو کر' صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھوڑا گاڑیوں میں بیٹھا کرتے تھے اور بنگلور کی گلابی کھپریلوں اور لکڑی کی جعفریوں والے بنگلوں کے سامنے سے گزر کر غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے ایک طویل تنہا تنہا سی سڑک طے کر کے کلفٹن جایا کرتے تھے۔

اب یہی کراچی ہے جہاں ڈیزل کے دھوئیں نے سب کچھ یوں ڈھانپ لیا ہے کہ نہ سورج کا ڈوبنا دکھائی دیتا ہے نہ نکلنا۔ جس جگہ دو رویہ تاڑ کے درخت کھڑے سمندری ہوا میں جھوما کرتے تھے' وہاں اب ان گنت منزلوں کی عمارتیں کھڑی آسمان کو چوما کرتی ہیں' اسی فضا کی کثافت میں اَٹے ہوئے آسمان کو۔ اور عمارتیں بھی ایسی اور اتنی بہت سی کہ سُنا ہے ان میں رہنے کے لئے مکین نہیں ملتے۔ کہتے ہیں کہ خالی مکانوں میں دیو رہنے لگتے ہیں۔ بس اب شاید سورج کا نکلنا اور ڈوبنا اوپر کی منزلوں میں رہنے والے دیو ہی دیکھا کریں گے۔

میں کراچی پہنچتے ہی وہاں کے ہنگاموں میں کھو گیا۔ البتہ خود کھو کر میں نے یہ بھید پایا کہ کراچی میں خوش حالی چونسٹھ گنی ہو گئی ہے۔ جب روپے میں چونسٹھ پیسے ہوا کرتے تھے' اس وقت بھی کراچی کے گداگر اپنی ایک انگلی اٹھا کر ایک پیسے کا سوال کرتے تھے۔ اور اب جب سو روپئے میں یہی کوئی پچیس تیس روپے رہ گئے ہیں تو اب بھی گداگر اُٹھاتے تو ہیں وہی ایک انگلی لیکن اب ایک روپئے کا سوال' بلکہ مطالبہ کرتے ہیں۔

خوش حالی آئی ہے تو اپنے ساتھ دو چیزیں لائی ہے۔ گھر کی دیواروں کے اندر وی سی آر اور دیواروں کے باہر سنیاسی باوا' عاملوں اور پروفیسروں کے اشتہار۔ ''نفرت محبت میں بدل سکتی ہے۔ وہ تمنا ہی کیا جو پوری نہ ہو۔'' ملازمت' شادی' امتحان میں کامیابی' دوستی' دشمنی' یہ ساری نعمتیں سنیاسی باوا اور پروفیسر لسبیلہ ہاؤس کے چوراہے پر بیٹھے لٹا رہے ہیں۔

سچ ہے، خوش حالی آتی ہے تو اسے کھا جانے والا گھن بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔

کراچی کے بازار اور کراچی کی دکانیں دیکھئے تو دیکھتے ہی رہ جایئے۔ فرش سے عرش تک غیر ملکی مال بھرا پڑا ہے۔ خریدار ہوں گے تبھی تو مال بھی ہے۔ کسی کو خیال آیا کہ لوگوں میں قومیت کا جذبہ ابھارا جائے چنانچہ بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے ہیں جن پر لکھا ہے۔ ''پاکستانی بنیئے۔ پاکستانی مال خریدیئے''۔

ہندوستانی بنیئے تو سنے تھے۔ پاکستانی بنیئے بھی ہوتے ہیں کیا؟

خیر۔ میں خوش اس بات پر ہوں کہ میں نے لوگوں کو خوش دیکھا۔ خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش گفتار اور خوش کردار۔

صاحب بھی عمدہ سے کرتہ شلوار پہنتے ہیں، ان کے ڈرائیور بھی قیمتی سا کرتہ اور شلوار زیب تن کرتے ہیں۔ کار کی پچھلی نشست پر خاتون بیٹھی ہوں اور اسٹرنگ پر شوہر، تو ٹریفک لائٹ پر ایک روپیہ مانگنے والا گداگر کہتا ہے۔ 'تمہاری جوڑی سلامت رہے''۔ اور کار کی پچھلی نشست پر خاتون بیٹھی ہوں اور اسٹرنگ پر شوفر ہو تب بھی گداگر کی وہی صدا ہے۔ 'تمہاری جوڑی سلامت رہے'۔

غرض یہ کہ لباس نے سارے امتیاز مٹا دیئے ہیں۔

غریب مزدوروں نے دوپہر کے کھانے کے وقفے میں نان کے ساتھ روکھی پیاز کھانے کا رواج اب ترک کر دیا ہے۔ لوگ اب بریانی کھاتے ہیں۔ وہ ممکن نہ ہو تو نہاری پر گزارہ کر لیتے ہیں، اور قورمہ تو کہیں گیا نہیں۔ دکان دار مال دیتا ہے تو گاہک اب شکریہ کہنے لگا ہے۔ مسافر کرایہ ادا کرتا ہے تو ٹیکسی ڈرائیور 'مہربانی' کہنے لگا ہے۔

ایک ایک روپے کے نئے نوٹ بڑے خوب صورت ہیں لیکن ریز گاری کا یہ حال ہے کہ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ سارے معاملے اب نوٹوں میں طے ہوتے ہیں۔ سکّے صرف مسجد کے چندے میں دیئے جاتے ہیں۔ حیرت تو اُس وقت ہوئی جب میں نے ریل کا ٹکٹ خریدا۔ تیس روپے دس پیسے کا تھا مگر بکنگ کلرک نے صرف تیس روپے لئے۔

تو کیا اس بیچارے نے دس پیسے اپنی جیب سے بھرے ہوں گے؟

جواب ملا، جی نہیں۔ جس مسافر کا ٹکٹ تیس روپے اسّی پیسے کا بنا ہوگا، اُس سے پورے اکتیس روپے لئے ہوں گے۔

خوش کرداری کا احوال یہ ہے کہ میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا۔ خود ٹیکسی ابھی چلی بھی نہیں تھی کہ اُس کا میٹر چلنے لگا۔ پھر جب دوڑ لگی تو ٹیکسی پیچھے رہ گئی، اس کا میٹر بہت آگے نکل گیا۔ منزل پر پہنچا تو میٹر نے ستائیس روپے بنائے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو ستائیس روپے پیش کرنا چاہے تو وہ بولا 'نہیں صاحب، میرا میٹر غلط ہے۔ آپ کسی

دوسری ٹیکسی میں واپس جائیں گے تو اس میں کرایہ کم بنے گا اور پھر آپ مجھے بددعا دیں گے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں بے ایمانی نہیں کر سکتا' بس بیس روپے دے دیجئے۔

میں نے بیس روپے بھی دیئے اور ڈرائیور کو دعا بھی دی۔

یہ دوسری بات ہے کہ جس ٹیکسی میں واپس گیا اُس کے میٹر میں پندرہ روپے بنے۔

یہ بھی کیا کم ہے کہ ٹیکسی والے نے اپنے میٹر کا غلط ہونا مان لیا۔ یہ بھی بڑا انقلاب ہے۔

میں ایک ٹیکسی سے اترنے لگا تو اُس کے ڈرائیور نے خدا حافظ کہا۔ یہ اُس سے بھی بڑا انقلاب ہے۔

ایسے موقعوں پر مجھے غریبوں پر پیار آتا ہے۔ اس پر یاد آیا کہ اُسی شام میں نارتھ ناظم آباد کی ریلوے لائین پار کر کے مزدوروں کی جھونپڑیوں کے درمیان چلا جا رہا تھا کہ ایک جھونپڑی سے کچھ محنت کشوں کے گانے کی آواز آئی جو دن بھر کی مشقت کے بعد اپنے کاندھوں سے تھکن کا بوجھ اُتارنے کے لئے ٹین کا خالی تسلا بجا بجا کر اور لہک لہک کر گا رہے تھے۔ میں نے اپنے تھیلے سے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور آواز دی۔ 'کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'

انہوں نے اپنے دروازے بھی کھول دیئے اور اپنی بانہیں بھی۔

دنیا میں غریب نہ ہوتے تو شاید محبت بھی نہ ہوتی۔

۸ر فروری ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

فروری کا پہلا ہفتہ اختتام پر تھا جب میرا طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس وقت شہر پر ڈیزل کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔

آج تیس برس بعد شہر پر دھواں تو پھیلا ہوا ہے لیکن وہ دھواں ڈیزل کا کم اور بارود کا زیادہ ہے۔ میں اخبار میں پڑھ رہا ہوں کہ اس روز میں ناظم آباد میں جس ریلوے لائین کو پھلانگ کر جا رہا تھا اور وہاں جھونپڑیوں میں دن بھر کے تھکے ہارے مزدور تغاری بجا بجا کر گا رہے تھے اور اپنا جی بہلا رہے تھے اور میری دستک سن کر اپنے دروازے مجھ پر کھول دیئے تھے، اخبار میں لکھا ہے کہ اسی جگہ کچھ غریب غربا بیٹھے تھے کہ کسی نے گولیاں چلا کر ان کو مار ڈالا۔

مگر عجیب شہر ہے۔ ایک شام گھائل ہوتا ہے، اگلی صبح کام پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ وہ بدن ہے کہ جس کا ایک عضو زخمی ہو تو پورا جسم نہیں کراہتا۔ اسے کہتے ہیں سخت جان شہر۔ ملک میں کہیں بھی بے چینی ہو، گرد شہر کراچی

میں اُڑتی ہے۔ دو چار روز گزار کر پھر دامن جھاڑ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

کراچی اب ایک شہر نہیں رہا' یہ بہت سے شہروں کا چھتہ بن گیا ہے۔ ہر علاقے کا الگ مزاج اور اس کی الگ پہچان ہے۔ کہیں میلے لگے ہیں اور لوگ کھانے پینے اور ایک جشن سامنانے میں مصروف ہیں۔ کہیں پسماندگی اور بد حالی ہے اور لوگ اُسی حال میں مگن ہیں۔ وی سی آر رخصت ہوا اور ڈی وی ڈی نے اس کی جگہ لے لی۔ کاروں میں ہائی فائی لگا ہے اور لڑکے لڑکیاں پوری آواز سے گانے سن رہے ہیں۔ سنیاسی باوا اور کالے جادو والے نام نہاد پروفیسر آج بھی اپنی دکانیں سجائے بیٹھے ہیں۔ لسبیلہ چوک پر اب ان کے پہلو میں حکیموں نے بڑے بڑے مطب کھول لئے ہیں اور منجھلے حکیم صاحب اور چھوٹے حکیم صاحب ہر طرح کی ظاہری اور خفیہ بیماریوں کا شرطیہ تیر بہدف علاج کر رہے ہیں۔ اوپر سے نفسیاتی بیماریوں کے اسپتال کھل گئے ہیں ان سب کی کثرت دیکھ کر شہر میں پھیلے ہوئے مرض کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان تین دہائیوں میں شہر کا کیا حال ہوا' اس کا دکھ نہیں۔ اگلے تیس برسوں میں اس کی کیا درگت بنے گی' یہ سوچ کر ہول آتا ہے۔

حیدر آباد کو نظر لگ گئی

یوں کہنے کو کراچی اور حیدر آباد ایک دوسرے سے تقریباً ایک سو میل دور ہیں مگر مجھے تو یوں لگا کہ جہاں کراچی ختم ہوتا ہے، وہیں سے حیدر آباد شروع ہو جاتا ہے۔ راستے میں تھوڑا سا ویرانہ پڑتا ہے جس میں جھاڑ جھنکاڑ اُگے ہوئے ہیں۔ ہوا میں اُڑتے پلاسٹک کے سارے تھیلے ان جھاڑیوں میں الجھ کر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ عجب بہار دکھاتے ہیں، (اگر بہار اسی کو کہتے ہیں)۔ اس پر خیال آتا ہے کہ یہ جھاڑیاں نہ ہوتیں تو شاپر کہلانے والا یہ سیلاب بلا کس کے گھر جاتا۔

اس راستے میں جی بہلانے کا بھی ایک بندوبست ہے، ایک مقام پر ساری بسیں پڑاؤ ڈالتی ہیں، وہاں کچھ چائے خانے ہیں اور ایک مسجد بن رہی ہے۔ اس کی تعمیر برسوں سے جاری ہے مگر وہ کسی حال مکمل ہی نہیں ہوتی۔ شاید اس لئے کہ اُس کی طرف انگشت شہادت اُٹھا کر جو صاحب ہر رکی ہوئی بس میں آ کر مسجد کا چندہ مانگتے ہیں، تعمیر مکمل ہوگئی تو ان کا کیا بنے گا۔ اُس راہ سے آنے جانے والے مسافر بتاتے ہیں کہ شروع شروع میں یہ صاحب معمولی لباس پہنتے تھے، پھر ان کا لباس بہتر ہوا، اس کے بعد اُس میں چاندی کے بٹن لگے اور اب خیر سے سونے کے بٹن نظر آنے لگے ہیں۔

حیدر آباد کسی زمانے میں اپنے ہواد انوں، قلعوں، مقبروں اور چوڑیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ شاندار عمارتیں تھیں، پھول دار درختوں سے آراستہ سڑکیں تھیں، کتب خانے، آڈیٹوریم، گھنٹہ گھر اور علاقے کی سب سے پرانی یونی ورسٹی کے شعبے تھے۔ اوپر سے نئے پرانے قلعوں اور درگاہوں کی آن بان اور سب سے بڑھ کر باہر سے دیکھنے میں معمولی لیکن اندر سے محلات جیسے مکان تھے۔ لیکن جن دنوں میں وہاں پہنچا، ہر طرف ٹوٹی پھوٹی گلیاں تھیں، کھدی ہوئی سڑکیں تھیں اور مرمت کے لئے لا کر ڈالے جانے والے پتھروں سے اٹے ہوئے کوچے تھے۔

اگر شہروں کو بھی نظر لگا کرتی ہے تو حیدر آباد کو یقیناً کسی کی نظر لگی تھی اور کبھی سندھ کا پیرس کہلائے جانے

والے اس شہر کے رخسار پر سرمے کا تل لگانے والا کوئی نہ تھا۔

بس یہ ضرور ہے کہ شہر پہلے بھی بارونق تھا' اب بھی بارونق ہے۔ وہی راہ گیروں کا ہجوم۔ وہی ہاتھ گاڑیوں سے لے کر موٹر گاڑیوں تک کا اژدِحام۔ وہی شور' وہی صدائیں۔ شاہی بازار آج بھی ویسا ہی ہے۔ ریشم گلی اب بھی جوں کی توں ہے۔

ہم نے خود تو نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ ہیر آباد کے مکانوں میں جب عورتیں غسل کیا کرتی تھیں تو محلے کی نالیوں سے صندل کی خوشبو اٹھا کرتی تھی۔ وہی مکان جن کے مکین خاندانی بیوپاری تھے کہ ان کے مکان حیدرآباد میں اور ان کے بیوپار ہانگ کانگ اور سنگاپور میں تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ حیدرآباد آجایا کرتے تھے اور یہیں کی خاک میں مل جایا کرتے تھے۔

آج کے حیدرآباد میں جس شخص کو دیکھ کہ بہت خوشی ہوئی وہ علّن فقیر تھے۔ وہ اللہ کے فقیر ہیں' ہمیشہ اُسی کے گن گاتے ہیں۔ ان کے گانوں کا ٹیپ ہم ہر صبح سنا کرتے تھے۔ اُس روز ہم انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی گئے تو علّن فقیر کو دیکھا۔ گھنی ڈاڑھی' سیاہ آنکھیں' چوڑا سینہ' شان دار شخصیت۔ ان کا ہر انگ اللہ ہو' اللہ ہو گنگنا رہا تھا۔ پتہ چلا کہ پورا کا پورا 'شاہ جو رسالو' ریکارڈ کرا رہے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کو یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہوگا۔

حیدرآباد کی سب سے زیادہ خوش گوار یادیں بی بی سی کی ٹی پارٹی سے وابستہ ہیں۔ شہر کے ایک ہوٹل میں ہم نے اپنے کچھ سننے والوں کو مدعو کیا۔ خیال تھا کہ پچاس مہمان آئیں گے۔ اکیاون آئے۔ ایک نوجوان نے ذرا دیر پہلے ٹیلی فون کر کے خود ہی دعوت لے لی۔

پارٹی کا جو وقت مقرر تھا' برطانوی روایت کے مطابق مہمان اُسی وقت آگئے۔ وہ سب میری آواز سے واقف تھے۔ میں ان سب کے نام جانتا تھا۔ ایک ایک مہمان آتا گیا۔ اجنبیت کا ایک ایک پردہ اُٹھتا گیا۔ ہم سب جیسے پرانے صورت آشنا نکلے۔ پھر دیر تک گھل مل کر باتیں ہوئیں۔ کوئی بدین سے آیا تھا' کوئی سانگھڑ سے۔ کوئی ٹھٹھہ سے آیا تھا اور کوئی کنڈیاری سے۔ مگر کسی کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے نہ کسی کی گفتگو میں سفر کی تکان۔

کچھ بزرگ آئے کہ ضعیفی نے بینائی کو بری طرح متاثر کر ڈالا تھا مگر وہ آکر رہے۔ وہ بصارت سے محروم تھے مگر محبت سے سرشار۔ میں ٹھہرا ریڈیو کا آدمی' وہ میری آواز ہی سننے کے عادی تھے اس لئے اپنی بینائی سے انہیں کوئی شکایت نہ تھی۔

ہم نے سندھ کے عظیم الغوزہ نواز خمیسو خان کو مدعو کیا تھا۔ ہمیں کیا خبر تھی کے اس اثناء میں وہ دل کے

مریض ہو چکے ہیں ورنہ یہ زحمت نہ دیتے۔ مگر کوئی دوسرا ہی دل رہا ہوگا جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ بھی چلے آئے۔ بڑا اصرار کر کے انہیں واپس بھیجا تا کہ وہ معالج کی ہدایت کے مطابق اپنا آرام جاری رکھیں۔

مٹھا خان نوابشاہ میں رہتے ہیں، ہم نے دعوت نامہ بھیج دیا تھا اور سوچا تھا کہ اتنا سفر طے کر کے وہ شاید ہی آئیں مگر تمام مہمانوں میں سب سے پہلے وہی آئے اور اس شان سے آئے کہ ایک ہاتھ میں سندھی چادر اور اس کے اندر مٹی کا مٹکا جسے طبلے کی طرح بجانے میں مٹھا خان کا جواب نہیں۔

پارٹی میں رخسانہ بھی موجود تھیں جو کبھی رخسانہ امیر کے نام سے پاکستان ٹیلی وژن کی مقبول فن کارہ تھیں اور اُن دنوں بی بی سی کے پروگرام شاہین کلب میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ انہیں ہماری پارٹی کے بعد کسی شادی کی تقریب میں شرکت کے لئے جانا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شرکت نہیں ہوگی بلکہ دلہن سے مقابلہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوٹو گرافر نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو کوئی بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ کے ساتھ نہیں کرتا۔ تقریب میری تھی، تصویریں رخسانہ کی اتر رہی تھیں۔ چائے سے زیادہ ہم نے صبر کے گھونٹ پیئے۔

حیدر آباد میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ میرے نصیب جاگے اور کچھ اہلِ علم حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کیسے کیسے محترم نام ہیں۔ ڈاکٹر غلام علی الانہ، جناب غلام ربانی، علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی۔ ان تینوں حضرات کے نام میں لفظ غلام مشترک تھا اور کام میں علم کی لگن۔

الانہ صاحب اس وقت انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی کے سربراہ تھے۔ ان سے ملاقات پہلے سے طے نہ تھی۔ نہ ہی وہ جانتے تھے کہ میں ان سے ملنے کیوں آرہا ہوں۔ ملاقات شروع ہوتے ہی میں نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔ بتایئے سندھ میں کتب خانے اور کتابوں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

پھر جو دروازۂ علم کھلا تو اندر تک نور ہی نور بھر گیا۔ الانہ صاحب نے اتنے بڑے، قدیم اور تاریخی علاقے کے گوشے گوشے کا حال کہہ سنایا۔ اور جب میں لوٹ کر لندن آ گیا تو ان کا خط آیا کہ کچھ کتب خانوں کا ذکر تو رہ ہی گیا۔ باکمال ہیں یہ لوگ۔

علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی جید عالم ہیں۔ ان کا علم نور بن کر ان کے چہرے سے کرنوں کی طرح پھوٹتا ہے۔ میں علامہ کے گھر گیا اور کہا کہ آپ کا نیاز مند ہوں۔ فرمانے لگے کہ کچھ یہی معاملہ میرا آپ کے ساتھ ہے، آپ کا پروگرام شاہین کلب ضرور سنتا ہوں۔

میں نے کہا، علامہ۔ وہ تو بچوں کا پروگرام ہے۔'

کہنے لگے کہ میرے بچے سنتے ہیں، اُن ہی کے ساتھ بیٹھ کر میں بھی ان ہی کی طرح اشتیاق سے سنتا ہوں۔

میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنے بچوں سے ملاقات کرا دیجئے۔

علامہ نے فوراً آواز دے کر انہیں بلا لیا۔ ان میں غالباً دو ڈاکٹر اور ایک پروفیسر تھے۔

سارا گھرانا مانند آفتاب تھا۔ روشن روشن اور تابندہ۔

کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں اپریل کے آخر سے چالیس دن تک جنوب مغرب کی سمت سے ہوا چلتی ہے جو چالیکا کہلاتی ہے۔ اس ہوا کو مکانوں کے اندر تک لے آنے کے لئے لوگ اپنی چھتوں پر اونچے اونچے ہوادان کھڑے کر دیتے ہیں۔

میں لوگوں سے ملا تو محسوس ہوا کہ خلوص اور خاطر داری کی یہ ہوا وہاں تمام سال چلتی ہے جسے دل و جان میں اتارنے کے لئے کوئی ہوادان درکار نہیں۔

میں چلنے لگا تو مٹھا خان میرے پاس آئے اور بولے۔ ''او یار ہندوستان جا رہے ہو‘ راستے کے لئے اور کچھ تو دے نہیں سکتا‘ میرا مٹکا ریکارڈ کر لو‘ سفر کرتے جانا اور سنتے جانا۔''

اور یہی ہوا۔ میں دو مہینے تک سفر کرتا رہا‘ دو مہینے تک مٹھا خان کا مٹکا اور اس سے بڑھ کر اس کی تھاپ دل کی دھڑکن کی طرح میرے ساتھ چلی۔ شکر ہے کہ دونوں نہیں رُکے۔

تیس سال بعد

یہ بات پرانی ہوئی۔ حیدرآباد کو کافی سنوارا گیا ہے حالانکہ اس شہر کا وہ تابناک ماضی اب واپس آنے سے رہا۔ اب اک عجب بات ہے کہ کسی نے خود ہی شہر کے تاریخی قلعے کا نام بدل دیا اور کسی نے شہر کے عین وسط سے گزرنے والی شاہراہ کا نام تبدیل کر دیا۔ شہروں‘ علاقوں اور اداروں کے ناموں کی اب ویسے بھی خیر نہیں۔ لیکن اصل دکھ ناموں کے ردوبدل کا نہیں‘ بڑے بڑے نام وروں کے دنیا سے اٹھ جانے کا ہے۔

اسی شہر میں مجھے علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی اور غلام ربانی جیسے اہل علم ملے تھے‘ وہ گزر گئے۔ کیسا سچا مقولہ ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالَم کی موت ہوتی ہے۔ مقام شکر ہے کہ ڈاکٹر غلام علی الانہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کے جانشین محمد قاسم ماکھا صاحب نے بتایا کہ الانہ صاحب اگرچہ ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن پڑھنے لکھنے کا عمل انہوں نے ایک روز بھی ترک نہیں کیا ہے۔ سچ ہے کہ تحقیق اور تجسس کا مرض جسے بھی لگا‘ پھر وہ جیتے جی اس سے نجات نہ پا سکا۔

اس دوران تین بڑے فنکار بھی چل بسے۔ درویش صفت گلوکار علن فقیر اپنے دور کے بہت بڑے الغوزہ نواز خمیسو خان اور مٹی کے مٹکے سے کلاسیکی طبلے کا کام لینے والے مٹھا خان بھی کے سدھار گئے۔

کیسے بڑے لوگ تھے کہ انہیں خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتنے بڑے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے بھی اس بات کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا کہ یہ کتنے بڑے ہیں۔

فرسٹ کلاس

میں نے اپنی پوری زندگی کے دوران دل ہی دل میں جتنے لوگوں کو برا بھلا کہا ہوگا' ایک کے سوا اب کوئی یاد نہیں۔ وہ ایک شخص پاکستان ریلوے کا ایک ٹکٹ چیکر تھا۔

قصہ اس کا یوں ہے صاحبو کہ مجھے حیدرآباد سے ریل گاڑی کے ذریعے سکھر جانا تھا۔ میں نے نہایت اطمینان سے درجہ اوّل کا ٹکٹ خریدا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور سامنے ہی دوسرے درجے کا ڈبا تھا جس میں بہت تھوڑے سے مسافر بیٹھے تھے اور زیادہ تر نشستیں خالی تھیں۔ میرا تو خیال تھا کہ پاکستان میں ریل گاڑیاں مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہیں۔ ایسا کھلا کھلا کمپارٹ منٹ دیکھ کر میں نے سوچا کہ اب فرسٹ کلاس کا ڈبا کون ڈھونڈے' میں اسی درجہ دوئم میں داخل ہوا' دوسرے مسافروں کو سلام کیا۔ اطمینان سے ان کے درمیان بیٹھا اور ہم سب کی گفتگو شروع اور مراسم قائم ہونے ہی والے تھے کہ کہیں سے ٹکٹ چیکر صاحب داخل ہوئے اور ایک ایک کا ٹکٹ دیکھنے لگے۔ میں نے بھی اپنا درجہ اول کا ٹکٹ پیش کیا۔ اسے غور سے دیکھتے ہوئے چیکر صاحب بولے کہ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں' جاکر درجہ اوّل میں بیٹھئے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا ڈبا کہاں ہوگا۔ کہنے لگے کہ سب سے آگے' انجن کے قریب۔

میں نے اپنا تھیلا اٹھایا' مسافروں کو خیرباد کہا اور اپنے ڈبے کی تلاش میں روانہ ہوا۔ وہ سامنے فرسٹ کلاس کا کمپارٹمنٹ اپنا دروازہ کھولے جیسے میرا ہی منتظر تھا۔ میں گیا۔ اوپر چڑھا اور اب جو نگاہیں اٹھا کر دیکھتا ہوں تو کیا دیکھا کہ ڈبا نہ صرف کھچا کھچ بھرا ہوا ہے بلکہ اس میں اتنے زیادہ مسافر سوار ہیں کہ بیٹھنے کی تمام جگہیں بھر چکی ہیں اور اتنے زیادہ مسافر کھڑے ہیں کہ میرے لئے بس پیر ٹکانے کی جگہ تھی۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ کیا اس ٹکٹ چیکر کو اندازہ نہیں تھا کہ پوری گاڑی میں فرسٹ کلاس کے اس اکلوتے ڈبّے کا کیا حال ہوگا۔

اتنے میں گاڑی چل پڑی۔ اب میں نے صبر کرلیا اور یہ سارا راستہ کھڑے کھڑے طے کرنے کا قصد

کر کے سوچا کہ چلو زندگی کی کہانی میں ایک انوکھا باب لکھا جائے گا۔

اب سنئے کیا ہوا۔ گاڑی جگہ جگہ رکتی۔ ہر جگہ ایک ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل ہوتا۔ وہ کسی سے ٹکٹ یا کچھ بھی طلب نہ کرتا۔ بس میری طرح کھڑا ہوا ہر مسافر اپنی جیب سے ایک سکہ نکالتا، چیکر کی ہتھیلی میں یوں رکھتا کہ ذرا سا اسے دبا دیتا تاکہ سند رہے اور چیکر بعد میں یہ نہ کہے کہ تم نے مجھے میرے حق کی رقم نہیں دی تھی۔ اس کے بعد چیکر صاحب اپنی مٹھی بھینچ کر بند کر کے اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈالتے اور اس وقت تک نہ کھولتے جب تک مٹھی جیب کی تہہ تک نہ پہنچ جاتی۔

پھر ایک بار سکہ لے لینے کے بعد چیکر کی تسلی نہ ہوتی۔ ہر پڑاؤ پر ایک نیا ٹکٹ چیکر آتا اور وہی ہتھیلی میں سکہ دبانے کا عمل اور اسے جیب کی تہہ میں اتارنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔ ایک عجیب بات یہ کہ کوئی بھی چیکر مجھ سے نہ تو ٹکٹ مانگتا اور نہ سکہ طلب کرتا۔ وہ میرے چہرے پر لکھی ہوئی عبارت صاف پڑھ لیتا کہ یہ احمق کہاں سے آ گیا۔

مطلب یہ کہ میری جیب میں کوئی نہ کوئی ٹکٹ تو تھا۔ یہ مسافر جو ہتھیلی میں سکے گٹر رہے تھے ان کے پاس سرے سے ٹکٹ ہی نہ تھے۔ ٹکٹ چیکر کی پتلونوں کی جیبیں جن کے سکوں سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں وہ سارے کے سارے جرم کا ارتکاب کر رہے تھے اور یہ ملازم پیشہ چیکران کے جرم میں برابر کے شریک تھے۔

اپنے ساتھ کے باقی مسافروں کو تو میں بھول گیا البتہ وہ جو مجھ سے لگا کھڑا تھا اور مجھ سے اتنا قریب تھا کہ چھت میں لگا ڈنڈا پکڑنے کے لئے بازو اونچا کرتا تھا اور اس کی بغلیں وا ہوتی تھیں تو آغا حشر کا شعر یاد آتا تھا۔

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی
خوشبو اُڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اور خود اس مسافر کے تن بدن کی نہ پوچھئے۔ وہ ملنگ تھا۔ اس کا دھڑ برہنہ تھا جس پر کوئی لباس نہ تھا بلکہ اُس ظالم نے لوہے کی زنجیریں پہن رکھی تھیں۔ جتنی بار وہ ٹکٹ چیکر کو رشوت دینے کے لئے خدا جانے کہاں سے سکہ نکالتا اور وہ سکہ چیکر کی جیب میں گرتا تو اس کے چھناکے سے زیادہ خدا پرست ملنگ کے بدن کی زنجیریں غُل مچاتیں۔

سُنا ہے ایک زمانے میں جب فصلِ بہار آتی تھی تو جوانوں کو زنجیریں پہنائی جاتی تھیں۔ اس ملنگ پر تو بلا کی بہار تھی۔

خدا خدا کر کے سکھر آ گیا۔ لائیڈ زبیراج کا سکھر۔ سکے اور جیب کے ذکر پر یاد آیا کہ یہ قصہ نیا نہیں۔ جن دنوں ہمارے انگریز حاکم سکھر بیراج بنوا رہے تھے جو سنہ ۱۹۲۳ء میں شروع ہوا اور ۱۹۳۲ء میں پورا ہوا اس وقت کے کاغذوں میں حکام نے لکھا ہے کہ جو مقامی ٹھیکے دار چھوٹے موٹے کام سرانجام دے رہے ہیں، خیال رہے کہ انہیں

جہاں بھی موقع ملے گا یہ پیسوں میں گڑبڑ کریں گے، گڑبڑ اگر چھوٹی موٹی ہو تو درگزر کر دینا۔

شاید ایسا ہی کوئی مشورہ ہمارے پاکستان ریلوے کے ٹکٹ چیکروں کو دیا گیا ہوگا۔

سکھر کے بارے میں ہم بچپن سے سنتے آئے تھے کہ یہاں سب سے اچھے بسکٹ بنتے ہیں۔ غنیمت ہے، ہم سکھر کو اتنا تو جانتے تھے۔ برصغیر اور وسط ایشیا کے سارے تجارتی راستے یہیں سے گزرتے تھے۔ اس زمانے کے اس نہایت اہم شہر کا نام اروڑ تھا۔ سنا ہے کہ اس شہر کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں مگر نہ کوئی بتاتا ہے اور نہ دکھاتا ہے۔ سکندر اعظم یہاں سے گزرا۔ پھر سنہ ۷۱۲ عیسوی میں اسلام میں نیا نیا قدم رکھنے والے عرب ایک نو عمر سپہ سالار محمد بن قاسم کی قیادت میں یہاں آئے اور اس سرزمین پر بنو امیہ کی حکمرانی قائم ہوئی، مگر علاقے کی شدید گرمی نے ان لوگوں کو اتنا ستایا کہ جس جہنم کا ذکر وہ سنتے آئے ہوں گے اسے سکھر میں پایا۔ جہنم کو عربی میں سقر بھی کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہی سقر آگے چل کر سکھر ٹھہرا۔ یوں بھی عربوں سے یہ توقع نہیں کہ وہ اس شہر کو اروڑ کہتے البتہ اس جگہ انہوں نے ایک مسجد بنائی جو آج بھی موجود ہے۔

سکھر کی گرمی کا یہ قصہ بھی سن لیجئے کہ باقی ملک کو کراچی کی بندرگاہ سے ملانے کے لئے تین ہزار تین سو ٹن وزنی ریل کا پل لندن سے لا کر یہاں دریا کے اوپر دوبارہ بنایا گیا اور ۲۵ مارچ ۱۸۸۹ء کو گورنر بہادر اس کا افتتاح کرنے بمبئی سے تشریف لائے تو گرمی اتنی سخت تھی اور تمام سفید فام مہمانوں کے لباس اتنے دبیز تھے کہ پل کا افتتاح صبح سورج نکلنے سے پہلے کرنا پڑا۔ پھر مہمانوں نے پیدل چل کر پل کی سیر کی اور دیکھا کہ اتنے بڑے، بھاری بھرکم، الجھے ہوئے پیچیدہ ڈیزائین پر لندن میں بیٹھے ہوئے انجینئروں نے کتنا ذہن کھپایا ہوگا اور ہندوستان میں موجود غریب مزدوروں نے کس قدر مشقت اٹھائی ہوگی کہ کتنے بہت سے تو سروں پر اوزار گرنے سے مر گئے تھے۔

ایسا وزنی اور مضبوط پل بھی ریل گاڑی گزرنے پر کراہنے لگا اور میرے وہاں جانے سے کوئی تیس پہلے پرانے پل کے پہلو میں ایک نیا پل اس شان سے بنایا گیا کہ امریکہ کے ایک من چلے انجینئر نے اس کا نقشہ یوں بنا دیا جیسے یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ اس نہایت ستواں، خوش وضع لیکن سیدھے سادے پل کی تعمیر پر صرف دو کروڑ کی لاگت آئی اور اسے ایوب برج کا نام دیا گیا۔ روہڑی کے غلام محمد بیراج کی طرح ایوب برج کا نام بھی مٹ گیا۔ یوں تو شیکسپئر کہہ گئے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے لیکن میں نے اس راستے سے گزرنے والے بار بردار ٹرکوں کی پشت پر آج تک لکھا دیکھا، 'تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد'۔

اگلے وقتوں کے لوگوں نے یہاں یاد آنے کے لئے بہت نشانیاں چھوڑی ہیں۔ سب سے بڑھ کر معصوم شاہ کا مینار ہے۔ معصوم شاہ مورخ تھے، سپاہی بھی تھے۔ اکبر بادشاہ نے انہیں علاقے کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ان ہی دنوں، یہی کوئی ۱۶۰۷ء کے قریب انہوں نے یہ مینار بنوایا۔ میں اس کی چوراسی سیڑھیاں چڑھ کر چوٹی تک گیا، اس بات کی تصدیق کرنے کے شہر کے پہرے دار وہاں سے دور دور کے علاقے پر نگاہ رکھتے تھے۔ مان گیا کہ رکھتے

ہوں گے۔ اس زمانے میں یہ منظر سکھر بیراج سے بھی محروم تھا اور لینس ڈاؤن برج سے بھی۔ ہر جانب نکلتی نہروں سے بھی اور تا حد نگاہ پھیلے ہوئے سبزے سے بھی۔

میں مینار پر اس لئے بھی چڑھا کہ سنا تھا سکھر کا مینار اٹلی کے ایک مشہور مینار کی طرح ایک طرف کو جھک رہا ہے۔ سوچا ابھی اوپر جا کر دیکھ لوں مگر آخری اطلاعات آنے تک سید نظام الدین میر محمد معصوم شاہ بھکری کی یہ یادگار صحیح اور سالم تھی۔

بے شمار مزاروں، درگاہوں، مقابر، مندروں اور عبادت گاہوں کے اس جھرمٹ میں جو جگہ ایک قابل دید معمہ ہے اس کو شہر کے لوگ کبھی سات بہنوں کا مزار کہتے ہیں، کبھی ستین جو آستان اور کبھی ستی نا جو تھان۔

میرے میزبان مجھے وہاں لے گئے تو میں ان پر خفا ہوا۔ ان ادھر ادھر منتشر قبروں کے بیچ میں نے شکایت کی کہ وہ مجھے شہر کی گلیوں میں لئے لئے پھرے، سیدھے یہاں کیوں نہیں لائے کہ عظیم دریائے سندھ کے کنارے ایسا پر فضا مقام کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ مغل دور کے در و دیوار، ٹھٹھہ کے کوہ مکلی کے مقبروں جیسے نقش و نگار، قدیم ٹائلوں سے آراستہ محرابیں، اور اس ذرا اونچے ٹیلے سے لگا لگا نیلگوں دریائے سندھ، جس کی دھیمی دھیمی سی لہروں کے پچھواڑے اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔

یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیچ انگریزوں کا بنایا ہوا دیو ہیکل پل تک خوش نما نظر آتا تھا۔

وہ شخص کتنا خوش ذوق رہا ہوگا جس نے دفن ہونے کے لئے دریا کے کنارے یہ ٹیلہ چنا۔ کہتے ہیں کہ اس مقام کو یہ تقدس میر قاسم سبزواری شہید نے عطا کیا جن کی شہادت سنہ ۱۰۱۸ء میں بیان کی جاتی ہے۔

یہ سب اپنی جگہ مگر جو پہیلی آج تک حل نہیں ہوئی وہ ان سات بہنوں کا قصہ ہے، جن کے نام سے یہ چھوٹا سا قبرستان آج تک مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ سات بہنیں یا سہیلیاں تھیں جنہوں نے دنیا تیاگ دی تھی اور کوئی مرد کبھی ان پر نگاہ نہ ڈال سکا۔ وہ تمام عمر یہاں بنے ہوئے حجروں میں رہیں اور مر کر یہیں دفن ہوئیں۔

اب یہاں لوگ پکنک منانے آتے ہیں اور دنیا کی نگاہوں سے روپوش رہنے والی بہنوں کی قبروں کو یوں غور سے دیکھتے ہیں کہ شاید کسی کی جھلک نظر آ جائے، مگر توبہ کیجئے۔

۱۲/ فروری ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

فرسٹ کلاس میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر سفر کرنے کے اُس قصے میں ایک خوبی کی بات بھی تھی۔ ریل گاڑی اپنے مقررہ وقت پر اور بلا روک ٹوک چل رہی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے اس علاقے میں دوبارہ جانے کا اتفاق

ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر کچھ لوگ اتنے مشتعل ہوئے کہ اور چیزوں کے علاوہ ریلوے کی تنصیبات اور خصوصاً سگنل کے نظام کو بری طرح توڑ پھوڑ دیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اوپر سے حکام کی بد دیانتی اتنے اعلیٰ نظام کو گھن کی طرح کھا گئی۔ ریلوے کا نظام اگر دم توڑ گیا تو حیرت نہ ہوگی۔

میں نے سکھر بھی دیکھا اور یہ دیکھ کر دل ٹھہرا کہ معصوم شاہ کا مینار ایک طرف جھکنے کے باوجود ابھی تک بدستور ثابت و سالم کھڑا ہے۔ شہر کے بازار اب دکانوں اور گاہکوں سے بھرے پڑے ہیں جن کے ہجوم میں نہ صرف موٹر گاڑیاں بلکہ مال اسباب اِدھر اُدھر لے جانے والی گدھا گاڑیوں سے لے کر جاپانی سوزوکی وین تک ہر طرح کی گاڑیاں مجمع کو چیرتی پھاڑتی چلی جاتی ہیں۔

مجھے سات بہنوں یا سہیلیوں کے مزارات دیکھنے کا اشتیاق تھا سو دیکھا اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اس پر فضا مقام کی دیکھ بھال کا کام جاری ہے۔ مزدور لگے ہوئے ہیں اور ہر قسم کے سیاح چلے آ رہے ہیں۔ لیکن اس مقام کو ڈھونڈنے والوں کی راہنمائی کے لئے نہ کوئی بورڈ لگا ہے نہ کوئی تختی۔ راہ گیروں سے پوچھتے پوچھتے وہ جگہ ڈھونڈی اور ایک دل چسپ منظر یہ دیکھا کہ وہاں آنے والوں میں خواتین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ دریا کے نظارے سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں بلکہ منت مراد کی خاطر آئی ہیں۔ شاید سات راہباؤں کے تعلق سے خواتین میں یہ جگہ مقبول ٹھہری ہے۔

اگر محکمہ سیاحت والے کوئی تختی لگا دیتے جس پر اس مقام کی تاریخ لکھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس سے اچھا تو انٹرنیٹ اور گوگل ہے جس میں سات بہنوں کے مزار کی اچھی خاصی تفصیل مل جاتی ہے۔

اب وہاں ایک چوکیدار قسم کا شخص بیٹھا ہے جسے نہ سات بہنوں کی خبر ہے نہ دوسرے مزاروں کی۔ اس کی مسکین شکل آنے والوں سے صاف کہہ رہی ہے کہ کچھ رقم دیتے جائیے۔ وہ تو یہ تک نہیں کہتا کہ تمہاری مراد پوری ہوگی۔ اس سے تو اجمیر کے پیر بابا اچھے جن کا قصہ آگے چل کر آئے گا۔

لاہور کی شان

بہت شہرت لاہور کی ہے۔ بہت دھوم ہے اس شہر کی۔ کہتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

ہم نے بھی دیکھا اور ہم پر یہ بھید کھلا کہ خوبی لاہور میں نہیں' لاہور والوں میں ہے۔

ہوا یہ کہ لاہور میں یوں تو ہمارے بے شمار سامعین تھے لیکن شوکت علی نمبردار ان میں یوں سبقت لے گئے تھے کہ انہیں مجھ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ اپنے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے انہیں خط لکھا اور بتا دیا کہ لگ بھگ کن تاریخوں میں پہنچوں گا۔ ان کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔

لاہور کے ہوائی اڈے پر میں انہیں جھٹ پہچان گیا کیونکہ انہوں نے ہاتھ میں ایک تختی اٹھا رکھی تھی۔ اُس پر بڑے بڑے حرفوں میں میرا نام لکھا تھا۔ یہی چھوٹے سے نواحی گاؤں اجودھیا پور کے شوکت علی نمبردار تھے۔ انہوں نے مجھے اس طرح بھینچ کر گلے لگایا کہ صاف پتہ چل گیا کہ یہ حضرت دو تین روز سے ہوائی اڈے کے چکر لگا رہے ہیں جہاں وہ ہر روز وہی تختی لے کر پہنچ جاتے ہیں۔

اصرار کرنے لگے کہ میں ابھی ان کے ساتھ ان کے گاؤں چلوں۔ آخر اس بات پر سمجھوتہ ہوا کہ میں پہلے جا کر ہوٹل میں اپنا مال اسباب رکھ کر منہ ہاتھ دھولوں' پھر رام چندر جی کے بیٹے کے بسائے ہوئے لاہور کے نواح میں اجودھیا پور چلا جائے گا۔ اس سمجھوتے میں یہ بھی طے پایا کہ رات کے کھانے میں قورمہ اور پلاؤ نہیں بلکہ چنے کی دال اور خشکہ ہوگا۔

ہم دونوں نے اپنا اپنا وعدہ نبھایا۔ میں اجودھیا پور پہنچا' کچھ ٹاؤن شپ کا علاقہ بتایا گیا۔ شہر سے ذرا پرے ہے اس لئے بڑا پرسکون ہے۔ گاؤں میں میرے آنے کی منادی ہو چکی تھی' چنانچہ سارے ہی گاؤں والے اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ چارپائیاں بچھا دی گئیں' ہم سب ان پر بیٹھ گئے اور ذرا ہی دیر میں محفل رنگ

پر آ گئی۔

اُدھر سے لاہوری لب و لہجے میں سوال ہوتا تھا' اِدھر سے میں کراچی اور لندن کے ملے جلے لہجے میں جواب دیتا تھا۔ مجھے سب ہی کچھ سمجھانا پڑا کہ خبریں کیسے آتی ہیں' کیسے ترجمہ ہوتی ہیں (ترجمہ کیا ہوتا ہے)' ریڈیو پر کیسے پڑھی جاتی ہیں۔ اور تو اور مجھے اداکاری کر کے دکھانا پڑا گویا میرے سامنے رکھی حقے کی چلم مائیکروفون ہے اور میں پروگرام سیر بین پیش کر رہا ہوں۔

گاؤں کی وہ بیٹھک شاید اتنی دل چسپ نہ ہوتی اگر اس میں چوہدری برکت نہ ہوتے۔ وہ ذرا دیر میں آئے لیکن آتے ہی پوری محفل پر چھا گئے۔ پھر انہوں نے اقبال کے فلسفہ سے لے کر نور جہاں کی گائیکی تک اور اومنی بس کے دکھڑے سے لے کر اپنے انگریزی سیکھنے کے لطیفوں تک دنیا زمانے کی موضوعات پر لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ چوہدری برکت نے اپنے بچوں کو پڑھانے بٹھایا اور روز بچے جو کچھ پڑھ کر آتے' یہ اُن سے سیکھ لیا کرتے۔ اس طرح پڑھنا لکھنا سیکھ گئے۔ سات سال غالب کو پڑھا اور سات سال اقبال کو' گویا اجودھیا میں چودہ برس کھپا کر وہ اور کچھ ہوئے یا نہ ہوئے ہوں' شاعر ضرور ہو گئے۔

شاعروں' ادیبوں' مصوروں' گلوکاروں اداکاروں اور مفکروں کی جیسی بہتات لاہور میں ہے کہیں اور نہ ہوگی۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان سب میں یہ مفکر کہاں سے آ گئے۔ ہوا یہ کہ شہر لاہور میں میرے راہنما نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے ذوالفقار تابش تھے۔ چونکہ میں کتابوں کے ذخیرے دیکھنے آیا تھا' ان سے بہتر راہبر اور کون ہو سکتا تھا۔ خیال تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد ہی وہ مجھے لاہور کے کتب خانے دکھانے کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ لیکن انہوں نے ایک بالکل ہی مختلف پیش کش کی اور وہ بھی اس یقین کے ساتھ کہ میں خوشی سے اچھل پڑوں گا۔ کہنے لگے۔ ''واصف علی واصف سے ملنے چلیں گے؟''۔ میں ٹھہرا ولایتی نو وارد اور بہت سے معاملات سے بے خبر۔ اگر کہیں یہ پوچھ بیٹھتا کہ یہ کون صاحب ہیں تو کم علم ٹھہرایا جاتا۔ عافیت اسی میں جانی کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ مجھے شہر کے ایک نئے علاقے میں لے گئے جہاں ایک مکان کے سامنے پہلے ہی کئی کاریں کھڑی تھیں۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ فرش پر اشفاق احمد' بانو قدسیہ' حنیف رامے اور اسی کاٹھ کے کئی اکابر اور بیگمات دست بستہ بیٹھی ہیں اور سامنے ایک ذرا اونچے تخت پر سادہ سالباس پہنے ایک صاحب بیٹھے ہیں جو صاف ظاہر ہے کہ واصف علی واصف تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ یہ بڑے بڑے دانش ور کوشش کر رہے تھے کہ خود تو کم سے کم کلام کریں اور واصف صاحب زیادہ سے زیادہ گفتگو کریں۔

میں ٹھہرا ان کے سحر سے بے خبر۔ مجھے ہر بار یوں لگتا تھا کہ واصف صاحب جو فقرہ بھی ادا کرتے ہیں'

کوشش کرتے ہیں کہ اس میں علم وحکمت کے موتی ٹانکے گئے ہوں۔ اور اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور حنیف رامے جو بات کہتے ہیں، وہ وزنی بھی ہوتی ہے اور مدلل بھی۔ ان کے ادا کئے ہوئے کسی فقرے سے نہیں لگتا تھا کہ وہ خلیل جبران کی تقلید کر رہے ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس مجلس میں میرا مقام اجودھیا پور کے چوہدری برکت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ میں چپ رہا۔

اگلے روز میں علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔ کتابوں کے جیسے ذخیرے لاہور میں ہیں کہیں اور نہ ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ کتابیں چرا کر لے گئے، اخباروں کی پوری پوری فائلیں غائب کر دیں، قیمتی کتب کے ورق بلیڈ سے کاٹ لئے۔ اور تقسیمِ ہند کے وقت مہاجروں کو انہی کتب خانوں کی عمارتوں میں پناہ ملی جہاں دو وقت روٹی پکانے کے لئے انہیں ایندھن درکار تھا اور وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر الماریوں میں آراستہ تھا۔

مغلیہ دور کی عمارت میں انگریزوں کی قائم کی ہوئی شاندار قومی لائبریری میں قدم رکھا تو بڑی پذیرائی ہوئی۔ وہاں ظلِ حسنین صاحب مل گئے جنھوں نے لاہور والوں کی روایت قائم رکھی جو اپنی محبت کا بہترین اظہار کچھ نہ کچھ کھلا پلا کر کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ کتب خانے کے سامنے بہترین کشمیری چائے ملتی ہے، بس پھر تو اشیائے خورونوش کہاں کہاں دستیاب ہیں انہوں نے ان تمام مقامات کی فہرست کھول کر رکھ دی۔ اس لئے نہیں کہ میں جاؤں اور از خود کھاؤں پیوں، بلکہ اس لئے کہ اب آپ لاہور والوں کی مہمان نوازی کے لئے تیار ہو جائیے۔

اُس شام ہم نے کم عمر بکرے کا گوشت کھایا جسے پکانے کے لئے دیگ میں انٹیں جمائی جاتی ہیں، پھر اس میں جو پانی ابل کر بھاپ اٹھاتا ہے، اس میں خشک میوے ڈالے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دیگ کا منہ اچھی طرح بند کر کے اسے کوئلوں کی ہلکی ہلکی آنچ پر رکھ دیا جاتا ہے، اور پھر گھنٹوں بعد وہ کھلتا ہے اور اس سے زیادہ آپ کی بھوک کھلتی ہے۔ یہ ہے لاہور کی شان۔

۱۸ فروری ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

لاہور دنیا کے اس خطے کا واحد شہر ہے جو وقت کے ساتھ بدلا تو ضرور لیکن بگڑا نہیں۔ وہی سرگرمیاں، وہی رونق، وہی کھانے پینے کا اہتمام اور ادب، روایت اور ثقافت کی ویسی ہی پذیرائی۔ جس وقت ملک کے دوسرے علاقوں میں دھماکے ہو رہے تھے، لاہور میں موسیقی کی نہایت عمدہ محفل آراستہ تھی۔ مگر پھر کیا ہوا؟ بھگدڑ مچی، تین

طالبات روندی گئیں، کئی غش کھا گئیں، اور حکام شہر والوں کو یہ کہہ کر داد دیتے رہے کہ دیکھئے زندہ دلان لاہور نے حالات کا کیسی بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ کیا جانیں کس پر کیا گزری۔

مگر ان تیس برسوں میں بہت سے لوگ اِدھر اُدھر رل گئے۔ ٹاؤن شپ کا وہ علاقہ میں نے جس کے گاؤں میں ایک شام گزاری تھی، پھیلتے ہوئے شہر کے اندر آ چکا ہے اور لاہور اس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے کہ اگر کچھ دور ہندوستان نہ ہوتا تو سرحد پار کر جاتا اور وہ بھی کسی سفری دستاویز کے بغیر۔ گاؤں کے شوکت علی نمبردار اور چوہدری برکت خدا جانے کہاں گم ہو گئے۔ صاحبِ حیثیت اور صاحبِ ثروت ہوتے تو ڈھونڈ لئے جاتے۔ غریب ہونے میں بڑے گھاٹے ہیں۔

واصف علی واصف صاحب نے اس دوران اپنی علمی تحریروں سے بہت شہرت پائی۔ وہ چل بسے اور ان کا مزار بن گیا جہاں سنا ہے عرس بھی ہونے لگا ہے۔ پچھلے دنوں پاکستان کی اعلیٰ ترین عدالت کے ایک اہم فیصلے میں ان کا کوئی مقولہ بھی نقل ہوا۔ ان کے ہاں حاضری دینے والے اشفاق احمد اور حنیف رامے بھی اس دوران اللہ کو پیارے ہو گئے لیکن یاد رکھے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ بھی کیا کم ہے۔

لاہور سے آگے

لاہور سے دلّی کا سفر اگرچہ ایک عہد سے ایک زمانے کا سفر ہے مگر چند منٹ میں کٹ جاتا ہے۔ میں پورے بتیس سال بعد ہندوستان جارہا تھا اور ہوائی جہاز کی کھڑکی سے نیچے جھانک رہا تھا۔ نامعلوم کیوں مجھے یہ خیال رہتا ہے کہ ملکوں کی سرحدیں فٹ بال کے سرسبز میدان میں چونے سے کھینچی جانے والی لکیروں جیسی ہوتی ہوں گی۔ لیکن اس روز وہ لکیر کہیں نظر نہ آئی۔ جس سرحد کے نام پر سر کٹ جاتے ہیں اور سینے پھٹ جاتے ہیں، وہ کیسی ان دیکھی نکلی۔

لیکن صاف پتہ چل گیا کہ ہوائی جہاز ایک ملک سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو گیا ہے۔ پہلے نیچے دیہات میں مسجدیں نظر آ رہی تھیں، پھر اچانک مندر اور تالاب دکھائی دینے لگے۔ اتنے میں ہمارے اس چھوٹے سے جہاز میں بھونچال آ گیا۔ بہت سے مسافر ایک ساتھ بولے۔ 'آ گئی'۔ میں نے حیران ہو کر اور سر اونچا کر کے دیکھنا چاہا کہ کون آ گئی۔ دیکھا کہ وہ سامنے سے چلی آ رہی ہے۔ ڈیوٹی فری شراب اور سگریٹ کی ٹرالی۔

ہوائی جہاز اب اُس بلندی پر پہنچ گیا تھا جہاں فروخت ہونے والے مال پر کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔ یہاں تک تو خیریت گزری لیکن اگلا منظر جان لیوا ہو سکتا تھا۔ ہوا یہ کہ مسافر اپنی نشستوں سے اُٹھ کر ٹرالی پر ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص شراب کی ڈیوٹی فری بوتل خریدنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مسافروں کا ہجوم جو ٹرالی کی طرف لپکا تو اڑتا ہوا طیارہ ڈولنے لگا اور اس کا عملہ چلّایا کہ خدا کے لئے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جایئے کیونکہ جہاز کا توازن بگڑ رہا ہے اور کپتان ناراض ہو رہا ہے۔

مگر لوگوں نے سنی ان سنی کر دی اور بالآخر فاتحین کی طرح ایک ایک بوتل اُٹھائے واپس آئے۔

جو بھی واپس آتا تھا، یہ بات ضرور کہتا تھا کہ شراب اس نے اپنے لئے نہیں خریدی ہے۔

دلّی کے مضافات آنے لگے۔ میں نے اپنی گھڑی کا وقت آدھا گھنٹہ آگے بڑھا دیا۔ منٹ کی سوئی سے

نگاہ ہٹی تو قطب مینار پر جا کر ٹھہری۔ دونوں ہی بدلتے وقت کی علامتیں تھیں۔

طیارہ پالم کے ہوائی اڈے پر اترا تو میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا۔ ''تو یہ ہے وہ پالم جہاں تک بے چارے شاہ عالم کی حکمرانی تھی؟''

وہ بولا۔ ''کیا''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں''۔

تذکرہ دلی مرحوم کا بالکل آخر میں چھیڑوں گا کیونکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے اس وقت دیکھا جب میں اپنا دورہ ختم کر کے واپس دلی آیا۔

یہاں رات گزارنے کے لئے ایک ہوٹل میں قیام کیا جو اتنا ہی ناقص تھا جتنا کوئی ہوٹل ہو سکتا ہے، وہی حال وہاں کے کھانے کا تھا۔ ہوٹل والوں کو غرض اپنے کھانے سے زیادہ اپنے بل سے تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ ملک چاہتا ہے کہ دنیا بھر کا سیاح یہاں آئے لیکن جانتا ہے کہ ایک بار مسافر آ جائے تو ایسے ہی گرے پڑے ہوٹلوں میں رہ لے گا اور اُف بھی نہیں کرے گا۔

اگلی صبح مجھے مراد آباد جانا تھا۔ وہی مراد آباد جسے میرے پہنچنے سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے مغل کمان دار رستم خان نے بسایا تھا اور یہاں قلعہ تعمیر کیا تھا۔ وہی مراد آباد جو نہ ہوتا تو شاید دنیا میں تانبے کی مصنوعات کو اتنی شہرت حاصل نہ ہوتی۔

ریل گاڑی میں دو مسافروں کے کمپارٹمنٹ میں ایک نشست میرے لئے مخصوص تھی۔ یوں تو اُس سیٹ پر چار پانچ مسافر بیٹھ سکتے تھے لیکن کرایہ دو گنا تھا اس لئے صرف دو مسافروں کے پھیل پھیل کر بیٹھنے کی سہولت تھی۔ میں بیٹھا تو کتنے ہی مسافر آ گئے اور بیٹھنے کی اجازت مانگنے لگے۔ ''آپ کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

مجھے اعتراض کیوں ہوتا؟ گنجائش کافی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ یہ سارے کے سارے اپنی اپنی ماؤں کے لاڈلے ہوں گے۔ اچھا ہے چین سے بیٹھ جائیں۔ فوراً پوری سیٹ مسافروں سے بھر گئی۔ ذرا دیر بعد وہ دوسرے مسافر صاحب تشریف لے آئے کہ میری طرح جن کی ایک نشست محفوظ تھی۔ آتے ہی حاکموں کے انداز میں بولے۔ ''جن لوگوں کی ریزرویشن نہیں ہے، فوراً نکل جائیں۔ دو مسافروں کا کمپارٹمنٹ ہے، بس دو ہی بیٹھیں گے۔''

یہ سننا تھا کے وہ سارے ماں کے لاڈلے تیزی سے یوں نکل گئے جیسے کسی پالتو جانور سے قصور ہو جائے اور اُسے ایک زناٹے دار ہاتھ پڑے تو کمرے سے نکل جایا کرتا ہے۔

باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ میرے وہ ہم سفر پالتو جانوروں کے ڈاکٹر تھے۔

میری ٹرین ہاپوڑ سے گزری۔ میں نے سنہ سینتالیس کے پُر آشوب دور میں زندگی کے دو برس وہیں

گزارے تھے۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ہمارے دور کے بڑے کہانی کہنے والے انتظار حسین کا شہر تھا۔

پھر ٹرین امروہے سے گزری۔ بیک وقت نہ جانے کتنے شاعر ادیب اور صحافی یاد آنے لگے۔

اس کے بعد مراد آباد آیا۔ نام سے صاف لگا کہ شاہ جہاں کے لاڈلے بیٹوں میں سے ایک یعنی مراد کے نام پر اس شہر کا یہ نام پڑا ہوگا پھر شہر سے بے شہر ہونا جس کا مقدر بن گیا۔

اس شہر کے اندر جا کر میں نے یو پی کو ۳۲ سال بعد قریب سے دیکھا۔ خیال تھا کہ پورا شہر تانبے پیتل کے چمکیلے برتنوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آئے گا۔ وہ بھرا ہوا تو تھا مگر انسانوں سے۔

اپنے ہوٹل کی دوسری منزل سے جھانک کر نیچے سڑک پر دیکھا تو سر ہی سر نظر آرہے تھے اور انسانوں کے اس سمندر میں کشتیوں کی جگہ ان گنت سائیکل رکشہ رواں دواں تھے۔ ایک سیلاب سا تھا جو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلا جاتا تھا۔ کالی کالی' سوکھی سوکھی' پسینے میں شرابور ٹانگوں والے محنت کش سائیکل رکشہ کھینچ رہے تھے۔ میلوں کی مسافت وہی آٹھ آنے اور بارہ آنے میں طے ہو رہی تھی۔

رستم خان کے شہر میں لوگ اتنے لاغر ہو رہے تھے' حیرت کا مقام تھا۔

دلّی میں اترتے ہی مراد آباد میں اپنے کچھ دوستوں کو آمد کی اطلاع کا تار دے دیا تھا۔ مگر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میں پہنچ گیا' تار کہیں راستے میں مارا گیا۔ آخر نئی بستی کی پرانی گلیوں میں ایک دوست کو ڈھونڈتا ہوا اس کے مکان پر پہنچ گیا۔

وہ اطہر سلیم کا مکان تھا جو بی بی سی کے بڑے مداح تھے۔ اطہر سلیم نے کرکٹ کے ایک مقابلے میں وہ انعامی بلاّ جیتا تھا جس پر کئی عالمی ٹیموں کے کھلاڑیوں کے آٹو گراف تھے۔ سارا گھرانا بی بی سی کا سامع نکلا اور مجھے اچانک اپنی دہلیز پر پایا تو ایک جشن سا برپا ہو گیا۔ فوراً ہی دروازے کھول دیئے گئے اور ایسی آؤ بھگت ہوئی کہ بس۔

میں نے کہا کہ پان کھانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ لوگ پنواڑی کی پوری دکان اُٹھا لائے۔

میں نے کہا کہ پرانی اور ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھنے ہندوستان آیا ہوں' انہوں نے جھٹ دو پرانی کتابیں نکالیں اور میں انکار کرتا ہی رہا مگر مجھے دیئے بغیر نہ مانے۔ ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ پوری کتاب منظوم تھی اور اس میں اشعار کے ذریعے بتایا گیا تھا کہ گھوڑوں کو کیسی کیسی بیماریاں ہوتی ہیں اور ان کا علاج کیسے کیا جائے۔

تمیں سال بعد

لاہور سے دلّی تک ہوائی سفر کے دوران ڈیوٹی فری شراب پر خلقت جس بری طرح ٹوٹی تھی' اب شاید

وہ حال نہ ہوگا۔ اب تو سنا ہے کہ گھر بیٹھے مل جاتی ہے اور وہ بھی سستے داموں۔

مرادآباد کے اطہر سلیم شاید پاکستان چلے گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک بار ان کا خط آیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ جو ہم نے آپ کو ہاتھ سے لکھی ہوئی گھوڑوں کے علاج کی منظوم کتاب دی تھی وہ واپس کر دیجئے۔ ان کے خط سے اندازہ ہوتا تھا شاید کسی نے ان سے کتاب کا حال سنا تو کہا کہ تم نے یہ کیا حماقت کی، لاکھوں کی کتاب اٹھا کر یوں دے دی۔

بس اسی خوش گمانی میں بزرگوں کی کتنی ہی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ لوگ انہیں صندوقوں میں بند کئے اُس روز کا انتظار کرتے رہے کہ کسی روز کوئی پرانی کتابوں کا رسیا آئے گا اور لاکھوں کروڑوں دے کر وہ خزانہ لے جائے گا اور باقی عمر گھر بیٹھ کر آرام سے کھائیں گے۔

لیکن ہوا یہ کہ آرام سے کھانے کا یہ فریضہ دیمک نے انجام دیا۔

رام پور، آرام پور

رام پور کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔
مگر جب دیکھا تو سوچا کہ کاش دیکھا ہوتا۔
روہیلوں کا یہ شہر کبھی کیسا پُر شکوہ رہا ہوگا۔ کیسی عظمت رہی ہوگی اس کے دریچوں، میناروں، فصیلوں اور گنبدوں میں۔
یہ نہیں کہ وہ گنبد اب وہاں نہیں۔ وہ ہیں تو مگر ان میں بڑے بڑے جھاڑ اُگ آئے ہیں۔ کشادہ سڑکوں کے دورویہ وہ عالی شان عمارتیں اب بھی ہیں مگر باہر سے صاف نظر نہیں آتیں کیونکہ خودرو اور بے لگام پھیلنے والے درختوں نے انہیں ڈھانپ لیا ہے۔ شاید اچھا ہی کیا ہے کہ بہتر ہے اب ان پر پردہ ہی پڑا رہے۔
رام پور آمیزشوں کا شہر ہے۔ جدید اور قدیم کی آمیزش، امارت اور افلاس کی آمیزش، ماضی اور حال کی آمیزش، دلاوری اور لاغری کی اور علم اور بے علمی کی آمیزش۔
جس پرانے قلعے کی فصیلوں کے باہر آج بھی سیکڑوں کاری گر بیٹھے گرم لوہے کو پیٹ پیٹ کر اس کی شکل نکالا کرتے ہیں اور خود بے چاروں نے کبھی مکتب اور مدرسے کی شکل تک نہیں دیکھی، اُسی قلعے کی چاردیواری کے اندر علم وحکمت کا ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا ایسا سمندر ہے کہ ہندوستان اس پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ رام پور کی رضا لائبریری کو میں نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنا بڑا کتب خانہ، اتنا عظیم خزانہ، ایسے ایسے مخطوطے، ایسی ایسی قلمی تصویریں کہیں مغرب میں ہوتیں تو لوگ ان کی گرد پلکوں سے جھاڑا کرتے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ خستہ کاغذ پر کہیں خراش نہ آجائے۔
اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں، ابھی تو ذکر اُس رام پور کا جو شہر تھا روہیل کھنڈ کا اور جو ریاست تھی روہیلوں کی جو

افغان تھے اور جن کی شجاعت اور دلیری کا چرچا آج بھی ہے۔ یہاں کے پرانے سپاہی آج بھی کہانیوں اور گیتوں کے عنوان بنتے ہیں اور یہی حال یہاں کے پرانے ڈکیتوں کا ہے۔ شام کو چار بیت کی محفل بجی تو بنّن میاں نے تان لگائی۔

منزلِ ہستی سے یار جو کوئی بچھڑ گیا پھر خبر اس کی نہ ملی

اس چار بیت میں، جسے اب پٹھانی راگ کہنے لگے ہیں، رام پور کے ایک سے بڑھ کر ایک عالم، معالج، شاعر، پہلوان، ڈکیت اور پھکیت کا ذکر نام بنام آ رہا تھا مگر اس یاددہانی کے ساتھ جب تک جیا، بڑا نام پایا لیکن جوں ہی لحد میں گڑ گیا پھر خبر اس کی نہ ملی۔

مرنا جینا تو ہر ایک کے ساتھ لگا ہے لیکن اس روز رام پور جا کر جس شخص کا مرنا جی کو مار گیا وہ تھے دورِ حاضر کے جید عالم مولانا امتیاز علی عرشی کہ اونچا رتبہ پایا ہو گا خلد بریں میں انہوں نے۔ رضا لائبریری ان ہی کے دم سے تھی۔ ہر کتاب کو اپنی اولاد کی طرح جانتے تھے اور ہر نقش اور ہر تحریر کو جان سے عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار میں نے اپنے ایک پروگرام میں انگریزی نظموں کے ایک اردو ترجمے کا ذکر کیا۔ اس کتاب کے بارے میں یقین تھا کہ اشاعت سے پہلے مرزا غالب کو دکھائی گئی تھی۔ اس نشریے کے اگلے ہی ہفتے رام پور سے عرشی صاحب کا اَرُوگرام آیا کہ یہ کتاب کہاں چھپی ہوئی تھی۔ غالب کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کا علم نہیں۔ جیسے بھی بنے اس کی نقل حاصل کر کے بھیجئے۔ میں نے بھیج دی اور پھر اس خیال نے مجھے بڑی تقویت بخشی کہ میں نے علم کی نہیں، ایک عالم کی خدمت کی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تحقیق کی مشقت کے دوران جو لمحہ سب سے زیادہ سرشاری عطا کرتا ہے وہ کسی گوہرِ نایاب کے ہاتھ لگنے کا لمحہ ہوتا ہے۔

کتب خانے کی دیوار سے لگی لگی عرشی صاحب کی قبر تھی۔ یہ رفاقت انہوں نے مرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑی۔

اس روز عرشی صاحب تو نہیں ملے البتہ عرشی زادے ملے اور وہ بھی اس تپاک اور محبت سے کہ معلوم ہوا گویا کتب خانہ کچھ دیر کو مہمان خانہ بن گیا۔ دیر تک ابا کی باتیں کرتے رہے۔ یہاں بیٹھا کرتے تھے، یہاں روشنی کے رُخ پر کتابیں پڑھا کرتے تھے، یہاں لکھا کرتے تھے۔

یہی باتیں کرتے کرتے وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور مجھے ایک کمرہ دکھاتے ہوئے بولے کہ یہ کمرہ ابا نے مہمانوں کے لئے مخصوص کیا تھا، ائر کولر لگوایا تھا، باہر غسل خانہ بنوایا تھا تاکہ مہمانوں کو تکلیف نہ ہو۔

ابھی تک عرشی صاحب کی باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور ان کی کمسن پوتی سمیرہ کمرے میں آ گئی۔ ماں نے اسے بنا سنوار کر بھیجا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ سمیرہ کو بہت چاہتے تھے اور ہمیشہ اسے چھمّی بی کہا کرتے تھے۔ میں نے چھمّی بی کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر جب تک میں رام پور میں رہا، اس کا ننھا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ ایسی چاہنے والی اور محبت کرنے والی بچی ہو نہ ہو، اپنے دادا پر پڑی ہو گی۔

رات میں سونے کے لئے لیٹا تو سمیرہ بھی میرے تکئے پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور لگی اِدھر اُدھر کی باتیں

کرنے۔ میں نے کہا اب بہت رات ہوگئی ہے، امّی کے پاس جا کر سو جاؤ مگر وہ میرے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔ ''جناب مجھے نیند نہیں آتی۔ بہت دیر میں سوتی ہوں۔''

میں نے کہا کہ مجھے بچّوں کو سلانے کا بڑا تجربہ ہے۔

بولی۔ ''مگر آپ مجھے نہیں سلا سکتے''۔

میں نے کہا۔ ''کہانی سنو گی؟''

اور جوں ہی اس نے ہاں کہا' میں نے دھیمی دھیمی، تھکی تھکی سی آواز میں اُس شہزادی کی کہانی شروع کردی جو چاند مانگا کرتی تھی۔ میری کہانی ختم ہوئی تو سمیرہ چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھا۔ تمہیں نیند آنے لگی۔''

بولی۔ ''نہیں جناب' یہ تو ذرا یونہی میری آنکھوں میں مرچیں لگ رہی ہیں۔''

یہ کہا اور خاموشی سے اُٹھ کر اندر گئی اور سوگئی۔

رام پور میں ہمارے سننے والے سیکڑوں ہزاروں ہیں۔ اُن میں سے کچھ کے نام پتے مجھے زبانی یاد تھے۔ اُن کو تلاش کرتا ہوا سعادت حسین خان کے گھر پہنچا۔ وہاں تو شادی کا سماں تھا۔ گھر میں خیر سے بہو آنے والی تھی اور ماشاء اللہ ایسی چہل پہل تھی کہ میں بھی جھوم اُٹھا۔ میرے آنے کا اعلان ہوا تو یوں لگا جیسے وہ سب میرے ہی منتظر تھے۔ مہمانوں سے بھرے گھر میں رونق کچھ اور بڑھ گئی۔ خوب مٹھائی کھائی گئی جو رام پور والے پیش نہیں کرتے' اپنے ہاتھ سے یوں کھلاتے ہیں کہ مقدار پر آپ کا اختیار نہیں ہوتا۔

باہر دالان میں بڑے سے تخت پر بیٹھی ڈھولک بجا بجا کر شادی کے گیت گانے والی خواتین کے درمیان سے پان کا خاص دان اٹھا کر اس کی جگہ میرا مائیکروفون رکھ دیا گیا۔ کیسی مسرتیں تھیں اور کیسی شادمانی تھی۔ دل سے یہی دعا نکلی کہ خدا ان شہروں کو' ان مکانوں اور ان کے مکینوں کو آباد رکھے کہ یہ لوگ غریب ہیں مگر محبت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کی ہنسی کھنکتی ہوئی اشرفیوں سے کہیں بیش قیمت ہے اور ان کے گیت جھرنوں کے سروں سے کہیں زیادہ سریلے ہیں۔

یہی شہر تھا جسے دلّی سے جا کر بس جانے والے رام پور نہیں' آرام پور کہا کرتے تھے۔

۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

اس بار رام پور نے میرا آرام چھین لیا۔

مجھے اُس چھ برس کی سمیرہ کی تلاش تھی جو مولانا عرشی کی پوتی تھی، اور جس نے اپنی باتوں سے مجھے رجھایا اور جو دیر تک مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی، سونے سے انکاری تھی اور بالآخر میں نے کہانی سنائی تو سوئی۔

اب میں نے ۳۶ برس کی اسی سمیرہ کی تلاش شروع کی۔ اس دوران اس کے والد اکبر علی خاں عرشی زادہ کا انتقال ہو گیا۔ مجھے ان کے جاننے والوں کی تلاش تھی تا کہ ان کی بٹیا کا اُتا پتا مل جائے۔ اس تلاش کے دوران جدید رام پور کے بانی اور دانش ور نواب حامد علی خان کی پوتی صنم مل گئیں جواب تاریخی کتب خانے کی دیکھ بھال میں شریک ہیں۔

عرشی زادہ مرحوم کا فون نمبران سے بھی نہیں ملا۔ لندن میں مقیم میرے رام پور کے دوست بھی مشکل میں پڑ گئے حالانکہ ان کی عرشی گھرانے سے رشتے داری تھی۔ آخر دلّی میں میرے دوست عبید صدیقی بار بار کی طرح اس بار بھی میرے کام آئے اور انہوں نے کہیں سے عرشی صاحب کے چھوٹے بھائی ممتاز عرشی صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔

میں نے لپک کر انہیں فون کیا اور کہا کہ آپ جیسے بزرگوں کا ہونا غنیمت ہے۔ کہنے لگے کہ (بالکل اپنی پوتی کے انداز میں) جناب میں عرشی صاحب سے نو سال چھوٹا ہوں۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ایک بزرگ کا بھائی بھی بزرگ ہوا۔ بتانے لگے کہ مجھے آپ کا ہمارے گھر آنا خوب یاد ہے۔ میں نے کہا کہ میری بے چینی دور کیجئے اور بتایئے وہ ننھی سی لڑکی اب کہاں ہے۔ کہنے لگے کہ وہ اپنے انجینئر شوہر اور تین بچوں کے ساتھ اس وقت کہیں گئی ہوئی ہے۔ آپ اس کے موبائل پر فون کر لیجئے۔

اب میں نے اس کے نمبر پر فون ملانا شروع کیا۔ ہر بار فون میں ڈائل ٹون کی جگہ لوڈ کیا ہوا گلزار کا گانا بجتا تھا: تجھ سے ناراض نہیں زندگی حیران ہوں میں۔ گانا مجھے زبانی یاد ہو گیا مگر اس بچی نے فون نہ اُٹھایا۔

بہت دیر بعد سمیرہ جیسی لیکن ذرا بڑی لڑکی کی آواز آئی: ہیلو۔ اور پھر وہ اپنی صفائیاں پیش کرنے لگی کہ معاف کیجئے میرا فون بیگ کے اندر رکھا تھا اور کار کے اندر شور بھی تھا، مجھے گھنٹی کی آواز نہیں آئی۔

سمیرہ اب ماشاء اللہ ۳۶ برس کی ہے۔ اس کے تین بیٹے ہیں۔ سعد حسن (۱۳)۔ باصم (۹) اور فائز (۴)۔ شوہر علی گڑھ کے تعلیم یافتہ انجینئر ہیں اور انہیں طالب علمی کے زمانے میں میرا یونی ورسٹی میں آنا یاد ہے۔ خیر۔

میں نے سمیرہ سے پوچھا کہ تمہیں میں یاد ہوں؟ کہنے لگی کہ صورت تو یاد نہیں لیکن آپ کا آنا تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔

میں نے کہا کہ اپنے دادا بھی یاد ہیں کہ نہیں اور ان کا تمہیں چھمّی بی کہہ کر بلانا بھی یاد ہے؟ اس نے بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ عرشی صاحب کی والدہ کو لوگ چھمّی بی کہا کرتے تھے اور انہیں اپنی پوتی میں ماں کی جھلک نظر

آتی تھی چنانچہ سمیرہ بھی چھمی بی کہلائیں۔

'مگر کیوں چاہتے تھے تمہیں اتنا؟'۔میں نے پوچھا۔

'کیونکہ میں انہیں ناچ کر دکھاتی تھی اور گانا سناتی تھی'۔اس نے کہا۔

وہ یہ بتانا بھول گئی کہ دادا اس کی بھولی بھولی باتوں پر فدا ہوتے ہوں گے۔اس کا تجربہ تو مجھے بھی ہوا۔

رام پور کے سعادت حسین خان کا پتہ نہ مل سکا جن کے گھر اُن دنوں دلہن آنے والی تھی۔البتہ چار بیت کے استاد ببّن خاں اس دوران یہ کہتے کہتے چل بسے کہ 'منزلِ ہستی سے یار جو کوئی بچھڑ گیا' پھر خبر اس کی نہ ملی۔

یہ وہ لکھنؤ تو نہیں

وقت کے ساتھ انسان بھی بدلتے ہیں اور شہر بھی لیکن جیسا شہر لکھنؤ بدلا ہے' ایسا خدا کسی کو نہ بدلے۔

میں نے رکشہ والے سے کہا۔ 'ثوریا گنج چلو گے؟'

بولا۔ 'کہاں؟ وکٹوریا گنج؟'

کیسا غضب ہے۔ ملکہ ثوریا کا دم بھرنے والے اہلِ لکھنؤ بھی ثوریا گنج کو وکٹوریا گنج کہنے لگے ہیں۔

میں نے لکھنؤ میں صرف ایک دن گزارا۔ میرے بزرگوں نے یہاں پوری پوری عمریں گزاری تھیں۔ اچھا ہوا کہ اب اُن میں سے کوئی مجھ سے یہ پوچھنے کے لئے زندہ نہیں کہ کہو بیٹے۔ تمہیں ہمارا شہر کیسا لگا؟

اب نہ وہ فصیلیں ہیں' نہ وہ محرابیں' نہ وہ حویلیاں اور نہ وہ ڈیوڑھیاں' نہ وہ سنگ مرمر کے چھلکتے ہوئے حوض اور نہ ان میں تیرتی ہوئی وہ سرخ اور گلابی مچھلیاں جنہیں میر انیس اپنی چھڑی سے چھیڑا کرتے تھے۔ اب نہ وہ کلف لگے انگرکھے ہیں اور نہ وہ چنی ہوئی آستینوں والے سفید براق کرتے۔ نہ وہ تنگ گلیوں میں آتی جاتی ڈولیاں اور نہ وہ کہاروں کی صدائیں۔ نہ وہ دمکتی ہوئی صبح اور نہ وہ مہکتی ہوئی شام کہ اب اگر بھولے سے اسے شامِ اودھ کہیں تو دیوانے کہلائیں اور گلی کے لڑکے پتھر ماریں۔

آج کا لکھنؤ انسانوں اور دکانوں سے پٹا پڑا ہے۔ کشادہ سڑکوں پر جہاں لکھنؤ کے بانکے کبھی پھیل پھیل کر چلا کرتے ہوں گے اب وہاں کھوے سے کھوا چھلا کرتا ہے۔ لوگوں نے راہ گیروں اور سواریوں پر ترس کھا کر ان کے آنے جانے کو ذرا سا راستہ چھوڑ کر باقی ہر چپے پر دکانیں بنالی ہیں۔ اب رہ گئیں وہ تنگ سڑکیں تو ان پر سائیکل رکشہ لہر در لہر اور موج در موج دوڑ رہے ہیں اور کوئی ان کا راستہ نہیں روک سکتا سوائے اس بوڑھی بانجھ گائے کے جو سڑک کے بیچوں بیچ سوتی ہے۔

راستوں کے دونوں طرف غلاظت کے انبار ہیں۔ اُدھڑی ہوئی سڑکیں ہیں جن کا کوئی ٹکڑا سیدھا نہیں۔

وہ دریچوں اور محرابوں والی گلابی گلابی عمارتیں ڈھے گئی ہیں اور ان کی جگہ ترتیب اور قرینے سے بے نیاز سیمنٹ کی اونچی عمارتیں سر اٹھا رہی ہیں۔

میں نے کسی سے پوچھا۔'یہاں ہمارے بزرگوں کی مشہور سوداگر کی حویلی ہوا کرتی تھی۔ وہ کیا ہوئی؟

بولے۔'وہ سامنے ٹیلہ دیکھ رہے ہیں آپ۔ وہی آپ کے بزرگوں کے رہنے کا ٹھکانا تھا اور جب آپ اگلی بار آئیں گے تو یہ ٹیلہ بھی نہ ہوگا' بلکہ یہاں اونچا پلازہ کھڑا ہوگا۔'

ٹوریا گنج پہنچ کر میں وہ انڈے جیسی سفید اور شاندار عمارت ڈھونڈنے لگا جہاں ابھی ۳۲ سال پہلے بڑے بھائی کی شادی ہوئی تھی اور جو اردو فارسی کے سرکردہ استاد اور دانش ور اور ہماری حسینہ باجی کے شوہر پروفیسر مسعود حسن رضوی کی قیام گاہ تھی کہ سارا لکھنؤ اسے ادبستان کے نام سے جانتا تھا۔

میں کھڑا کسی بے خبر اجنبی کی طرح ادبستان کی محرابیں اور دریچے ڈھونڈ رہا تھا کہ اسی گھرانے کے ایک بچے نے مجھے پہچان لیا۔ ادب سے سلام کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ادبستان کے اندر لے گیا۔

مگر یہ کیا؟ اس عمارت کو کیا ہوا؟ اس کے سامنے جو سبزے کی چادر بڑے قرینے سے بچھی تھی اب اس میں بڑا سا شامیانہ لگا ہے۔ وہ لان کرائے پر اٹھا دیا جاتا ہے اور وہاں شامیانے لگا کر لوگ اپنے جلسے کرتے ہیں۔ اس شام لکھنؤ کے سُناروں کی تنظیم کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس کے علاوہ ادبستان کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر ایک قطار میں دکانیں بنا دی گئی ہیں جو سب کرائے پر اٹھی ہوئی ہیں۔ یہی نہیں۔ عمارت کے ایک حصے میں چھوٹے بچوں کا اسکول کھلا ہوا ہے۔ باہر جس چھوٹے سے کمرے میں یگانہ چنگیزی جیسے شاعر نے قیام کیا تھا' وہ کب کا منہدم ہو چکا ہے اور وہ جو ٹم ٹم کے گھوڑے کا اصطبل ہوا کرتا تھا وہاں ایک پرانی کار کھڑی ہے جس کا چلنا محال نظر آتا ہے۔ حالات ہر چیز کا حلیہ بدل ڈالتے ہیں۔

اب وہاں اپنے والد ہی جتنے بڑے دانش ور اور استاد نیّر مسعود رضوی اور ان کے دو چھوٹے بھائی رہتے ہیں۔ میں نیّر بھائی سے لکھنؤ کے کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں کا حال جاننے گیا تھا۔ چونکہ مجھے اگلی صبح ہوائی اڈے جانا تھا اس لئے ان کا انٹرویو رات ہی کو ریکارڈ کرنا پڑا۔ میرا ٹیپ ریکارڈر ان کی گفتگو کے ساتھ ساتھ باہر لان میں جمع سناروں کی تقریریں' تالیوں اور نعروں کا شور بھی ریکارڈ کرتا رہا۔

بعد میں دونوں کو یوں الگ کرنا پڑا جیسے نہایت نفیس دال میں سے چن کر کنکر الگ کئے جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ لکھنؤ کی آن بان گئی ساتھ ہی زندگی کے انداز بھی بدلے گئے۔ وہ سکون اور وہ ٹھہراؤ اب خواب ہوا۔ وہ یگانگت اور وہ رواداری اب ہوا ہوئی۔ جس شہر میں زیادہ سے زیادہ تشدد یوں ہوتا تھا کہ سمدھنوں کو پھولوں کی چھڑیوں سے اور موسم کے پھلوں سے مارا جاتا تھا اور جس شہر میں جناب امیر کی قسم کھا کر قرولی بھونکنے کی

دھمکی قصے کہانیوں کے سوا کہیں نہیں دی جاتی تھی' اب وہاں معاملات چھریوں اور گولیوں سے طے ہوتے ہیں۔ میں کشمیری محلے کی طرف جا رہا تھا' کسی نے بتایا کہ دودھ والے کی دکان کے سامنے فلاں کا نوجوان بھائی گولی کھا کر مرا تھا اور اُس چوراہے پر فلاں کے بیٹے کی لاش رات بھر پڑی رہی تھی۔

بہت عرصہ نہیں ہوا جب لکھنؤ کی عزاداری کا ایک عالم میں شہرہ تھا۔ اب یہ حال ہے کہ بار بار کے خون خرابے کے بعد ماتمی جلوس نکالنا ممنوع ہے۔ لکھنؤ کی سڑکوں پر ہم نجم آفندی کا ایک نوحہ سنا کرتے تھے۔

شبیر کا ماتم چاند میں ہے' شبیر کا ماتم تاروں میں

کیسا وقت آن لگا ہے کہ شبیر کا ماتم ہر جگہ ہے' اسی لکھنؤ کی گلیوں میں نہیں۔

مجھے صبح تڑکے ہوائی اڈے جانا تھا۔ میرا ٹیکسی ڈرائیور بھلا سا نوجوان تھا۔ ویسا ہی بھلا سا اس کا نام تھا۔ اصغر۔ شاید گونڈہ کا رہنے والا تھا لیکن روزی کی خاطر اصغر گونڈوی کا شہر چھوڑ کر لکھنؤ آ گیا تھا۔ ہم نے راستے میں ایک مجمع دیکھا۔ اصغر سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہنے لگا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کی رائے کے خلاف مظاہرہ ہونے والا ہے۔

میں نے اصغر سے پوچھا۔ ''تمہیں اردو آتی ہے؟''

اُس نے سر ہلا دیا۔ نفی میں۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اگلا سوال کروں یا نہ کروں' وہ خود ہی بولا۔ ''کیا کریں گے صاحب اردو پڑھ کر؟''

بس اس کے بعد ٹیکسی رک گئی۔ اصغر زور زور سے ہارن بجانے لگا کیونکہ ایک گائے سڑک کے بیچوں بیچ بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ لکھنؤ میں اردو کو سرکاری زبان کا دوسرا درجہ تک حاصل نہیں جب کہ پڑوسی ریاستِ بہار میں اردو کو یہ مقام کسی مظاہرے اور احتجاج کے بغیر مل گیا۔

اصغر نے اچانک پوچھ لیا۔ ''اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''بہار''

۲۳ فروری ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

کیا سے کیا ہو گیا۔ لکھنؤ ہر روز قدیم سے قدیم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ نئی اور اونچی عمارتیں آسمان کو چھونے

چلی ہیں اور پرانی شان وشوکت ملبے تلے دبی جارہی ہے۔ اب نہ وہ وضع قطع ہے نہ وہ رکھ رکھاؤ۔ نہ وہ اہتمام ہے نہ وہ احتشام۔ میرے بزرگوں کی حویلی کا نشان بھی باقی نہیں۔ ان کا جو علاقہ جوہری محلہ کہلاتا تھا' کسی نے کہا کہ اب اُس میں اتنی گائے بھینیس بندھی ہیں کہ لوگ اس کو'گوبری محلّہ' کہنے لگے ہیں۔

ثوریا گنج کی جس سڑک پر مسعود حسن رضوی جیسے بڑے دانش ور کی قیام گاہ 'ادبستان' کے نام سے آباد ہے' کاغذات میں اس کا نام دین دیال روڈ ہے لیکن اب ڈاکیے کے سوا کسی کو سڑک کا یہ نام معلوم نہیں۔ خود عمارت کے بیرونی حصے پر جو ضعیفی طاری ہے' وہی عمارت کے اندر بھی سرایت کر گئی ہے۔ ان کے تینوں بیٹے ملازمتوں سے سبک دوش ہو چکے ہیں۔ نیر مسعود رضوی ان میں بڑے ہیں اور فالج نے ان کا چلنا پھرنا دوبھر کر دیا ہے۔ گھر کے تعلیم یافتہ نوجوان ملازمتوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اگر کہیں کوئی جگہ خالی ہے تو تنخواہ اتنی قلیل ہے کہ اس سے بے روزگار رہنا اچھا۔ ہندوستان میں جو خوش حالی آنے کی دھوم ہے اس نے آنے کے لئے اپنی پسند کے گھرانے چُنے ہیں۔

پرانی اور نایاب کتابوں کے تاجر نادر آغا کبھی کے مرکھپ گئے۔ جو ذخیرہ انہوں نے چھوڑا تھا وہ تو کیا رہا ہوگا' اس کا حال بتانے والا بھی کوئی نہیں رہا۔

مجھے ہوائی اڈے لے جانے والا ٹیکسی ڈرائیور اصغر اب جھک گیا ہوگا اور یقین ہے کہ آج تک ٹیکسی ہی چلا رہا ہوگا۔ اگر بہت ترقی کی ہوگی تو یہ کہ اب اس کا بیٹا بھی ٹیکسی چلانے لگا ہوگا اور گلی میں کھلنے والے مکان کے دروازے پر اب ٹاٹ کے پردے کی بجائے تختوں کے کواڑ لگ گئے ہوں گے۔

اُس روز ٹیکسی کے راستے میں سڑک کے بیچوں بیچ سونے والی گائے کے بارے میں سنا ہے کہ کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی ہے اور ایسی خوابیدہ مخلوق اب ذرا کم نظر آتی ہے۔ آ جائے تو کچھ لوگ اس کی دُم اٹھا کر اپنے دائیں اور بائیں رخساروں سے چھواتے ہیں کہ یہ مقدس گائے کے احترام کی علامت ہے۔

اس صبح اردو کے خلاف جو لوگ مظاہرہ کرنے والے تھے' سنا ہے وہ تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ انہوں نے اردو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کیونکہ انہیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ یہ بڑی سخت جان زبان ہے۔ اب صورت یہ ہے ٹیکسی ڈرائیور اصغر کی طرح لوگ اردو پڑھنے اور لکھنے سے بے نیاز ہیں لیکن جو زبان بولنے لگے ہیں اس کو لاکھ ہندی کہیں' وہ اردو ہی ہے۔

بہار یا بہار

ہم نے پچھلے کئی برسوں میں کوئی دعا اتنا جی لگا کر نہیں مانگی تھی جتنے خشوع خضوع سے اُس صبح ہم دعا مانگ رہے تھے کہ انڈین ائر لائنز کی پٹنے کی پرواز لیٹ نہ ہو۔ ہمارا ہوائی جہاز بارہ بجے پٹنہ پہنچنا تھا اور چار بجے شہر میں ہمارے سننے والوں کی ٹی پارٹی تھی جس کے لئے پچاس ساٹھ سامعین کو دعوت نامے پہلے ہی لندن سے بھیجے جا چکے تھے۔

ہمیں ڈر تھا کہ اگر کہیں طیارے کے آنے جانے میں تاخیر ہوئی تو ہوگا یہ کہ شہر کے ہوٹل میں سارے مہمان تو موجود ہوں گے اور ہم میزبان وہیں لکھنؤ کے ہوائی اڈّے پر بیٹھے رات بھر پکنے والی دیگ کی طرح کھول رہے ہوں گے۔

اس روز قدرت ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہوئی اور آئے دن کے معمول کے برعکس ہمارا جہاز نہ صرف وقت مقررہ پر آ گیا بلکہ وقت معینہ پر روانہ بھی ہو گیا اور ہم صرف چالیس منٹ میں ہندی کی سرزمین سے اردو کے علاقے میں جا پہنچے۔

سنہری اور گرم گرم سی دھوپ میں نہایا ہوا سرسبز پٹنہ آنکھوں کو بھلا لگا۔ ہر طرف اتنی ہریالی تھی کہ اس روز بہار کی سرزمین گویا بہار کی سرزمین تھی۔

پٹنہ بڑی خوبیوں کا شہر ہے، بس اس میں ایک خرابی ہے۔

یہ شہر بسانے والوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کسی کو دریا نظر نہ آنے پائے۔ جہانگیر بادشاہ کشمیر گیا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ لوگ بڑے جتن کر کے اپنے مکان یوں بناتے ہیں کہ ان کی پشت دریا کی طرف رہے۔ میں پٹنہ گیا تو دیکھا کہ پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہء اردو کے سوا کسی کا بھی رخ دریا کی جانب نہیں۔

شاید غزل نے اہلِ اردو کو یہ ذوق بخشا ہے۔

فروری کا آخری ہفتہ تھا اور موسم ویسا ہی تھا جیسا اسے ہونا چاہئے۔ میں دوپہر بارہ بجے پہنچا۔ چار گھنٹے بعد ہماری ٹی پارٹی تھی۔ ٹھیک چار بج کر ایک منٹ پر مہمان آنے لگے۔ چونکہ اس سارے معاملے میں برطانیہ کا نام بھی آتا تھا اس لئے بہار والوں نے اُس شام برطانوی طریقہ اپنایا اور ثابت کر دکھایا کہ لوگ چاہیں تو وقت کی پابندی کرنا کوئی ایسا بڑا کام نہیں۔

اُس شام دو کام ہوئے۔ ایک تو میرے اور سننے والوں کے درمیان سے مائیکروفون ہٹ گیا' دوسرے یہ کہ آوازوں کی آمدورفت دوطرفہ ہوگئی۔ خوش پوشاک خواتین' خوش وضع نوجوان' شفیق بزرگ اور چاہنے والے ہم عمر' سبھی آئے اور دیر تک دنیا زمانے کی باتیں ہوتی رہیں۔

پچاس ساٹھ کا اتنا مسرور مجمع کسی نے کب دیکھا ہوگا۔ ہر ایک کے چہرے پر اتنی مسکراہٹ تھی کہ فوٹو گرافر کو ایک بار بھی 'چیز' کہنے کی فرمائش نہیں کرنی پڑی۔

کچھ بھی ہو' بہار والے ہوتے ہیں بہت بھولے۔ اس شام وہ سارا مجمع گھل مل کر باتیں کر رہا تھا' اس دوران کسی نے مجھے بڑے پیار سے دعوت دی کہ آج شام کا کھانا ہمارے گھر کھایئے۔ یہ سننا تھا کہ ہر ایک کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ وہ سب میرا جواب سننا چاہتے تھے۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر ایک اپنے گھر کھانے پر بلانے کا حق دار بن جاتا۔

میں اُس شام فارغ تھا اور جی بھی چاہا کہ اتنے خلوص سے دی جانے والی دعوت مسترد نہ کروں۔ لیکن تا حدِ نگاہ سوالیہ چہرے دیکھتے ہوئے مجھے یہ ہی کہنا پڑا۔ 'آپ کا شکریہ' میں نہیں آسکوں گا'۔ میری نہیں سنتے ہی سب جیسے مطمئن ہوگئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تو کسی کے ہاں نہیں گیا۔ سب میرے ہاں آ گئے۔ آدھی رات تک نجانے کتنے ہی احباب اور کتنے ہی عزیز ملنے آتے رہے اور میرا ہوٹل کا کمرہ بھرا رہا۔

اگلی صبح آنکھ مرغ کی بانگ سے نہیں بلکہ کوّوں کے شور سے کھلی۔ مجھے خدا بخش لائبریری جانا تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلا تو وہ بڑا سا گول میدان نظر آیا جو اب شاید گاندھی میدان کہلاتا ہے۔ سنا ہے کبھی اس میں گھوڑے دوڑتے تھے۔ اب اس میں سیاست کے گھوڑے دوڑتے ہیں یعنی بڑے بڑے جلسے اور دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔

میدان کی پرلی طرف گول گھر ہے۔ رات وہ قمقموں سے سجا تھا تو جھلملاتی چھتری جیسا نظر آ رہا تھا' صبح اٹھ کر دیکھا تو وہ غلّے کا گودام نکلا جو آئے دن کے قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے انگریزوں نے کوئی ایک سو چھ سال پہلے تعمیر کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس میں ایک لاکھ ۳۷ ہزار ٹن غلّہ سما سکتا ہے۔ غلّے کا عجیب معاملہ ہے' اس پہاڑ جیسی

عمارت کو تو بھر سکتا ہے مگر انسان کے چھوٹے سے پیٹ کو نہیں بھر سکتا۔

اسی بہار کے سفر سے لوٹ کر آنے والے ہمارے ایک دوست نے ایک بار بتایا کہ انہوں نے دیکھا' کچھ غریب غربا پانی میں بھیگے ہوئے کچے چاول کھا رہے ہیں۔ ہمارے دوست نے ان سے کہا کہ چاول ابالنا اتنا مشکل تو نہیں۔ انہیں ابال کر کھا لیتے۔ غریبوں نے جواب دیا کہ صاحب' ابلے ہوئے چاول ذرا دیر میں ہضم ہو جاتے ہیں اور دوبارہ بھوک ستانے لگتی ہے۔

پٹنہ کے بازار بہت دلچسپ ہیں اور بہت ترقی کر گئے ہیں۔ پہلے جو طرح طرح کی دوائیں اور تیل بیچنے والا شخص سڑک کے کنارے تقریر کرتا اور مجمع لگاتا تھا' اب وہ ایک طرف خاموش بیٹھا رہتا ہے اور اس کی تقریر کا ٹیپ چلتا رہتا ہے۔

برات میں بینڈ بجانے والے اب پیدل نہیں چلتے بلکہ بڑی بڑی موٹر گاڑیوں میں بیٹھ کر بینڈ بجاتے ہیں۔ برات کے ساتھ وہ جو قندیلیں اور جگمگاتے قمقمے چلا کرتے تھے اب وہ ختم ہوئے۔ اب ایک گاڑی پر لدا ہوا جنریٹر ساتھ چلتا ہے اور اس کی مدد سے روشن ہونے والی آرائشی ٹیوب لائٹس اٹھائے دو روپے دہاڑی والے مزدور چلا کرتے ہیں۔

ان دو روپیوں کا بھی پٹنہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہاں کسی نے مجھ سے پوچھا کہ بی بی سی والے آپ کو برصغیر کے دورے پر کیوں بھیجتے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ بہت سے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ انگلستان والے کہتے ہیں کہ یہاں رہ کر آپ کی زبان پر انگریزی کا ملمع نہ چڑھ جائے اس لئے کبھی کبھار آپ کا وطن جانا اور اپنا لب ولہجہ خالص دیسی بنانا ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ واقعی اس میں کوئی شک نہیں۔ جہاں بھی جاؤ زبان پر وہاں کی بولی کا اثر ہونے لگتا ہے' پٹنہ میں رہتے ہوئے مجھے دوسرا ہی دن تھا کہ محسوس ہوا کہ میں 'دو روپے' کو 'دو روپیا' کہنے لگا ہوں۔

بہار میں بہاری کباب کھانے کا تو خیر الگ ہی لطف ہے لیکن پنواڑی کی دکان سے پان کھانے کا جو مزا وہاں ہے' شاید ہی کہیں ہو۔ پٹنہ میں یہ نہیں ہوتا کہ آپ پنواڑی سے پان لیں' پان کو منہ میں دبائیں اور روانہ ہو جائیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ پان کھانے والا پان کو منہ میں دبا کر کافی دیر وہیں کھڑا رہتا ہے۔ وہ پان کو منہ میں گھماتا جاتا ہے اور اپنے ذائقے کی مناسبت سے اور چونا یا اور کتھا طلب کرتا رہتا ہے۔ پنواڑی پان کی کترنوں پر مطلوبہ کتھا یا چونا لگا کر دیتا جاتا ہے اور پان کھانے والا مسلسل جگالی کئے جاتا ہے اور حسب ضرورت منہ کے اندر ہی اندر کتھے چونے میں کمی بیشی کرتا جاتا ہے۔ بالآخر جب یہ طے ہو جاتا ہے کہ اب سب کچھ ٹھیک ہے تو پنواڑی ایک بار پھر چھالیہ دیتا ہے۔ اُسے بڑی مہارت سے منہ میں ڈال کر ہم آگے چل دیئے اور آخر کو اناڑی جو ٹھہرے۔ اگلے

ہی موڑ تک اندازہ ہو گیا کہ منہ بری طرح کٹ گیا ہے اور اس میں جلن بھی محسوس ہو رہی ہے۔

میزبان کے پاس پہنچتے ہی ہم نے انہیں خبردار کر دیا۔ ''دیکھئے' آپ کے شہر کا پان کھا کر میرا منہ کٹ بھی گیا ہے اور جل بھی رہا ہے اس لئے اگر میں جلی کٹی باتیں کروں تو مجھے کچھ نہ کہیے گا۔''

مجھے پورا ایک دن خدا بخش لائبریری میں گزارنا تھا۔ کتب خانے کے نگراں عابد رضا بیدار ہیں جن کی بیداری کا یہ عالم ہے کہ ان کا کتب خانہ کبھی خوابیدہ نہیں ہوتا۔

وہ بہت پیار سے ملے' کتابوں کی طرح مہمانوں کو بھی پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ دیر تک بڑی بڑی تاریخی کتابیں دکھاتے رہے۔ جیسے دیوانِ حافظ کا وہ نسخہ جو ہمایوں ایران سے لایا تھا۔ وہ نسخہ داراشکوہ تک چلا جس نے لکھا ہے کہ ہمارے باپ دادا اس سے فال نکالا کرتے تھے۔ ہمایوں اور جہانگیر نے اس سے جو فال نکالی حاشئے میں اس کا احوال بھی لکھ دیا۔ اسی طرح میرے اصرار پر انہوں نے قرآن کا وہ نسخہ دکھایا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں تیس کے بجائے چالیس سیپارے ہیں۔ انہوں نے اس کی حقیقت یوں بتائی کہ اصل قرآن کو چالیس حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

اسی کتب خانے کے برآمدے میں برصغیر کے نہایت معتبر اور محترم تاریخ داں پروفیسر سید حسن عسکری صاحب سے ملاقات ہوئی اور یوں لگا کہ یہ ملاقات نہ تھی' زیارت تھی۔ کچھ یہی حال اردو کے بہت بڑے دانش ور قاضی عبدالودود صاحب سے ملاقات کا رہا جس کے بارے میں تمام عمر فخر کیا جا سکتا ہے کہ انہیں دیکھا تھا اور ان سے گفتگو کی تھی۔ ان سب کی باتیں میرے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ ہیں۔

خدا بخش لائبریری کی سیر جاری تھی کہ کسی نے آ کر خبر کی کہ کچھ طالب علم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ 'کچھ طالب علم' نہیں تھے بلکہ پوری جماعت تھی جو پٹنہ یونی ورسٹی سے اُٹھ کر لائبریری میں آ گئی تھی۔

کتاب اور علم کے یہ دو مرکز ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہیں۔ طالب علموں کا اصرار تھا کہ میں یونی ورسٹی کا دورہ کروں۔ ایسے اصرار پر جو انکار کرے وہ کافر۔ چنانچہ میں نے اپنے ایمان کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اگلی صبح پٹنہ کی اُس جامعہ میں قدم رکھا جہاں علم پا کر نام روشن کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے۔

یہاں اردو کا شعبہ کوئی معمولی ڈپارٹمنٹ نہیں جس میں لڑکوں لڑکیوں کو اتنی بڑی تعداد میں دیکھ کر اردو کا مستقبل محفوظ لگا۔ پھر پروفیسر ممتاز احمد' ڈاکٹر اسلم آزاد' ڈاکٹر کلیم احمد عاجز' ڈاکٹر حُمیرہ خاتون اور ڈاکٹر ثریا جبیں جیسے لائق و فائق اساتذہ کو یک جا دیکھا تو احساس ہوا کہ جہاں ایسے ڈاکٹر موجود ہوں وہاں زبان کی صحت کی طرف سے مطمئن رہا جا سکتا ہے۔

اُس صبح بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ لیکچر ہال میں اب تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اس بھاری مجمع سے ہر طرح کی گفتگو ہوئی، کچھ سنجیدہ، کچھ علمی، کچھ دانش مندانہ اور پھر کچھ لطیفہ گوئی، اور کچھ لطافت اور ظرافت کی باتیں۔

ہوا یہ کہ میں نے شروع ہی میں طالب علموں سے کہا کہ اگر آپ کو لگے کہ میری باتیں اکتا دینے والی ہیں تو اپنا سر کھجا دیجیے گا، میں گفتگو مختصر کر دوں گا۔ اس پر لڑکوں نے شور مچایا کہ یہ نہ کیجیے گا۔ یہاں لڑکیوں کے سروں میں جوئیں ہیں۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ اردو کے شعبے میں وہ لوگ بھی داخلہ لے لیتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ آسانی سے پاس ہو جائیں گے۔ اس پر میں نے اُس لڑکے کا قصہ سنایا جو بالکل نالائق تھا اور کسی حال پاس نہیں ہوتا تھا۔ آخر اساتذہ نے طے کیا کہ اس سے بالکل ہی آسان سوال پوچھے جائیں۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ غالب کی بیوی کون تھیں۔ جواب ملا۔ 'غالباً'۔ پھر پوچھا گیا کہ یہ مصرعہ کس کا ہے۔ 'غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں'۔ جواب ملا۔ 'غالب کی بیوی کا'۔

قہقہے کم ہوئے تو داد و تحسین کا شور بلند ہوا۔ ڈاکٹر کلیم عاجز اپنے مخصوص ترنم سے اپنی غزل سنا رہے تھے جس میں ایسے ایسے شعر تھے۔

گھر کوئی سلامت نہیں اب شہر وفا میں
تو آگ لگانے کو کدھر جائے ہے پیارے
وہ بات ذرا سی جسے کہتے ہیں غمِ دل
سمجھانے میں اک عمر گزر جائے ہے پیارے

۲۳-۲۴ فروری ۱۹۸۲ء

تمیں سال بعد

بہار والوں کی شفقت اور مہمان نوازی آج بھی یاد آتی ہے۔ ان کے اندازِ پذیرائی میں جو والہانہ گرم جوشی تھی، ذہن میں محفوظ تو ہے لیکن کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اس کے بعد اُن سے رابطہ نہ رہا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یوں لگا کہ وہ نگاہوں سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ان کی تصویریں موجود ہیں جو آج

بھی پرانے احساس جگاتی ہیں۔

شہر پٹنہ میں جو عمارت ایک روشن مینار کی طرح کھڑی ہے وہ خدا بخش لائبریری ہے۔ اُس روز وہاں ایک عجب دستور دیکھا تھا کہ اگر کسی شخص کو کسی قدیم کتاب کی نقل درکار ہوتی تھی تو وہاں بیٹھے ہوئے خوش نویس ویسے ہی قدیم نظر آنے والے کاغذ پر پوری کتاب کی نقل کیا کرتے تھے۔

آج میں نے وہاں لائبریری کے نئے ڈائریکٹر امتیاز احمد صاحب سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ اس دوران ہونے والی ترقی کا کچھ احوال سنایئے تو یہ سن کر دل جھوم اٹھا کہ اس قدیم کتب خانے کو جدید ٹیکنولوجی میں ڈھال دیا گیا ہے۔ زیادہ تر پرانے مخطوطے اور مطبوعہ کتابیں ڈیجیٹل شکل پا کر کمپیوٹر میں محفوظ ہوگئی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب لوگ گھر بیٹھے اپنے کمپیوٹر کے پردے پر وہ کتابیں اور مخطوطے دیکھ اور پڑھ سکیں گے۔ اب کوئی خوش نویس پرانے نسخوں کو سامنے پھیلا کر ان کی نقل اتارنے کے دوران ان کے صفحوں اور جلد بندی کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا بلکہ جدید مشین اصل کتاب کو ہاتھ لگائے بغیر اس کی ایک نہیں درجنوں نقلیں اتار دے گی۔

میرے پہلے سفر کے وقت جناب عابد رضا بیدار کتب خانے کے نگراں تھے اور جیسا کہ میں نے ان دنوں لکھا تھا' ان کی طرح ان کا کتب خانہ نہ صرف بیدار بلکہ جیتا جاگتا' فعال' سرگرم اور مصروفِ عمل نظر آتا تھا۔ بیدار صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ ریٹائر ہو کر وہ اپنے آبائی شہر رام پور چلے گئے لیکن پڑھنے لکھنے سے نہیں گئے۔ وہ دلّی کی ہمدرد یونی ورسٹی سے وابستہ ہیں اور وہاں ریسرچ اسکالر ہیں۔

پٹنہ یونی ورسٹی میں اردو کی تعلیم اسی طرح جاری ہے لیکن وہ سارے اساتذہ جو مجھے ملے تھے' اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ ایک پروفیسر ممتاز احمد تو دنیا سے سدھار گئے' ڈاکٹر اسلم آزاد ریٹائر ہو کر سیاست سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اچھا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس میدان میں قدم رکھیں۔ ڈاکٹر حمیرہ خاتون اور ڈاکٹر ثریا جبیں' دونوں اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی ہیں۔۔ ڈاکٹر کلیم عاجز جو اُس وقت بھی ضعیفی کی دہلیز سے لگے کھڑے تھے' ان کے بارے میں دل کو خوش کرنے والی خبر ملی کہ نہ صرف بخیر و عافیت ہیں' باقاعدگی سے لائبریری آتے ہیں' اُسی لگن سے شعر کہتے ہیں جن میں آج بھی ویسی ہی جولانی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسی لحن سے شعر پڑھ کر آج تک اپنی بات سمجھاتے ہیں:

وہ بات ذرا سی جسے کہتے ہیں غمِ دل ۔۔۔ سمجھانے میں اک عمر گزر جائے ہے پیارے

جانبِ بھوپال

اپنے بہت سے پیاروں کو الوداع کہہ کر میں صبح تڑکے ہوائی جہاز میں بیٹھا تو گنگا کی لہروں پر سورج کی کرنیں چمکتی دیکھیں اور جب بھوپال میں اُترا تو صبح کی دھند چھٹ رہی تھی اور شاہ جہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم کے شہر پر پڑی ہوئی رات کی نقاب اُٹھ رہی تھی اور تاج المساجد کے مینار اُس انگشت جیسے نظر آرہے تھے جو شہادت دے رہی ہو عظمتِ رفتہ کی۔

راجا بھوج کی حکمرانی' پنڈاریوں اور مرہٹوں کی جنگ' شہر کا نو مہینے طویل محاصرہ' بیگمات بھوپال کے دور' پردہ' عصمت' عفت' شجاعت۔ ذہن میں ان سب کے چراغ جل اُٹھے اور دیکھا کہ ہمارے سامنے ہمارے دوست اور اداکار سعید جعفری کھڑے ہیں۔ کچھ دن پہلے لندن میں ملے تھے' اُس روز بھوپال کے ہوائی اڈے پر ملے۔ اپنی کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے آئے تھے۔

شمالی ہندوستان کے شہروں کے بعد جہاں انسانوں کی بہتات ہے' بھوپال بڑا ہی پرسکون شہر لگا۔ اونچی نیچی سڑکیں' نئی پرانی عمارتیں' تنگ بازار' بارونق چوراہے' شاندار مسجدیں' بڑے بڑے مدرسے' دور دور تک پھیلی ہوئی جھیلیں اور ان پر منڈلاتے ہوئے دنیا بھر کے پرند' یہ سب بہت بھلے لگے۔

دلّی میں کسی نے کہا تھا کہ رات کے وقت زیادہ رقم لے کر نہ نکلنا' لکھنؤ میں رکشہ والے نے رات کے دوران گومتی کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا' بہار کے جرائم پیشہ تو دور دور تک مشہور ہیں' بھوپال بھی ڈکیتوں کے علاقے سے زیادہ پرے نہیں مگر وہاں میں نے رات ایک بجے تک بازار کھلے دیکھے اور ان میں برقع پوش خواتین کو بچوں سمیت گھومتے دیکھا۔

پردے کی جیسی روایت بھوپال میں ہے' کہیں نہ ہوگی۔

بھوپال میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارے نہایت شفیق اور مہربان بزرگ جہاں قدر چغتائی صاحب بھی اسی شہر میں آباد ہیں' بلکہ یوں کہوں کہ ان سے یہ شہر آباد ہے۔ سر کے بال برف جیسے اور آنکھوں کی بھنوؤں سے اُتر کر سفیدی اب پلکوں تک پہنچنا چاہتی ہے مگر شہر میں اسکوٹر چلاتے ہیں بالکل

نوجوانوں کی طرح۔ اُستاد ہیں اور اتنے بہت سے لوگوں کو پڑھایا ہے کہ ایک نسل نہیں، پورا شہر انہیں ماسٹر صاحب کہتا ہے۔ راستے میں ملنے والا ہر شخص انہیں سلام کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دائیں ہاتھ سے سلام کا جواب دیتے جاتے ہیں اور اسکوٹر کا ہینڈل صرف بائیں ہاتھ سے پکڑ کر بڑی مہارت سے چلاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

مارے محبت کے ایک بار مجھ سے ملنے بھوپال سے لندن آ گئے۔ میں پہنچا تو دونوں ہاتھوں سے مجھے یوں تھاما کہ جب تک میں واپسی کے لئے ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھا، مجھے نہیں چھوڑا۔ ایک تو خاطر مدارات، پھر شہر میں جتنے کام تھے ان سب میں دوڑ دھوپ۔ جس کا میں نے نام لیا اُسے پکڑ کر لے آئے یا اُسی اسکوٹر پر بٹھا کر مجھے لے گئے۔ راہ چلتے کوئی بی بی سی کا سامع نظر آ گیا تو آوازیں دے دے کر اُسے بلا لیا اور ملاقات کرا دی۔ دکان داروں سے تعارف کرا دیا، مولانا آزاد لائبریری دکھانے لے گئے۔ وہ بند ہو رہی تھی۔ نہ معلوم کس سے کہہ سن کر دوبارہ کھلوا دی۔ وہاں میں نے بہت پرانے مخطوطے دیکھے، حضرت آدم سے لے کر بھوپال کے کسی رئیس تک کئی میٹر لمبا شجرہ دیکھا، قرآن کے ایسے ایسے دلکش صفحات دیکھے کہ انہیں دیکھ کر ہی ایمان تازہ ہو جائے۔ اوپر سے خود لائبریری کی عمارت اتنی حسین کہ کسی شہزادے کے محل کا گمان ہو۔ بس دکھ یہ سن کر ہوا کہ حکام بالا لائبریری ختم کر کے وہاں پولیس کا دفتر بنانے والے ہیں۔

تو کیا حکام بالا ہر جگہ کے ایک جیسے ہوتے ہیں؟

شہر کے دانش وروں، اساتذہ، شاعروں، چار بیت گانے والوں، اور پرانی کتابوں کے ان تاجروں سے ملاقاتیں ہوئیں کہ دیوانِ غالب کا خود مرزا ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قدیم نسخہ ان کے ہاتھ لگا تھا جسے امروہے کا ایک کتب فروش باتیں بنا کر لے گیا اور ہزاروں کمانے کی کوشش کی لیکن کسی اور نے ویسی ہی باتیں بنا کر اس سے وہ نسخہ لے لیا اور لاکھوں بنانے کا ارادہ کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ نسخہ جعلی تھا۔

اتنے بہت سے ملنے والوں سے ملا مگر سچی بات یہ ہے کہ پھر بھی تشنہ ہی لوٹا۔

میں بھوپال سے چل رہا تھا، راستے میں کوئی ملا تو میں نے کہا کہ میں جا رہا ہوں۔

اُس نے پوچھا۔ کیوں؟

میں نے کہا۔ دوبارہ آنے کے لئے۔

۳/مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

بھوپال کی جو بات مجھے اچھی لگی تھی وہ یہ کہ بڑا پُرسکون سا شہر تھا جس کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ اس کی آبادی

کم ہے۔ مجھے اور میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ٹھیک دو سال بعد اس شہر پر قیامت ٹوٹے گی۔ ایسی قیامت کہ صرف ۷۲ گھنٹوں میں اس شہر کے دس ہزار باشندے مر جائیں گے اور وہ سلسلہ چلتا رہے گا یہاں تک کہ بعد میں اور ۲۵ ہزار افراد دم توڑ دیں گے۔ برصغیر میں بسنے والے بڑے سخت جان بھلکڑ ہیں۔ دیکھتے دیکھتے بھول گئے کہ ۳ دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء کو بھوپال میں کیڑے مارنے والی دوائیں بنانے والے ایک کارخانے سے زہریلی گیس کے بادل اٹھے تھے جو شہر پر اس طرح اترے کہ سوتے ہوئے لوگ اپنے بستروں میں اور راہ چلتے لوگ سڑکوں پر اور گلیوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح مر گئے۔ بے شمار لوگ آج تک بیمار ہیں اور ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچے بھی ویسی ہی بیماریاں لئے پیدا ہو رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا کہ یہ ایشیا کا ہیروشیما تھا۔ جاپانی جزیرے پر گرنے والا وہ بم بھی امریکی تھا اور بھوپال میں لگنے والا یہ کارخانہ بھی بڑی حد تک امریکی تھا۔ کہتے ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اتنی بڑی صنعتی تباہی پہلے کبھی نہیں آئی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس روز محاورے کی زبان میں نہیں بلکہ حقیقت میں قیامت کا منظر تھا۔ لوگوں نے پہلی بار یہ دیکھا کہ اپنی جانیں بچانے کے لئے مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر بھاگیں۔

اب مجھے بھوپال میں اپنے واقف کاروں کی تلاش تھی۔ وہاں میرے بزرگ دوست جہاں قدر چغتائی نئی صدی کے پہلے برس میں انتقال کر گئے لیکن ان کے بیٹے ساغر چغتائی مل گئے اور ٹیلی فون پر میری آواز سن کر کھل اٹھے۔ دیر تک اپنے انسان دوست، شفیق، اور ہر دل عزیز والد کی باتیں کرتے رہے۔ بتا رہے تھے کہ اس دوران چغتائی صاحب کے اخباری کالموں اور نظموں اور غزلوں کے دو انتخاب شائع ہوئے جن کی رسم اجرا ادا کرنے کے لئے بمبئی سے سرکردہ شاعر جاوید اختر بھوپال آئے۔

میں نے پوچھا کہ سارا شہر انہیں ماسٹر صاحب کہا کرتا تھا کیونکہ قریب قریب ہر شخص ان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ کیا وہ لوگوں کو اب بھی یاد ہیں؟۔ ساغر بتانے لگے کہ ایک بار وہ کچھ رقم نکلوانے بینک گئے جہاں بینک والوں نے شناخت کے کاغذات مانگے جو اس وقت ان کے پاس نہیں تھے۔ بینک والوں نے پورا نام پوچھا اور جب انہوں نے بتایا 'ساغر چغتائی' تو بینک منیجر نے سن لیا اور پوچھا کہ کیا آپ ماسٹر صاحب کے بیٹے ہیں؟۔ ساغر نے اثبات میں جواب دیا تو منیجر نے عملے کو ہدایت کی انہیں جتنی رقم درکار ہے وہ دے دی جائے۔

جو مرنے والے اپنی نیکی کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں، جی چاہتا ہے کوئی انہیں مردہ نہ کہے۔

میں نے ساغر کو یاد دلایا کہ جن دنوں میں بھوپال آیا تھا مجھے وہ منظر یاد ہے کہ رات ایک بجے بازار کھلے ہوئے تھے اور باپردہ اور بے پردہ خواتین اپنے بچوں کی انگلیاں تھامے گھوم رہی تھیں۔ کہنے لگے کہ یقین کیجئے کہ آج بھی ہر رات وہی منظر ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ چوری چکاری کا کیا حال ہے۔ بتانے لگے کہ عجیب بات ہے کہ پرانے شہر میں لوٹ مار برائے نام ہے البتہ اطراف میں آباد ہونے والی مالداروں کی بستیوں میں آج کے

زمانے کے سارے جرائم ہو رہے ہیں۔

سچ ہے۔ جہاں لوٹنے کو کچھ نہ ہو وہاں لٹیروں کا کیا کام۔

بھوپال کی آبادی ایک بار پھر بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ شہر ہر سمت میں پھیل رہا ہے۔ صنعتی ترقی ہو رہی ہے جس کے ساتھ وہ سارے مسائل سر اٹھا رہے ہیں جو خوش حالی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے آتے ہیں۔ وہاں اب سولہ سے زیادہ پولیس اسٹیشن قائم ہیں۔ پولیس کے ذکر پر یاد آیا کہ وہ ایک تاریخی کتب خانے پر قبضہ کرنے چلی تھی۔

مجھے بھوپال کی ایک شاہی عمارت میں قائم مولانا آزاد لائبریری کی فکر تھی۔ جیسی شاندار عمارت تھی اس میں ویسے ہی نادر اور نایاب قلمی نسخے جمع تھے۔ لیکن خاصی مصدقہ خبر تھی کہ حکام کے سر میں سودا سمایا ہے اور وہ لائبریری بند کر کے اس کی جگہ پولیس کا دفتر کھول رہے ہیں۔

چغتائی صاحب کے ایک شاگرد ناصر کمال سے میرا رابطہ ہوا تو یہ مبارک خبر ملی کہ شہر کے ہوش مند باشندے اڑ گئے کہ یہ تاریخی کتب خانہ بند نہیں ہونے دیں گے۔ وہاں پولیس کا دفتر تو نہیں کھلا لیکن عمارت کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک یہ ہوا کہ اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ بوسیدہ ہوتی گئی۔ چھتیں ٹپکنے لگیں اور قدیم کتابیں ملیامیٹ ہونے لگیں۔ لیکن جب شہر والوں نے اسے بچانے کی ٹھانی تو فیصلہ ہوا کہ کتب خانہ یہیں رہے گا اور عمارت کو درست کیا جائے گا۔ ناصر کمال نے بتایا کہ عمارت کو دوبارہ سنوارا گیا ہے اور کتابوں کے ذخیرے کا بڑا حصہ محفوظ ہے۔ مگر پھر بھی وہ پہلی سی بات کہاں۔

حیدرآباد کا کمال

مجھے برسوں سے آرزو تھی حیدرآباد جانے کی۔
خدا کا شکر ہے کہ مجھے پرسوں یہ سعادت نصیب ہوئی۔
حیدرآباد کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جو وہاں جاتا ہے، وہیں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اس لئے اگر میں نے یہ کہا کہ میں پرسوں حیدرآباد گیا تھا تو یہ میرا قصور نہیں، حیدرآباد کا کمال ہے۔
ہوا یہ کہ میں شہر کی اُس تاریخی عمارت کی سیر کر رہا تھا جو کبھی سرکار انگلشیہ کی ریذیڈنسی ہوا کرتی تھی اور جس میں اب لڑکیوں کا بہت بڑا کالج ہے۔ کالج کے پچھواڑے دریا بہتا ہے، جس میں بہت عرصے پہلے ایسی طغیانی آئی تھی کہ ریذیڈنسی میں داخل ہونے والا پانی سر سے بھی اونچا ہو گیا تھا۔ یہ پانی جہاں تک گیا تھا دیواروں پر اُس جگہ لگائے جانے والے نشان آج بھی موجود ہیں۔ ہمارے دوست، جو ہمیں عمارت کی سیر کرا رہے تھے، کہنے لگے کہ پرسوں یہاں قیامت خیز سیلاب آیا تھا۔
میں دنگ رہ گیا کیونکہ پرسوں تو میں شہر میں موجود تھا اور سیلاب آنا تو درکنار شہر کی گندی نالیاں تک سوکھی پڑی تھیں۔ تب پتہ چلا کہ حیدرآباد کی پرسوں، دو روز پیچھے تک نہیں بلکہ دو صدی پیچھے تک چلی جاتی ہے، بلکہ اس سے بھی آگے۔
کچھ بھی ہو، میں وہاں کے رنگ میں رنگ گیا۔ ہاں کہنے کے لئے اپنا سر یوں ہلانے لگا کہ ہاں پر نہیں کا گمان گزرے۔ بریانی اور بگھارے بینگن بہت چاؤ سے کھانے لگا۔ طبیعت میں مہمان نوازی سما گئی۔ لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگا، چار مینار سگریٹ پینی شروع کر دی اور مزید دو چار روز رہ لیتا تو دکنی یوں بولنے لگتا کہ 'خیامت' گزر جاتی۔
یہ بات اگرچہ پرانی ہو گئی مگر کہنی ہی پڑتی ہے کہ حیدرآباد کی مکہ مسجد میں ایک بڑا سا پتھر ہے، جو کوئی اُس

پتھر پر بیٹھ جائے وہ دوبارہ حیدرآباد ضرور آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک صاحب کو شہر اتنا اچھا لگا کہ اُس پتھر پر بیٹھنے کی بجائے لیٹ گئے۔

مجھ سے میرے دوستوں نے کہا کہ چل کر ایک بار اُس پتھر پر بیٹھ جاؤ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے کہا کہ اگر میں پتھر پر بیٹھنے کے بعد دوبارہ آیا تو تم لوگ مجھے اور میری محبت کو نہیں بلکہ اس پتھر کو داد دو گے۔

حیدرآباد ہے بھی کچھ ایسا ہی شہر کہ انسان وہاں بار بار جائے۔ جتنا وسیع ان کا شہر اتنے ہی کشادہ لوگوں کے دل، جتنی خوب صورت عمارتیں اتنے ہی خوب سیرت باشندے، جتنے بلند گنبد اور مینار اتنی ہی لوگوں کی نگاہ بلند۔

وہ کہاوت کہ پرانی چیز سونا ہوتی ہے، ہو نہ ہو حیدرآباد سے چلی ہوگی۔ اس شہر کو دیکھیے تو یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ پرانی مسجدیں، وہ پرانے شفاخانے، وہ پرانی عمارتیں، وہ پرانی سڑکیں اور سب سے بڑھ کر وہ پرانی وضع کے لوگ، سونا نہیں تو سونے میں تولے جانے کے قابل ضرور ہیں۔

وہی شیروانیاں، وہی ترکی ٹوپیاں، وہی وضع قطع، وہی چال ڈھال، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی تکلفات اور جھک جھک کر سلام کرنے کا انداز۔ آدمی قربان نہ جائے تو کیا کرے۔

خوش نصیبی ہے شہر کی کہ جو کچھ پرانا ہے، اچھی طرح محفوظ ہے۔ اور ستم ظریفی ہے شہر کی کہ جو کچھ نیا ہے، وہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ ایک جگہ سڑک دیکھی جو آدھی صحیح سالم اور آدھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ کسی نے کہا کہ سالم حصہ حضور نظام نے اور یہ ناقص حصہ اندا گاندھی نے بنوایا تھا۔ ہائی کورٹ، شفاخانے، عجائب گھر، محلات اور مہمان خانے کی پرانی عمارتیں ایسی بلند گنبدوں اور سرو قد میناروں سے مزین ہیں کہ جب وقت نے کروٹ بدلی اور نئے حاکم ٹینکوں پر سوار آئے تو حیران ہو کر کہنے لگے کہ کیا یہ سب مسجدیں ہیں؟۔ البتہ اب شہر کی سب سے اونچی پہاڑی کے نوبت خانے پر رات بھر جگمگاتی جو عمارت مندر جیسی نظر آتی ہے، وہ نظر کا دھوکا نہیں۔ وہ واقعی مندر ہے۔

میرے بعد جو کوئی حیدرآباد جائے، یہ سوچ کر نہ جائے کہ وہاں ہر طرف اردو بولی جا رہی ہوگی، حیدرآباد کی زبان تیلگو ہے۔ تھوڑے سے لوگ اردو بولتے ہیں۔

لیکن میری اس بات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اردو صرف مسلمانوں کا اثاثہ ہے۔ حیدرآباد کے بے شمار ہندو، خصوصاً کائستھ ایسی اچھی اردو بولتے ہیں کہ ہم سنیں اور کہا کرے کوئی۔ اس کے علاوہ وہ اردو سے پیار بھی کرتے ہیں، اس کی قدر کرتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں، چنانچہ جن دنوں میں وہاں تھا، شہر میں شنکر جی یادگار مشاعرہ ہوا، مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ مشاعرے میں آئیں گے؟ میں نے کہا کہ حیدرآباد کا مشاعرہ دیکھ کر نہ گیا تو بالکل یوں ہوگا جیسے کوئی دسترخوان سے بھوکا اُٹھ جائے۔

میں نے 'نہیں' کے انداز میں گردن ہلا کر 'ہاں' کہا تو مشاعرے کے منتظمین نے مارے محبت کے میرا نام

مہمان خصوصی کے خانے میں لکھ دیا۔ ویسے یہ فرض عصمت چغتائی کو سرانجام دینا تھا لیکن وہ کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آ سکیں تو شہر میں میرا موجود ہونا غنیمت سمجھا گیا۔ شہر میں پاکستان سے صادقین بھی آئے ہوئے تھے لیکن ان کا نام شاعروں میں رکھا گیا تاکہ یہ آل ہند مشاعرہ پھر بین الاقوامی مشاعرہ کہلائے۔

اُس شام میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ہزاروں' بلا مبالغہ ہزاروں لوگ چلے آ رہے ہیں' ماں باپ بچے' شوہر بیوی' چھوٹے بڑے' معلوم ہوا کہ سارا شہر اُمڈ پڑا ہے۔ بہت بڑے میدان پر جو نگاہ کی تو دور افق تک غزل اور نظم کے مدّاح نظر آئے۔ ایک طرف مرد' دوسری طرف خواتین۔

شنکر جی یادگار مشاعرے کے زیادہ تر منتظمین غیر مسلم تھے' سب اردو بھی نہیں بولتے تھے مگر سب کو اردو سے لگاؤ تھا۔ سب اس مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

میں مہمان خصوصی بنایا گیا' یہاں تک تو غنیمت تھا لیکن مشاعرے کی کاروائی شروع ہوتے ہی مجھ سے کہا گیا کہ پہلے میں تقریر کروں۔ میری ہتھیلیوں میں ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ مائیکروفون کا سامنا تو میں نے اکثر کیا ہے لیکن اتنے بڑے مجمع کے مقابل تقریر کرنا کسی کڑی آزمائش سے کم نہ تھا۔ ملک کے نامی گرامی شعرا دیکھ رہے تھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ کوئی میری ہمت بڑھانے والا بھی نہ تھا۔

اتنے میں ناظم مشاعرہ نے میرے نام کا اعلان کیا۔ ' علی رضا عابدی'

ہزاروں کے مجمع نے بیک آواز تصحیح کی 'رضا علی عابدی'۔ بس اس کے بعد تو میدان میرے ہاتھ تھا کیونکہ سامنے تا حد نگاہ اتنے بہت سے چاہنے والے بیٹھے تھے۔ اب مشکل یہ تھی کہ کہوں تو کیا کہوں۔ یہ کام میں نے حیدرآباد کی روایت پر چھوڑ دیا۔ بہادر یار جنگ کی تقریر کی لذّت کا راز یہی تھا کہ اس میں جتنا شعور کو دخل ہوتا تھا اتنا ہی جذبے اور احساس کو بھی۔

جن شنکر جی کے نام پر یہ مشاعرہ ہو رہا تھا' انہیں میں اُن لوگوں میں گنتا ہوں کہ فلک برسوں پھرتا ہے تب کہیں خاک کے پردے سے ایسے لوگ نکلتے ہیں۔

شنکر جی اپنے جیتے جی کتنے ہی شفا خانے' اسکول' مدرسے اور کالج بنوا گئے جو غریبوں کے لئے مخصوص تھے۔ وہ سب آج بھی چل رہے ہیں اور نہ جانے کہاں کہاں تاریک گوشوں میں روشنی پھیلا رہے ہیں۔ ایک پولی ٹیکنک صرف لڑکیوں کے لئے ہے۔ جس میں خواتین کو صنعت و حرفت کی تربیت دی جاتی ہے۔

بے شک جس قوم کی مائیں ہنر مند ہوں گی' اُس کے بچے بھی سعادت مند ہوں گے۔
مستقبل کی تعمیریوں کی جاتی ہے۔

....

ایک حیدر آباد ہی کیا' تمام سابق ریاستوں میں جن لوگوں کی باتیں سن کر دکھ ہوتا ہے وہ وہاں کے بوڑھے ہیں۔ وہ گئے دنوں کے گواہ ہیں۔

اُس روز ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ ہر صبح جب ہم نہایت آن بان سے یونی ورسٹی میں داخل ہوتے تھے تو ہال کا فرش آئینے کی طرح دمکتا تھا اور ہم جھک کر اس میں دیکھا کرتے تھے کہ ہمارے بال درست ہیں یا نہیں' شیروانی کے بٹن ٹھیک لگے ہیں یا نہیں۔

اُسی روز مجھے میرے ایک دوست عثمانیہ یونی ورسٹی لے گئے۔ پوری جامعہ کو دیکھنے کے لئے تو ایک عمر چاہیے اس لئے ہم یونی ورسٹی کی مرکزی عمارت اور کتب خانے کے سوا کہیں نہ جا سکے۔ جامعہ عثمانیہ کی مرکزی عمارت میں داخل ہوتے ہی میں نے فرش پر نگاہ ڈالی اور سوچا کہ بھلا یہ فرش بھی کبھی آئینے کی طرح چمک سکتا ہے؟

مگر نہیں۔ ضرور چمکتا ہوگا۔ ثبوت کے لئے جامعہ والوں نے خاک میں اٹے ہوئے فرش کے ایک حصے کے گرد رسّیاں تان کر اس پر پاؤں دھرنا ممنوع قرار دے دیا ہے تا کہ اس کی وہی پرانی شکل برقرار ہے۔ جس میں جھک کر دیکھنے والوں کو خود اپنی شکل نظر آیا کرتی ہوگی۔ اُسے بچا کر رکھنے کا ایک سبب اس بارے میں معذرت کرنا بھی ہوسکتا ہے کہ معاف کیجئے' اس نئی نسل سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کو وہ اس فرش کو اپنے قدموں تلے نہیں روندے گی۔

میں نے جھک کر اُس بچے کھچے فرش میں دیکھا' اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور ان گنت ستونوں' اونچی اونچی محرابوں' کشادہ دریچوں' غلام گردشوں' راہ داریوں اور بل کھاتے زینوں سے آراستہ خواب میں کھو گیا لیکن یہ خواب زیادہ دیر چلنے والا نہ تھا کیونکہ اس عظیم الشان عمارت کی جس دیوار پر نگاہ جاتی تھی اس پر بس یہی لکھا تھا کہ صدر کے لئے فلاں کو ووٹ دو اور جنرل سیکریٹری کے لئے فلاں کو یاد رکھو۔

میں تو بس اتنا ہی یاد رکھ سکا کہ لوگ خود اپنے منہ پر بھی کالک مل سکتے ہیں۔

مرکزی عمارت سے نکل کر اونچے نیچے ٹیلوں پر بنی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے' ہم جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے میں پہنچے۔ اتفاق سے ان دنوں حیدر آباد میں کل ہند انجمنِ ترقی ءاردو کانفرنس ہو رہی تھی اور اسی سلسلے میں یونی ورسٹی کی لائبریری نے اپنی ایک نہایت شاندار نمائش لگائی تھی۔ اُس وقت اگرچہ نمائش بند تھی' مگر پھر وہی حیدر آباد والوں کی مہمان نوازی کام آئی۔ ہمارے لئے انہوں نے جھٹ نمائش گاہ کے دروازے کھول دیئے۔

ہندوستان کے کتنے ہی نام ور لوگوں نے جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی ہے۔ انہیں شمار کرنے کے لئے سیکڑوں لوگوں کی انگلیاں درکار ہوں گی۔ اُن ہی لوگوں نے سند لینے کے لئے جو تحقیقی مقالے لکھے تھے' نمائش میں سجائے گئے تھے' مجھے بتایا گیا کہ ایسے تحقیقی مقالوں سے کتب خانے کی الماریاں بھری پڑی ہیں۔

جس مقالے نے اپنی جانب مجھے سب سے زیادہ متوجہ کیا وہ چالیس پچاس برس پہلے کسی خاتون نے بڑی محنت اور جستجو کے بعد لکھا تھا۔ کسی نے بتایا کہ نہایت اعلیٰ اور معیاری مقالہ ہے۔ مگر اُس پر ممتحن کے سرخ پنسل سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔ ''ناکام''۔

اُس وقت علم کا معیار ہی کچھ ایسا تھا۔

اور ابھی ایک روز پہلے اس جامعہ عثمانیہ میں یہ ہوا کہ جوں ہی امتحان کا پرچہ تقسیم ہوا' طالب علموں نے کہا کہ یہ تو بہت سخت ہے۔ یہ کہہ کر پرچہ چاک کیا اور نعرے لگاتے ہوئے امتحان گاہ سے چلے گئے۔

اِس وقت علم کا دامن یوں چاک ہوتا ہے۔

عثمانیہ یونی ورسٹی میں اور تو سب کچھ ملا' پر کھانے کو کچھ نہ ملا۔ شام کے چار بج چکے تھے اور منہ میں مرکزی ہال کے فرش کی گرد کے سوا کچھ نہیں گیا تھا۔ ہم لائبریری سے باہر نکلے تو پیٹ کا یہ حال تھا کہ کولہے نہ ہوتے تو اس روز پتلون نا معلوم کہاں رکتا۔ ہم سے بری حالت ہمارے دوستوں کی تھی اس لئے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ جب میزبان خود بھوکے ہوں تو وہ جو کچھ کھلوائیں گے' لذیذ ہوگا۔ چنانچہ اس فیصلے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی کہ شہر کے اُس ریستوراں میں چلا جائے جس کی بریانی کی دور دور تک دھوم ہے۔ میزبانوں نے کہا کہ اب چار بجے ہیں' عام لوگ تو پہلے ہی کھا چکے ہوں گے اس لئے ریستوراں میں بیٹھنے کی جگہ آسانی سے مل جائے گی۔ مگر وہاں پہنچے تو یہ عالم دیکھا جیسے بریانی مفت تقسیم ہو رہی ہو۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا کہ باورچی خانے میں داخل ہوں اور بریانی کی دیگ پر ٹوٹ پڑیں۔

ہمارے ایک میزبان کو یاد آیا کہ ریستوراں کے منیجر پر ایک بار انہوں نے کوئی احسان کیا تھا' کیوں نہ ان سے کہہ سُن کے بریانی جلد پانے کی کوئی راہ نکالی جائے۔ یہ ترکیب کارگر ہوئی۔ انہوں نے ایک بیرے سے ہمارے حق میں سفارش کی اور بریانی ڈیڑھ گھنٹے کے بجائے پون گھنٹے ہی میں مل گئی۔

بریانی کھائی۔ ٹھیک تھی۔ بھوک میں کچھ زیادہ ہی ٹھیک لگی۔ تب سمجھ میں آیا کہ جامعہ عثمانیہ سے بھوکے لوٹنے والے لوگ یہیں آتے ہیں اور یہاں آتے آتے اشتہا شدید ہو چکی ہوتی ہے لہٰذا بریانی کی شہرت میں کمال اس کے ذائقے کا نہیں' گاہکوں کی بھوک کا ہے۔

حیدر آباد میں اور کچھ ہو نہ ہو' تعلیم کا بہت چرچا ہے۔ میں نے بہت بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے تعلیمی ادارے دیکھے اور اتنے بہت سے نوجوانوں اور بچوں کو پڑھتے دیکھا کہ جی نہال ہوا۔

ایک چھوٹی سے درس گاہ دیکھی جو رضی الدین صاحب نے کھولی ہے۔ شام دیر تک بچے وہاں تعلیم پا رہے تھے۔ رضی الدین صاحب خود اور ان کا چھوٹا سا کنبہ' یہ سب مل کر بچوں کو پڑھاتے ہیں اور اس طرح کتنے ہی

غریب گھروں کے بچے پڑھ لکھ جاتے ہیں۔رضی الدین صاحب نے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے خود اپنا ایک طریقہ وضع کیا ہے اوران کا دعویٰ ہے کہ اس کی مدد سے بچہ تین مہینے میں روانی سے لکھنے پڑھنے لگتا ہے۔

پھر ایک شام مجھے انوارالعلوم کالج جانے کا موقع ملا۔ شام کی کلاسیں لگی تھیں اور بلا مبالغہ ہزاروں نوجوان تعلیم پا رہے تھے۔ میں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا مگر ان لوگوں نے جھٹ پٹ کلاسوں میں یہ نوٹس گھما دیا کہ میں آیا ہوں۔ ذرا دیر میں کالج کی لائبریری میں بہت سے طالب علم جمع ہو گئے اور ہم لوگوں نے دیر تک باتیں کیں۔

لیکن شہر کے جس تعلیمی ادارے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا اب کچھ اُس کا احوال۔

وہ شہر کا سب سے دل کش علاقہ تھا اور اُس علاقے کی وہ سب سے پُر فضا پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے اوپر بنی ہوئی وہ سب سے خوب صورت عمارت تھی۔ میں سمجھا کسی شہزادے کا مسکن ہے مگر وہ انجینئرنگ کالج نکلا۔ لیکن میں بھی کچھ ایسا غلط نہ سمجھا۔ پہلے کبھی وہ عمارت دکن کے پرنس مکرّم جاہ بہادر کی قیام گاہ تھی، مگر جب مستحق طالب علموں کے لئے انجینئرنگ کالج کھولنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے لئے عمارت کی ضرورت پڑی تو پرنس نے اپنی یہ عمارت کالج کے لئے وقف کر دی۔

اُس شام مکرّم جاہ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب تھی۔ وہاں حیدرآباد کے معززین سے ملاقات ہوئی۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رام ریڈی کے نیاز حاصل ہوئے، خود انجینئرنگ کالج کے پرنسپل سے تعارف ہوا جو اُسی جامعہ عثمانیہ کے پرانے طالب علم نکلے۔ لیکن سب سے بڑھ کر خیر الدین صدیق صاحب سے ملاقات رہی جو حیدرآباد کے ہونہار آرکیٹکٹ ہیں۔ بنیادوں اور عمارتوں کے معاملے کو نبض دیکھے بغیر ہی سمجھ جاتے ہیں چنانچہ ایک مرحلے پر انہوں نے سمجھ لیا کہ قوم کی تعلیم کی بنیادیں بھی ٹیڑھی ہیں اور عمارت بھی خستہ ہے۔ اُن ہی دنوں حکومتِ ہند نے اقلیتوں کو حصولِ علم کی سہولتیں دینے کا فیصلہ کیا اور طے پایا کہ اگر اقلیتیں خود اپنی نئی پود کی تعلیم کا مناسب بندوبست کر سکیں تو اس میں حکومت بھی ہاتھ بٹائے گی۔

حکومت کے اس فیصلے نے کتنے ہی تاریک گوشوں میں روشنی بھر دی۔ حیدرآباد اور اورنگ آباد میں بہت سے چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے میں نے دیکھے جن سے بے شمار لڑکے لڑکیاں فیض پا رہے ہیں۔

خیر الدین صدیق صاحب نے حکومت کے اس نئے فیصلے کو بنیاد بنا کر اس پر علم کی عمارتیں اٹھانے کی ٹھانی۔ خوش نصیب تھے کہ انہیں نہ صرف ہم خیال بلکہ دیانت دار ساتھی بھی مل گئے جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت اور محدود وسائل سے پیسہ نکالا اور نئی نئی درس گاہیں کھلنے لگیں۔ ان اداروں کی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی ایک مذہب یا ملّت کے لئے مخصوص نہیں۔ ان کے دروازے حیرت انگیز طور پر کشادہ ہیں۔

اُس شام پرنس مکرّم جاہ نے ہونہار طالب علموں کو انعامات دیئے۔ ان کا حوصلہ بڑھایا اور کالج کے

بارے میں، جسے وہ بجا طور پر اپنا کالج کہتے ہیں، بڑے اعلیٰ عزائم کا اظہار کیا۔

کالج کی شاہی عمارت کے شان دار استقبالیہ ہال، آراستہ زینوں اور اُس غلام گردش سے گزر کر جہاں کبھی شاہی سواریاں لگا کرتی ہوں گی، میں پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔

سورج کا نور رات کی سیاہ چادر کے نیچے یوں چھپنے لگا جیسے دامن کے اندر چراغ۔

....

اب میں ایک اور پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ اُس وقت اپنی کوکھ سے کوہِ نور اگلنے والی یہ سرزمین چپ سادھے لیٹی تھی۔

جس نے تاریخ پڑھی ہے، وہ گولکنڈہ جائے تو دل کو پتھر کر کے جائے کیونکہ اس کے بُرج، اس کی فصیلیں، اس کے دالان اور اس کے در اپنی کہانی ضرور سناتے ہیں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے وہ اپنی صفائی پیش کر رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں کہ ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ سردار خاں نے اپنے آقا کو مغلوں کے ہاتھوں نہ بیچا ہوتا تو نہ ہم داغ دار ہوتے اور نہ دکن کا دامن۔

اور پھر گولکنڈہ کے در و دیوار، جیسے اپنی باتوں سے خود اپنا ہی حوصلہ بڑھانے لگے۔ ''عبدالرزاق خاں لاری بھی تو تھا۔ اورنگ زیب نے کیسی کیسی رشوتیں نہیں بھیجیں، اُسی پر تو عبدالرزاق نے کہلا بھیجا تھا کہ میں کربلا کے بہتر شہیدوں کی صف میں شامل ہونا چاہتا ہوں، بائیس ہزار غداروں کے لشکر میں نہیں۔ سردار خان نے مغلوں کے لئے قلعے کی کھڑکی کھولی تھی اور عبدالرزاق نے اپنے لئے جنّت کی۔''

گولکنڈہ کے بالا حصار سے نیچے ایک بڑے دالان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے میزبان نے بتایا کہ وہ زنان خانہ تھا، یہ بڑا دالان کبھی سبزہ زار تھا جس پر شام کے وقت شہزادیاں چہل قدمی کیا کرتی تھیں اور ان کے چوڑے دوپٹے دور تک گھاس پر لوٹتے چلے جاتے تھے۔

مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ شاید میزبان نے یہ سب کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ شاید میری چشمِ تصور تھی جو تصویریں بنا رہی تھی اور مٹا رہی تھی۔

میرے میزبان نے کہا کہ چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں۔ میں نے ذرا تامّل کیا تو کہنے لگا کہ جو قطار در قطار مزار ہیں وہ نہیں دیکھیں گے کیا؟

ہم چلتے گئے، قلعہ ہم سے دور ہوتا گیا، پھر مزار آنے لگے اور پیچھے چھوٹنے لگے۔ سلطان قلی قطب شاہ کا مزار، وہی سلطان جو نوے سال کا ہو گیا تو ولی عہد شہزادہ جمشید قطب شاہ نے، جو اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے خود بھی بوڑھا ہو چلا تھا، اپنی بے چینی سے تنگ آ کر باپ کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد خود بیٹے کا مزار، ابراہیم قطب شاہ اور

اس کی بیٹی حیات بخشی بیگم کا مزار' پھر قلی قطب شاہ کا مزار جس نے حیدر آباد کو آباد کیا' اور پھر محمد قطب شاہ کا مزار۔

وہیں شاہی حکیموں کے مزار بھی ہیں جو بادشاہوں کے زخموں پر پھائے رکھتے ہوں گے اور وہیں کچھ دور ایک ٹیلے پر تارامتی کی بارہ دری ہے جو بادشاہوں کے دلوں پر پھائے رکھتی تھی۔ وہیں پریماں متی کی یادگار بھی ہے۔ شاید اسی زمانے میں کہا جاتا ہوگا 'ایک سے دو بھلے'۔

ایسے ایسے دلآویز مقبروں کے ساتھ جو دیکھنے کی جا ہے وہ وہاں کا شاہی غسل خانہ ہے جہاں لا کر ہر میت اہتمام اور احترام سے رکھی جاتی تھی اور اس کے غسل اور آخری رسوم کا بندوبست تھا۔ اس کے درمیان نہایت سبک اور دل کش فرش بنایا گیا ہے جس کے بارہ پہلو ہیں اور بیچ میں بارہ پنکھڑیوں کا کنول تراشا گیا ہے۔ بارہ کا یہ عدد وقت کی علامت ہے جو نہ کسی ادنیٰ کے ساتھ رعایت کرتا ہے' نہ کسی اعلیٰ کے ساتھ۔ مجھے یہ فرش اتنا پرکشش لگا کہ اس کے بیچوں بیچ بیٹھ کر میں نے اپنی تصویر اتروائی۔

میں سیاہ پتھروں سے تراشی ہوئی قبروں کے گرد گھومتا گیا اور ہر قبر پر کھدی ہوئی وہی ایک عبارت ان خاموش مزاروں کے سناٹے میں گونجنے لگی۔ ''نادِعلیاً مظہر العجائب۔ نادِعلیاً مظہر العجائب۔ نادِعلیاً مظہر العجائب''۔

لوٹنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر پلٹ کر اس سرزمین پر نگاہ کی۔ دور پہاڑی پر گولکنڈہ کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے نکل کر چمگادڑیں اپنی خوراک کی تلاش میں اُڑ چکی تھیں۔

گولکنڈہ کے در و دیوار خاموش ہوئے تو میر تقی میر بول اٹھے ؎

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

وقت کا جھونکا مجھے اُڑا لے گیا اور اگلے ہی روز ایک اور مزار کے سامنے لے جا کھڑا کیا۔

اندھیرے غار کی ٹھنڈی زمین پر رخسار ٹیکے ایک شیر سو رہا تھا۔

ٹیپو سلطان۔

۴۔۵۔۶ مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

حیدر آباد کا بڑا کمال ہوتا جو عصمت چغتائی سے ملاقات ہو جاتی۔ اس دوران وہ بھی چل بسیں۔ اپنے

وقت کے بڑے مصور صادقین سے ملاقات ہوئی اور نہ صرف ان کا کلام سنا بلکہ انہیں نوجوانوں کو بڑے اشتیاق سے آٹوگراف دیتے ہوئے دیکھا۔ آٹوگراف میں دستخط نہیں کرتے تھے' ایک تصویر بنا کر دیتے تھے۔ کبھی جی میں آتی تو اپنے مخصوص انداز میں خطاطی کا نمونہ بنا دیتے تھے۔ یہ خوبی ایم ایف حسین میں بھی تھی۔ دستخط کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی شبیہ بھی بنا دیتے ہیں۔ اس دوران صادقین بھی دنیا سے اُٹھ گئے۔ ایم ایف حسین بھی سدھار گئے۔ اس پر یاد آیا کہ ایک اور بڑے مصور گل جی گھر کے ملازم کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ کیسا بڑا خسارہ ہوا۔

۳۰ سال بعد اُن ہی لوگوں کو ڈھونڈنے میں بڑی ناکامی اُس وقت ہوئی جب میں نے حیدرآباد کے رضی الدین صاحب کی تلاش شروع کی۔ میں نے ان کا اسکول دیکھا تھا جو شام کے وقت لگا کرتا تھا اور اس میں شہر کے غریب بچوں کو تعلیم دی جارہی تھی۔ اس کام میں ان کا پورا کنبہ شریک تھا۔ اب جو انہیں ڈھونڈنا چاہا تو نہ وہ خود ملے نہ کوئی ان کا جاننے والا ملا۔ لندن میں حیدرآبادی احباب کا بڑا اجتماع تھا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے اعلان کیا کہ ہے کوئی رضی الدین کا واقف کار؟ کوئی نہ تھا۔ پھر حیدرآباد ٹیلی فون کرنے شروع کئے۔ اسی نام کے کئی حضرات کا نشاں تو ملا لیکن وہ کوئی دوسرے رضی الدین نکلے۔ آخر میں یہ کہہ کر اور تھک کر بیٹھ رہا کہ سچ ہے' غریبوں کا پتہ ٹھکانا مشکل ہی سے ملتا ہے۔

وہیں مجھے انوار العلوم کالج دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اُس وقت تو وہ چھوٹا سا ادارہ محسوس ہوا تھا۔ اب خبر ہے کہ وہ ۲۶ اداروں پر مشتمل ہے جہاں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو پرائمری سطح سے پی ایچ ڈی تک تمام علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ شہر کی ایک تقریب میں خیر الدین صدیق صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے ماہر تعمیر تھے' صاحب حیثیت تھے اور مسلمان نوجوانوں کے لئے تعلیم عام کرنے کا بڑا کام کر رہے تھے۔ اس وقت آندھرپردیش کی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اقلیتیں اپنے تعلیمی ادارے کھولیں تو سرکار ان کا ہاتھ بٹائے گی۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور خیر الدین صدیق صاحب اور ان کے رفقاء نے مل کر سلطان العلوم سوسائٹی قائم کی جس نے ہر علاقے میں پبلک اسکول قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں کو ایم بی اے سے فارمیسی تک تمام ایسے علوم پڑھائے جائیں جن کی بنیاد پر وہ معقول پیشے اختیار کرسکیں۔ یہی ہوا۔ ہزار ہا لڑکے اور لڑکیاں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر عملی زندگی میں داخل ہوئے۔

اب میں نے خیر الدین صاحب کو تلاش کیا۔ آسانی سے مل گئے۔ میں نے کہا کہ آپ نے بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اب آپ کہاں تک پہنچے؟۔ بتانے لگے کہ وہ دس بارہ سال تک علم کو عام کرنے کا مشن چلاتے رہے' اسی دوران انہیں مدینہ میں مسجد نبوی کی توسیع کا فرض سونپا گیا اور وہ اس میں مشغول ہو گئے۔ تب دوسرے ارکان نے کام سنبھالا۔ اب اس میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ سوسائٹی کے پاس بہت بڑی زمین

تھی۔لوگوں نے اس کے ٹکڑے ہتھیانے شروع کردیئے۔اس دوران زمین کی مالیت لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں روپئے ہوگئی جس کی رجسٹری کی فیس دینا مشکل ہوگیا ہے۔خیرالدین صدیق صاحب سے میں نے پوچھا کہ سرکار اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کے قیام کے لئے کیا اب بھی امداد دے رہی ہے تو انہوں نے بتایا کہ اب ریاستی حکومت ہمارے طالب علموں کی فیس میں ہاتھ بٹارہی ہے۔اس کے نتیجے میں بہت سارے اسکول کالج کھل گئے ہیں۔میں نے پوچھا کہ کیا یہ سب دیانت داری سے چل رہے ہیں؟ اور یہ بات ایک خیرالدین صاحب ہی سے نہیں، کئی حضرات سے پوچھی۔سب ہی نے جواب نہ دینے میں عافیت جانی۔آیئے آگے چلیں۔

زور سے بولو' زور سے بولو

ویسا ہی اندھیرا۔ ہوا میں ویسی ہی خنکی۔ دیواروں کا رنگ ویسا ہی مٹیالا۔ وہ شیر کا غار تھا' مقبرہ نہ تھا۔ اس کے بیچوں بیچ ٹیپو صاحب کی قبر تھی۔ قبر پر بڑا سا کپڑا پھیلا دیا گیا تھا جس پر شیر کی سرمئی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔

بالکل یوں لگا جیسے کوئی گھائل شیر زندگی کی آس چھوڑ کر غار کے ٹھنڈے فرش پر رخسار ٹیکے لیٹا ہوا اور بجھی بجھی سی آنکھیں اٹھا کر ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہا ہو اور کہہ رہا ہو کہ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا' میرے ساتھ دھوکا ہوا ورنہ میں بھی آزاد رہتا اور تم بھی۔

ابھی ہماری بس کاویری کے جزیرے پر پہنچی بھی نہ تھی کہ سرنگا پٹم کے قلعے کی فصیلیں' مسجد کے مینار اور مندروں کے کلس نظر آنے لگے۔

کسی نے کہا کہ ٹیپو صاحب کا محل تو دیکھ لو' وہ جگہ تو دیکھتے جاؤ جہاں ٹیپو صاحب زخمی ہو کر گرے تھے۔ وہ فصیل دیکھے بغیر نہ جاؤ جسے توڑ کر فریب کی سپاہ حریّت کے ایوانوں میں داخل ہوئی تھی۔ مگر ہم بس سے اترے اور جو پہلا تانگہ ملا اس میں بیٹھ کر روضے کی طرف چل پڑے۔

سرنگا پٹم سے روضے تک دو میل کا فاصلہ اس روز دو سو میل کا فاصلہ محسوس ہوا۔ ہم نے تانگے والے سے کہا کہ آپ کا گھوڑا بہت کم زور معلوم ہوتا ہے۔ وہ بولا۔ ''نہیں صاحب' آپ کا زیارت کا اشتیاق بہت طاقت ور ہے''۔

کوئی دو سو برس پہلے اسی راستے سے ٹیپو کا جنازہ گزرا تھا۔ اُس رات میسور کا آسمان رویا تھا۔ مینہ ٹوٹ کے برسا تھا۔

جب کاویری کی شاہ راہیں پاک و پاکیزہ ہوگئیں تو سرنگا پٹم کے قلعے سے جنازہ اٹھا۔ اُس پر ٹیپو صاحب

کا پرچم ڈالا گیا اور سرہانے ان کی تلوار رکھی گئی۔ دو میل کے راستے پر دونوں طرف یوروپین فوج سر جھکائے کھڑی تھی۔ ہندوستان کے سپوت کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ بڑی سی گنبد اور اونچے میناروں کے روضے کے دروازے لارڈ ڈلہوزی نے خود بنوا کر پیش کیے۔

میں نے دہلیز کے اندر قدم رکھا۔ سامنے دو قبریں تھیں۔ ایک پر جاہ و جلال کا نور پھیلا تھا۔ وہ عظیم باپ تھا۔ دوسری پر دلاوری اور جرأت کے موتی بکھرے تھے۔ وہ شجیع بیٹا تھا۔ آنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ مسلمان‘ ہندو‘ سکھ‘ انگریز‘ فرانسیسی‘ جرمن‘ سب کے سب ایک دروازے سے داخل ہوتے تھے۔ ان کے سر جھک جاتے تھے اور نگاہیں قبر پر جم جاتی تھیں کہ شاید میسور کے شیر کی چھوٹی سے جھلک نظر آ جائے۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔

دیر تو اُس مہینے فوج کی تنخواہ بانٹنے میں بھی کی گئی تھی۔ جیسے جیسے تنخواہوں کی تقسیم کا وقت دور ہوتا جاتا تھا‘ جنرل ہیرس اور جنرل اسٹورٹ کی فوجیں قلعے کے قریب آتی جاتی تھیں۔ ٹیپو کی سپاہ کو اِدھر الجھا کر باہر کی فوجوں کو اشارہ کر دیا گیا۔ قلعے کی فصیل میں شگاف پڑا۔ حملہ آور فوج اندر داخل ہوئی۔ کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ چال چلنے والے ہاتھ کی صفائی دکھا چکے ہیں۔ البتہ سفید فام حملہ آوروں کو خبر تھی کہ ٹیپو کو صرف ایک ہتھیار ہی سے مارا جا سکتا ہے--- دھوکے کے ہتھیار سے۔

مئی کی چار تاریخ تھی۔ سنہ سترہ سو ننانوے تھا اور ٹیپو حیران تھا کہ یہ شور کیسا ہے۔ وہ تلوار سونت کر دوڑتا چلا گیا۔ اور جب وہ بہت آگے نکل گیا اور ٹوٹی ہوئی فصیل پر جا پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ وہ اپنی فوج سے کٹ گیا ہے۔ اس جگہ کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں۔ دیکھنے میں وہ میسور کا والی نہیں بلکہ فوج کا سپاہی نظر آتا تھا۔ لڑتے لڑتے وہ زخمی ہوا اور گر پڑا۔ ہاتھ میں تلوار تھی مگر طاقت نہ تھی۔ ایک یوروپین سپاہی اس کی پیٹی کھولنے کے لئے بڑھا جس پر قیمتی جواہر جڑے تھے۔ ٹیپو کے بازوؤں میں نامعلوم کہاں سے قوت آ گئی۔ اس کی جنگ حریص ہاتھوں کو کاٹ ڈالنے ہی کی جنگ تو تھی۔ اُس نے آخری وار کیا‘ گھائل یوروپین نے بندوق تانی اور ٹیپو کے سر کو نشانہ بنا کر گولی چلا دی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

اُس وقت نعتِ رسول مقبولؐ پڑھی جا رہی تھی۔ ایک شخص پڑھتا تھا۔ مجمع دوہراتا تھا اور دوسرا شخص صدا لگاتا تھا : زور سے بولو‘ زور سے بولو۔ تاریک عمارت کے دروازوں اور جالیوں سے چھن کے روشنی اندر آ رہی تھی۔ میسور کی اگربتیوں کا دھواں فضا میں ٹھہر گیا تھا۔ عقیدت مند وہیں رکھے لوہے کے ایک صندوقچے میں نذرانہ

ڈالتے جاتے تھے۔ بچے حیران تھے کہ ماں باپ کیوں زور زور سے نعت پڑھ رہے ہیں۔
وہ دوسرا شخص چلائے جا رہا تھا: زور سے بولو۔ زور سے بولو۔

۸ مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

یہ کیسا مزار ہے کہ یہاں لوگ نہ منّت مانتے ہیں، نہ چڑھاوے چڑھاتے ہیں، نہ اپنی مرادیں لے کے آتے ہیں اور نہ نذر نیاز کا کوئی سلسلہ ہے، پھر بھی ایک ہجوم ہے کہ چلا آتا ہے۔ آزادی کے نام پر سینہ سپر ہو جانے والے ٹیپو سلطان کو قوم کا اس سے بڑھ کر خراج نہیں ہو سکتا۔ لوگوں نے تو تاج محل میں دفن شاہ جہاں تک کو پیر مان لیا۔ وہاں بڑا سا بورڈ لگا ہے کہ کوئی منت مراد لے کر نہ آئے لیکن کوئی اس بورڈ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ٹیپو کا ایک بڑا اعجاز یہ ہے کہ جنھوں نے اسے مارا وہی اس کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ برطانیہ کے عجائب گھروں اور نمائشوں میں ٹیپو کی کتنی ہی یادگاریں آراستہ ہیں۔ کہیں ان کا خیمہ ایستادہ ہے، کہیں ان کا خنجر سجایا گیا ہے، کہیں ان کے جوتے قرینے سے رکھے گئے ہیں، کہیں ان کا لباس پھیلا کر یوں دکھایا گیا ہے کہ وہ سارا کا سارا نظر آئے۔ اور میسور سے انگریز جو سب سے بڑی ٹرافی لائے ہیں اور جس کی نمائش ادب اور تفاخر سے کرتے ہیں وہ ٹیپو شہید کا وہ آرائشی مجسمہ ہے جس میں ایک انگریز کو نیچے گرا کر ایک شیر اس کے سینے پر سوار ہے۔ دیکھنے میں وہ کھلونا نظر آتا ہے لیکن اس میں کیسا عزم اور کیسا ارادہ سمایا ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ ٹیپو کی آخری آرام گاہ پر حاضری دیئے اب تیس سال ہو رہے ہیں لیکن ایک آواز ہے کہ آج تک کانوں میں آہستہ آہستہ گونج جاتی ہے: زور سے بولو، زور سے بولو۔

میسور کو کس نے سنوارا

جنوبی ہندوستان کا علاقہ بڑا پُراسرار ہے۔

مجھے یقین ہے کہ کرناٹک کے کسی پرانے مندر میں کوئی پوتھی لپٹی رکھی ہوگی جس میں لکھا ہوگا کہ لندن سے ایک مسافر آئے گا جو ایک اندھیری رات بنگلور اور میسور کے درمیان سڑک کے کنارے لالٹین کی روشنی میں کچے ناریل کے سوراخ میں منہ لگا کر اس کا پانی پئے گا۔

ہماری بس شہر میں داخل ہوئی تو آدھی رات کا گجر بجنے کو تھا۔ سیدھی سیدھی کشادہ سڑکیں، چوراہوں کے بیچوں بیچ ٹریفک کے سپاہی کے بجائے راجوں مہاراجوں کے سنگِ مرمر کے مجسمے جن کے سروں پر تراشی ہوئی پتھر کی چھتریاں۔ محلوں کی اونچی اونچی فصیلیں، گھنے گھنے درخت اور ہوا میں تیرتی ہوئی کیسر کے پھولوں کی مہک۔

بس کے اڈے سے ہوٹل تک جاتے جاتے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ بڑے پیار سے بسائے ہوئے شہر میں آیا ہوں۔

میسور کا نام پہلے پہل ہم نے اُس وقت سُنا تھا جب ہم رجب کے کونڈوں پر میسور کی اگربتیاں جلاتے تھے اور جب کلیر کے میلے سے بڑے بھائی مہکتے ہوئے چاقو لاتے تھے جن کے دستے میسور کی صندل کے بنے ہوتے تھے۔

اور اس وقت تو میسور کا نام بار بار سنا جب ہم نے سفر پر روانگی کے وقت خواتین پر یہ راز کھولا کہ ہم میسور بھی جائیں گے تب سلک کی ساریوں کی فرمائشوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔

تھک کر سوئے تو سویرے اُٹھ کر یہ طے کرنے میں دیر لگی کہ ہم کس شہر میں ہیں۔ اُٹھ کر پچھواڑے کی کھڑکی کھولی کہ شہر کے مکانوں کی چھتیں تو دیکھیں، مگر وہاں دیکھا تو ایک پہاڑ کھڑا تھا' کشادہ وادی کے بیچ چھدرے چھدرے درختوں والا پہاڑ جس کی چوٹی پر بنی بڑی سی سفید عمارت صبح کی مدھم روشنی میں نیلی نیلی سی نظر آرہی تھی۔

فرصت کے دور میں وہ مہاراجا کا محل تھا' کاروبار کے اِس دور میں وہ پانچ ستاروں کا ہوٹل ہے۔

جب تک ہم نہا دھو کر تیار ہوئے' کھڑکی کے بالکل نیچے بچوں کا اسکول کھل گیا تھا اور وہ کنڑی زبان میں خدا کی حمد گانے لگے۔ استانیاں اپنی ساریوں کے پلّو سر پر ڈال کے ادب سے کھڑی ہو گئیں تب اتنی بہت سی ساریاں دیکھ کر یاد آیا کہ ہم میسور میں ہیں۔ میسور بھی ایسا کہ جو بڑے اصرار کے ساتھ دعوتِ نظارہ دے رہا ہو۔

ہم نے اپنا تھیلا اٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے۔ وہ پہاڑ چمنڈی کا پہاڑ تھا۔ سیاحوں کی کتاب کے مطابق سطح سمندر سے تین ہزار چار سو نواسی فٹ اونچا۔ ہم ناپنے والوں کو بھی داد دیتے جاتے تھے اور سڑک بنانے والوں کو بھی جنہوں نے شہر کے قلب سے چمنڈی کی چوٹی تک نہایت عمدہ سڑک بنائی تھا۔ شہر سے پہاڑ کو دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ خوشی پہاڑ پر سے شہر کو دیکھ کر ہوئی۔ میسور کو کسی نے بڑے سلیقے سے بسایا تھا' سیدھی لکیروں کی طرح چلی جانے والی شاہراہوں' سڑکوں اور گلیوں کے درمیان زمین کو عام مکانوں سے نہیں' محلوں جیسی عمارتوں اور شاہانہ باغوں سے بھرا تھا۔ یورپ والے جو اپنے شہروں پر اتراتے ہیں انہیں کوئی لے جا کر میسور دکھائے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے نوجوان سیر و تفریح کے لئے میسور جاتے ہیں اور وہیں کے ہو رہتے ہیں۔ وہ چھوٹی موٹی ملازمتیں کر لیتے ہیں' مثلاً گائے بھینسوں کو نہلاتے ہیں' ان کو چارہ دیتے ہیں اور ان کا دودھ دوہتے ہیں اور جو تھوڑا بہت پیسہ کماتے ہیں اس سے ڈوسا اور رسم کھاتے ہیں۔ بالکل میسور والوں جیسا لباس پہنتے ہیں یعنی ویسی ہی دوہری کی ہوئی گھٹنوں گھٹنوں تک لنگی' اور اس میں نظر آنے والی ویسی ہی دبلی پتلی البتہ سفید ٹانگیں۔

چمنڈی کی چوٹی پر ایک دیوی نے دو بھیانک راکھشسوں' چنڈا اور مُنڈی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس لئے وہ دیوی چمنڈی کہلائی اور آج تک پہاڑ کے اوپر مجسمہ بنی کھڑی ہے۔ وہیں بڑا سا اونچا سا مندر بھی ہے اور راستے میں ایک جگہ شیو جی کے بیل نندی کا مجسمہ بیٹھا ہے۔ یہ ایک ہی بڑی چٹان میں تراشا ہوا اتنا بڑا بیل ہے کہ اس میں درجن بھر بیل سما جائیں۔

تمام سعادت مند سیاحوں کی طرح ہم نے بھی نندی کے سامنے بیٹھ کر اپنی تصویر اتروائی اور تصویر اترواتے وقت یہ سوچ کر مسکرائے بھی کہ جس نندی کو ہم آج تک آنندی کے وزن پر خاتون سمجھتے آئے تھے' تین ہزار چار سو نواسی فٹ کی بلندی پر جا کر ذہن کے دریچے کھلے اور دھیان سے دیکھا تو وہ بیل نکلا۔ تب پتہ چلا کہ قدرت کے بھید جاننے کے لئے رِشی مُنی پہاڑوں پر کیوں جاتے ہیں۔

میسور شہر میں دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو خواتین کے جوڑے سے لٹکتی ہوئی کیسر کی لڑیاں اور دوسرے مہاراجا میسور کا محل۔ یہ محل شہر کے اندر اور بسوں کے اڈّے کے برابر میں ہے اور وہ آٹو رکشہ والے

جھوٹے ہیں جو نو واردوں سے کہتے ہیں کہ آیئے صاحب' پیلیس لے چلیں' کیونکہ دھوپ سے بچنے کے لئے وہ جس اونچی دیوار کے سائے میں کھڑے ہیں وہ پیلیس ہی کی دیوار ہے۔

ہم محل میں داخل ہونے لگے تو ہم سیاہ فاموں کے جوتے اتروا لئے گئے البتہ سفید فام سیاحوں کے جوتوں پر غلاف چڑھا دیا گیا۔ محل کے اندر گئے تو بالکل کسی بڑی فلم کا سیٹ لگا۔ اونچے اونچے ایوان' جھلملاتے ستون اور آئینے جیسے فرش۔ دیواروں پر راجا کے جلوسوں' پریڈوں اور سلامیوں کی ایسی تصویریں کہ نقل پر اصل کا گمان ہو۔ پھر جا بجا لگے ہوئے رنگین شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی دیکھ کر خیال ہوا کہ صرف ایک رقاصہ کی کمی ہے۔ ہم نے اپنے میزبان سے کہا کہ اگر کوئی یہ محل ہمیں دے تو ہم لینے سے صاف انکار کر دیں۔

'کیوں؟'

'اس لئے کہ اس محل میں سبھی کچھ ہے لیکن ہمیں جو قیامت کی پیاس لگی ہے اُسے بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آتا'۔

محل کے پچھواڑے ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ پانی اوکھ سے پینا پڑتا تھا۔ ہم نے مختلف پینترے بدل کے اپنا چلّو پانی کے نیچے لگایا اور اپنا منہ چلّو سے لگایا' دونوں ٹانگیں پھیلا کر دوہرے ہو گئے اور اب جو پانی پینے کی کوشش کی تو بالکل یہ منظر تھا جیسے ریگستان کا کوئی اونٹ لندن کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی خودکار سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہم نے پانی تو پیا مگر اس شان سے کہ ہمارے پیٹ میں کم اور موزوں میں زیادہ پانی گیا۔

اگلے روز ہمیں بتایا گیا کہ اگلے نکڑ سے کے آر ایس کی بس لے لیں۔ اس کرشن راجا ساگر کا قصہ یوں ہے کہ وہاں سے دریائے کاویری گزرتا ہے۔ کسی کو خیال آیا کہ کیوں نہ یہاں بند باندھ کے نہریں نکالی جائیں اور بجلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ پونے دو میل لمبی اور ایک سو تیس فٹ اونچی پتھروں کی ایک دیوار اٹھائی گئی جو بند کم اور فصیل زیادہ نظر آتی ہے۔

بند بندھا تو اس کے پیچھے بڑی سی جھیل اور اس کے نیچے خشک وادی سی بن گئی۔ اب کسی خوش ذوق کے جی میں یہ سمائی کہ کیوں نہ اس نشیب میں بڑا سا باغ لگایا جائے' اس میں جھیلیں اور نہریں بنائی جائیں اور اتنے بہت سے فوارے چلا دیئے جائیں کہ ہوا سے ہر لحہ موتی برسیں۔

اُس برنداون کے باغ میں ہم نے جوں ہی قدم رکھا' منہ سے بے ساختہ نکلا کہ یہاں تو ہم پہلے بھی آ چکے ہیں۔ لوگوں نے حیرت سے ہماری صورت کو دیکھا اور کسی زیرک نے کہا۔ ''بھائی صاحب' آپ نے بمبئی کی

فلمیں دیکھی ہوں گی' ان کے ناچ گانے یہیں فلمائے جاتے ہیں''۔

کیسا دل فریب نقشہ بنایا ہے بنانے والے نے۔ برنداون کا یہ باغ سیڑھیوں کی طرح اترتا جاتا ہے اور ہر روش کی دونوں جانب فوارے اور ہر فوارے کی چاروں طرف روشیں ہیں' پھول ہیں' پودے ہیں' پرندے ہیں' پھوہار ہے جس پر دھوپ پڑے تو دھنک نکلتی ہے۔

پھر رات کو یہ باغ روشنیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ میسور کی تو بنیاد ہی سلیقہ مندی پر رکھی گئی ہے۔ برنداون کے چپے چپے پر رنگ برنگی برقی روشنیاں لگائی گئی ہیں جو کہیں پھولوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں اور کہیں فواروں کے نیچے۔ ہر راستے پر روشنی ہے' ہر سبزہ زار منور ہے۔ جہاں تک نگاہ جاتی ہے' نور ہی نور نظر آتا ہے۔

اس چمن میں جو عجب منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ باغ کی سیڑھیاں اترتے جائیں تو سیدھے ہاتھ پر کھلے دالانوں والی چھوٹی چھوٹی مسجدیں بنی ہوئی ملتی ہے جو تعداد میں نصف درجن تو ہوں گی۔ برنداون میں اتنی مسجدیں بنانے کا سبب میں کس سے پوچھتا؟ لیکن اتنا تو میری سمجھ میں بھی آ گیا کہ مصور کے قلم کی کوئی حرکت بے سبب نہیں ہوتی۔

ایک کے سوا وہ ساری مسجدیں خالی تھیں۔

اچھے دنوں میں بنی ہوں گی کیونکہ وہ گلشن ایسا پر فضا ہے کہ وہاں جا کر عبادت کرنے کو جی چاہتا ہے تو پھر وہ کون تھا جس نے میسور کے تاج میں یہ نگینے جڑے ہوں گے۔

تب کسی نے بتایا کہ ایک یہ باغ ہی کیا' یہ پورا شہر جن لوگوں نے سنوارا ان میں ایک ہی نام سر فہرست ہے:

سر مرزا محمد اسماعیل کا نام۔

۱۰ر مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

جس نے بھی سنوارا' اس کے ہاتھ اتنے مبارک تھے کہ آج جب کہیں سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں آتی' میسور شاید وہ واحد مقام ہے جہاں سے اچھی خبریں آئی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میسور اور ریاست کرناٹک کے مسلمان خود اپنے اوپر حیران ہیں کہ یہ انہیں کیا ہوا۔ ہوا یہ کہ بابری مسجد کے واقعے کا ان پر عجیب و غریب اثر ہوا۔

ان کے اندر ایک بیداری کی لہر دوڑی۔ یک لخت انہیں محسوس ہوا کہ ان کے کام یوں نہیں چلیں گے۔ انہیں یوں لگا کہ ان پر جو بیتی سو بیتی' اپنی نئی نسل کو وہ حالات کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ آج کے میسور کا حال جاننے کے لئے میں نے شہر کے ایک صحافی افسر پاشا کو ڈھونڈ نکالا اور ان پر سوالوں کی بوچھار کردی۔ شہر کا حال کیا ہے' شہر والوں پر کیا گزر رہی ہے' ۳۰ برسوں میں کیا بدلا اور کیا جوں کا توں ہے؟ افسر بہت کام کے آدمی نکلے۔ انہوں نے ذرا سی دیر میں سارا حال کہہ سنایا اور یہ بتانے کے بعد کہ میسور کی آبادی اب پندرہ لاکھ ہے جس میں چار لاکھ مسلمان شامل ہیں۔ افسر پاشا نے یہ کہہ کر مجھے حیران کردیا کہ اب ان میں شعور کی لہر دوڑی ہے۔ کہنے لگے کہ یوں سمجھئے کہ ایک مسلمان آٹو رکشہ ڈرائیور کا لڑکا انجینئرنگ اور لڑکی میڈیسن کی تعلیم پارہی ہے۔ ایک پوری نسل تعلیم کی جستجو میں نکل کھڑی ہوئی ہے اور آنے والا وقت ابھی سے درخشاں نظر آنے لگا ہے۔ اس میں کچھ کمال مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے جنہوں نے آل مسلمین ایجوکیشنل ٹرسٹ' مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی اور مسلم ایجوکیشنل اینڈ کلچرل آرگنائزیشن جیسے بہت سے ادارے قائم کرلئے ہیں جہاں نوجوان جوق در جوق چلے آتے ہیں اور زیور علم سے آراستہ ہوکر لوٹتے ہیں۔ افسر پاشا نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا اور وہ یہ کہ کرناٹک میں جس جماعت کی حکومت ہے' مسلمانوں کے لئے اس کے دل میں ملائم گوشہ نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، عید میلاد کے موقع پر کم سے کم دو مقامات' ہاسن اور شیموگہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلی اور مسلمانوں کو ہر طرح کا نقصان پہنچا۔ لیکن دنیا کے کام کب رکے ہیں۔ شہر کی مسلم آبادی میں اپنی مدد آپ کرنے کا احساس جاگا ہے۔ ایک خبر یہ ہے کہ میسور میں مسلمانوں کے علاقے شانتی نگر میں حضرت مولانا محمد عثمان شریف صاحب' قاضی شہر نے علاقے کے باشندوں کے لئے مفت ہیلتھ کیمپ کا افتتاح کیا جہاں مفلسوں اور ناداروں کا علاج معالجہ کیا گیا اور اس نیک کام میں جو لوگ شریک تھے ان میں سرکردہ مسلمانوں کے علاوہ شری یوگا نند' شریمتی بھاگیہ لکشمی' شری کے اے شنکر' شری وینو گوپال اور میسور کے میئر شری پرشوتم بھی شریک تھے۔ لیکن مسلمانوں کی تعلیم اور ریاست میں اردو زبان کی صورت حال کے تعلق سے یہ خبر دلچسپی سے خالی نہیں کہ ابھی کچھ عرصہ ہوا میسور کے علاقے ادیگری کے سید عبدالغفار کی بیٹی سیدہ نشاط سلمیٰ کو میسور یونیورسٹی کی جانب سے ایم اے اردو میں امتیازی کامیابی پر نہ صرف ڈگری پیش کی گئی بلکہ ریاست کے گورنر شری ہنس راج بھردواج نے شاندار کارکردگی پر نشاط کو مقامی اداروں کی طرف سے سونے کے تین تمغے بھی عطا کئے۔

افسر پاشا نے بتایا کہ ریاست کے قریب قریب ہر تعلیمی ادارے میں اردو کی تعلیم ہورہی ہے اور جو علاقے حیدرآباد کن کی سرحد سے ملتے ہیں وہاں تو اردو کا چلن عام ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی زبان کے فروغ میں مصروف ہے اور کم سے کم تین بڑے اردو روزنامے شائع ہورہے ہیں۔ اور آخری اچھی خبر یہ کہ سیاحت کے معاملے میں شہر میسور کو دنیا میں چوتھا مقام دیا گیا ہے اور اپنے تاریخی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے پر اس شہر کو امتیازی حیثیت دی گئی ہے

چنانچہ شہر کی کشادہ سڑکوں اور عالیشان عمارتوں میں جو قرینہ اور سلیقہ نظر آتا ہے وہ ہندوستان کے شاید ہی کسی دوسرے شہر کو نصیب ہو۔

تو پھر ہم اپنے پہلے سوال کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ کون تھا جس نے میسور کو سنوارا اور وہ کون تھا جس کے مبارک ہاتھ اس شہر کو لگے تھے؟

جواب سادہ اور سہل ہے۔

سر مرزا محمد اسماعیل۔

بمبئی جزیرہ تو نہیں

ہم نے سنا تھا کہ بمبئی ایک جزیرہ ہے۔

جا کر دیکھا تو اُسے پانی کے سمندر کے بیچ انسانوں کا سمندر پایا۔

سارا ہندوستان اُٹھ کر بمبئی میں آ گیا ہے۔ کہتے ہیں اس شہر میں اسّی لاکھ لوگ بستے ہیں۔ دیکھنے سے تو لگتا ہے آٹھ کروڑ سے بھی کچھ سوڈیڑھ سواوپر ہی ہوں گے۔

آدمیوں کے بوجھ تلے دبا ہوا یہی بمبئی کسی زمانے میں ایسا تھا کہ اُٹھا کر شہزادیوں کے جہیز میں دے دیا جاتا تھا۔ یہی شہر تو تھا جو شاہ چارلس ثانی نے کمپنی بہادر کو دس پاؤنڈ سالانہ کرائے پر دے دیا تھا۔

مگر اب حساب ذرا مختلف ہے۔ کبھی یہی بمبئی گیٹ وے آف انڈیا تھا۔ دنیا بھر کے لوگ بمبئی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا کرتے تھے لیکن اب ہندوستان بھر کے لوگ پچھلے دروازوں سے جوق در جوق چلے آتے ہیں اور سنا ہے کہ پھر جاتے نہیں۔

بمبئی میں یہ کشش حال ہی میں پیدا ہوئی ہے ورنہ ابھی سترہویں صدی تک یہاں ٹاپو تھے' سمندری دلدل تھی اور ملیریا تھا۔ بمبئی کے بارے میں مشہور تھا کہ جس شخص نے یہاں دو برساتیں گزار لیں' سمجھو بہت جیا لیکن اب انسان نے بڑے سمندر سے لے کر چھوٹے سے مچھر تک سب پر فتح پالی ہے۔ اپنی تمام دشواریوں کے باوجود اب بمبئی جیتا جاگتا' چمکتا دمکتا' خوشحال شہر ہے اور ہر ایک کا شہر ہے۔ امیر اور غریب دونوں اپنے اپنے حال میں مگن ہیں۔ غریب کی کچھ اس قسم کی فکریں ہیں کہ تیل کے چولہے کو گیس کے چولہے میں کیسے تبدیل کرے اور مال دار کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہے کہ بلیک منی کو وہائٹ منی میں' یا مقامی بولی میں کالے دھن کو سفید دھن میں کیسے تبدیل کرے۔ یہ کالا دھن نہ ہوتا تو آج بمبئی کی آبادی اسّی لاکھ تو کیا' اسّی بھی نہ ہوتی۔

مونوپلی کے کھیل میں ہم نے جو سانتا کروز خریدا تھا وہاں تک مخالف کھلاڑی کے کولابا تک مالداروں کی

ٹیکسی میں جائیے تو چالیس روپے لگتے ہیں اور غریبوں کی لوکل ٹرین میں جائیے تو چالیس پیسے صرف ہوتے ہیں۔ بس زندگی کے انداز میں یہی ایک اور سو کی نسبت ہے۔

میں ہوائی اڈّے سے سیدھا ایلا ارون کے فلیٹ پر پہنچا۔ ایلا کا کنبہ ہمارے کنبے کا دوست ہے۔ وہ خود تھیٹر، ٹیلی وژن، لوک ناچ گانے میں مصروف ہے اور اس کی چھوٹی سی بیٹی ایشیتا اور ملازمہ دن بھر گھر پر اکیلی رہتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اطلاع دیئے بغیر اچانک پہنچوں گا تو ایلا بہت خوش ہوگی۔ جو لوگ بمبئی کی زندگی کے انداز کو نہیں جانتے، ایسی حماقتیں ان ہی سے سرزد ہوتی ہیں۔

میں فلیٹ پر پہنچا تو ایلا شہر گئی ہوئی تھی۔ وہ راجستھان کے لوک ناچ اور گیتوں کے شو پیش کرنے کی تیاریوں میں الجھی ہوئی تھی۔ گھر پر صرف ملازمہ اور ایلا کی بیٹی تھی۔ بمبئی والے عموماً ایسا کرتے نہیں لیکن ملازمہ چونکہ دلّی سے آئی تھی اس لئے اس نے ذرا سا تعارف سن کر ہی مجھے اندر گھر میں آنے دیا اور جب تک میں ایشیتا کو سمجھاتا رہا کہ میں تمہارا ماما ہوں، ملازمہ نے لپک کر بلڈنگ کے دربان کو اطلاع کر دی کہ گھر میں ایک اجنبی مہمان آیا ہے، ذرا خیال رکھنا۔

دادا بھائی نوروجی روڈ کی خاک چھاننے کے بعد جب ایلا شام کو گھر لوٹی تو اچانک مجھے موجود پا کر خوشی سے اچھل پڑی۔

''عابدی صاحب۔ آپ نے کہا تھا نا کہ میں راجستھانی گیتوں کا کیسیٹ بناؤں، وہ بن گیا ہے۔ اب اُس کو لانچ کروں گی اور بمبئی میں راجستھانی فن کاروں کا بہت بڑا شو کروں گی۔''

اس کے بعد دیر تک راجستھانی گیتوں کا ٹیپ بجتا رہا، باتیں ہوتی رہیں اور ایشیتا کی شرارتوں پر ڈانٹیں پڑتی رہیں۔

ایلا نے یہ چھوٹا سا فلیٹ ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدا تھا۔ اگلی صبح میں اس تنگ فلیٹ سے نکل کر دور دور تک پھیلا ہوا شہر دیکھنے چلا۔

بمبئی مرہٹوں کا شہر ہے اور مرہٹے تو ہمیشہ کے قوم پرست ہوتے ہیں چنانچہ سارے شہر کی دیواروں پر یہ نعرے لکھے دیکھے کہ بمبئی کا اصل نام ممبئی ہے، اسے ممبئی کہو، بمبئی نہ کہو۔

اس کے علاوہ بمبئی فلم والوں کا شہر ہے۔ ہر روز وہاں آنے والی ریل گاڑیوں سے کتنے ہی نوجوان عظیم اداکار بننے کے خواب آنکھوں میں لئے اترتے ہیں۔ اس فلم کی وجہ سے روزانہ کروڑوں کا دھندا ہوتا ہے۔ بمبئی میں اور بھی سیکڑوں دھندے ہوتے ہیں اور بہت سے لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں رکھیں اور اس کا کیا کریں۔ کولابا کی طرف ایک جگہ قلفی بِک رہی تھی اور دکان پر لگے ہوئے بورڈ پر لکھا تھا

کہ اس قلفی میں بادام' پستے' زعفران' اصلی کیوڑہ اور دنیا بھر کی قیمتی چیزیں ڈالی گئی ہیں۔ کسی نے بتایا کہ قلفی والا جانتا ہے کہ اس کی قلفی جتنی مہنگی ہوگی اتنی ہی زیادہ فروخت ہوگی۔ اس علاقے کے لوگ سستے مال کو گھٹیا مال جانتے ہیں۔

اوپر سے مالدار عرب اب بیروت چھوڑ کر بمبئی آنے لگے ہیں اور کئی دھندے اب گورکھ دھندے بن کر رہ گئے ہیں۔

بمبئی کی لڑکیوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ سُنا تھا کہ فیشن کے معاملے میں پیرس والوں کے کان کترتی ہیں مگر جو دیکھا تو یہ دیکھا کہ لمبے سے کرتے اور تنگ پاجامے میں پورا بدن ڈھکا ہوا' اوپر سے چوڑا سا دو گز کا پٹہ۔ ہم نے ایلا سے کہا کہ بمبئی کی لڑکیاں تو بہت شریفانہ لباس پہنتی ہیں۔ کہنے لگی کہ یہ تو مجبوری پہنوا رہی ہے کیونکہ آج کل فیشن اسی لباس کا ہے۔ اگلے سال آپ آئیں گے اور مختلف لباس کا رواج ہوگا تو ان ہی لڑکیوں کے بدن پر لباس ڈھونڈنے کے لئے خوردبین درکار ہوگی۔

مگر صاحب' بہت ہی کاروباری شہر ہے۔ ہر شخص صرف اپنے دھندے کی بات کرتا ہے' باقی دنیا سے اسے غرض نہیں۔ کسی سے راستہ پوچھو تو صرف راستہ بتاتا ہے اور اس میں اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ آپ کی سمجھ میں نہ آنے پائے۔

میں نے عجائب گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے دکان دار سے پوچھا کہ عجائب گھر کا بڑا دروازہ کون سا ہے' کیونکہ باقی تمام دروازے بند نظر آرہے تھے۔ اُس ظالم نے بڑا دروازہ تو بتا دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ عجائب گھر میں تین مہینے سے ہڑتال چل رہی ہے اور شاندار ادارے کا دھندا بند پڑا ہے۔

بمبئی میں ایک بڑا دھندا بھیل پوری کا ہے۔ بازاروں میں' چوراہوں میں' دفتروں کے سامنے اور سمندر کے کنارے ہر جگہ بھیل پوری بک رہی ہے۔ ایک بڑے سے مضبوط کاغذ کا نوک دار پیالہ بنا کر اور اس میں الم غلم مسالے اور چٹنیاں ڈال کر اس میں چمچہ یوں گھماتے ہیں کہ دیکھنے والے کو بھی چکر آجائیں۔ اس کے بعد آپ کو یہ کہنے کا پورا اختیار ہے کہ ٹھیک ہے' اس میں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کبھی ہماری طرف آکر وہ چھولے کھاؤ جن میں چھوٹے چھوٹے کوفتے پڑے ہوتے ہیں۔

انسان اگر آگرہ جائے تو تاج محل ضرور دیکھے اور بمبئی جائے تو ایک بار لوکل ٹرین میں سفر ضرور کرے۔ اس ٹرین پر ہر روز چالیس لاکھ افراد سفر کرتے ہیں۔ صبح ہو یا شام' کام پر جانے کا وقت ہو یا نہ ہو' یہ دکھیا ہر وقت کھچا کھچ بھری رہتی ہے۔ نئے مسافروں کو میرا مشورہ ہے کہ درمیان کے کسی اسٹیشن سے سوار ہونے کی کوشش نہ کریں کہ اس میں جان جانے کا خطرہ ہے' بلکہ جس پہلے اسٹیشن پر گاڑی بنتی ہے' وہاں بیٹھیں اور جب ٹرین مسافروں سے لبالب بھر جائے اور روانہ ہو جائے تو راستے میں اسٹیشن گنتے جائیں۔ گنتا یوں ضروری ہے کہ کھڑکیوں سے باہر

دیکھنا اور اسٹیشن کا نام پڑھنا ناممکن ہے۔ اب اگر آپ کو آٹھویں اسٹیشن پر اترنا ہے تو ساتویں ہی اسٹیشن سے اٹھ کر ڈبے کے دروازے کی طرف پیش قدمی شروع کر دیجیے۔ مجمع کو کاٹ کر آگے بڑھتے جائیے یہاں تک کہ جب آپ کا اسٹیشن آجائے تو کوئی مناسب نعرہ لگا کر آخری ہلّہ بول دیجیے۔ اب جب آپ باہر پلیٹ فارم پر نکلیں گے تو بالکل یوں لگے گا جیسے دوبارہ ولادت پا کر نئی دنیا میں آئے ہیں اور نئی زندگی ملی ہے۔

پلیٹ فارم پر اترتے ہی پہلا کام یہ کیجیے کہ اپنی جیب دیکھئے کیونکہ جس مجمع کو کاٹ کر آپ آگے بڑھے تھے وہی مجمع آپ کی جیب کاٹ کر آپ سے بھی آگے بڑھ چکا ہوگا۔ اگر جیب سلامت ہے تو شکر ادا کیجیے کہ تمام رقم بچ گئی۔ اور اگر جیب سلامت نہیں ہے تب بھی شکر ادا کیجیے کہ آپ خود سلامت ہیں۔

اور اگر آپ بمبئی میں لوکل ٹرین پر اس طرح کے دو سفر بھی کر لیں تو سمجھئے بہت جئے۔

۱۲/ مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

جب ساری دنیا ترقی کرنا چھوڑ دے گی، ممبئی آسمانوں کو چھو رہا ہوگا۔ ہر چیز کے انبار ہیں وہاں۔ غلاظت سے لے کر دولت تک۔ جھونپڑپٹیوں کی آبادی آج بھی صبح کے معمولات سے فارغ ہونے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں سمندر کے کنارے جاتی ہے اور فلیٹوں کی آبادی آج بھی کوٹھیوں میں، کوٹھیوں کی آبادی بنگلوں میں اور بنگلوں کی آبادی محلوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ پراپرٹی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور خریدار آسمان کو بھی پھلانگ رہے ہیں۔ صرف ایک چیز ہے جو باقی دنیا اور ممبئی میں مشترک ہے اور وہ ہے دہشت گردی، خوں ریزی اور ہلاکتیں۔ سیکڑوں لوگ مرتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے ملک کے دوسرے علاقوں سے ہزاروں نو وارد آجاتے ہیں۔

میں اُس روز ایلا ارون کے گھر گیا تھا اور ان کی چھوٹی سی بیٹی ایشیتا کو شرارتیں کرتے اور ماں کی ڈانٹیں کھاتے دیکھا تھا۔ ان ۳۰ برسوں میں ایلا اپنے شوبز کے میدان میں کہیں آگے نکل گئیں اور 'چولی کے پیچھے' جیسا گانا گا کر شہرت کی سرحد کو جا لیا۔ حال ہی میں وہ بالی ووڈ کی فلم جودھا اکبر میں شہنشاہ کی آیا ماہم انگا کے روپ میں نظر آئیں اور اپنے صاف اردو تلفظ پر ہماری داد پائی۔ ان کی ننھی بیٹی ایشیتا بڑی ہو کر نہایت خوب صورت نکلی اور اس نے بھی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فلم میں کم اور ٹیلی وژن میں زیادہ مقام بنا لیا۔ اسی دوران نہایت دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی اور ایلا نے دعوت نامے میں لکھا کہ ہماری شہزادی کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیجیے۔

ماں چاہے ممبئی کی ہو چاہے مومباسا کی' اسی طرح سوچتی ہے۔

اس دوران ممبئی کی فلمی صنعت جو بالی ووڈ کہلاتی ہے' امریکہ کے ہالی ووڈ سے آگے نکل گئی۔ یہاں تک کہ ہالی ووڈ والے اپنی فلمیں بنانے ممبئی آنے لگے۔ اس صنعت پر چھا جانے کا جو سلسلہ سنہ چالیس میں دلیپ کمار عرف یوسف خان نے شروع کیا تھا' اسے آگے بڑھانے والے اتنے نئے اور نوجوان خان ممبئی پہنچ رہے ہیں کہ ڈر ہے کہ بالی ووڈ کہیں خانی ووڈ نہ بن جائے۔

شہرِ عشق کے گِرد

شکاریوں، کوہ پیماؤں اور سیاحوں میں ایک خراب عادت ضرور ہوتی ہے۔ اپنی مہم یا اپنے سفر سے واپس آ کر اپنے قصے بہت سناتے ہیں۔

میں جب اپنے سفر سے لوٹا اور کئی دن تک دوست احباب کو اپنے قصے سناتا رہا تو ایک روز کسی نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ پورے ہندوستان کا نہیں، صرف اورنگ آباد کا سفر کر کے آئے ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ میری خرابی نہیں بلکہ اورنگ آباد کی خوبی ہے۔ یہ شہر دو دن میں اتنے بہت سے منظر دکھا دیتا ہے کہ یہ دو آنکھیں ہر لمحہ انہیں جی ہی جی میں دہراتی رہتی ہیں اور بھولنا نہیں چاہتیں۔

خود شہر اورنگ آباد، پھر اجنتا، ایلورا، دولت آباد، خُلد آباد، یہ سب گویا تاریخ کے تصویری البم ہیں جو دورِ حاضر کے طاقوں میں قرینے سے آراستہ ہیں۔ یادگاریں اتنی زیادہ ہیں کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کس کس کو بچایا جائے اور کسے وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ چپے چپے پر مقبرے ہیں اور بعض کے بارے میں تو کوئی جانتا ہی نہیں کہ ان میں کون دفن ہے۔

جو بھی دفن ہے، وقت نے پہلے اسے خاک میں ملایا، اور اب اس کے نشان مٹا رہا ہے۔ ان میں اپنے وقت کے بڑے بڑے مدبّر، عالم، جرنیل، بادشاہ اور بادشاہ گر سوئے ہوئے ہیں مگر وہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ اب کون ان کا حساب رکھے۔ کتنے ہی مقبرے ایسے ہیں جو لوگوں نے اپنے لئے اپنی زندگی ہی میں اور اپنی نگرانی میں تعمیر کرائے اور بعض ایک نے تو فرصت کے اوقات اپنی خالی قبروں میں لیٹ کر گزارے کہ موت ہر حال میں یاد رہے لیکن انہیں خود اپنے مقبروں میں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔ کتنے ہی لوگ کہیں دور مرے لیکن ان کے جنازے رات دن چلا کئے اور بالآخر اس خطے میں آ کر پیوندِ خاک ہوئے اور اپنی دانست میں خلد آباد کو آباد کیا۔ کہتے ہیں کہ محمد تغلق کا ایک دانت ٹوٹا تو اس نے اپنی نگرانی میں شاندار مقبرہ بنوا کر اپنا دانت اُس میں دفن کیا۔

اس پر یاد آیا کہ حیدر آباد دکن میں پرانی کتابوں کے ایک بزرگ تاجر سیّد محمد عبدالرزاق عرشی کی دکان تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ دکان نہ تھی، سالم اور ثابت مقبرہ تھا جس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پرانی کتابیں چنی ہوئی تھیں اور درمیان میں دکن کی کسی شہزادی کی قبر تھی جس پر سبز ریشمی چادر پڑی تھی۔ جتنی دیر عرشی صاحب دکن میں قدیم اور نایاب کتابوں کے مٹ جانے کی دردانگیز کہانیاں سناتے رہے، میں اسی قبر پر کہنی ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ نایاب کتابوں یعنی علم کے خزانوں سے عرشی صاحب کی بے پناہ لگن دیکھ کر میں سوچتا رہا کہ کسی شہزادی کے مقبرے کا اس سے بہتر مصرف نہیں ہوسکتا۔

شام ہوگئی تھی اور میں اورنگ آباد کے ایک کشادہ بازار سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے کنارے اپنے کمرے کی چھت جتنی اونچی ایک پرانی قبر دیکھی جس کی چوٹی پر ایک بکری کھڑی اونگھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا: یہ کس کی قبر ہے۔

جواب ملا: ہوگی کسی کی۔ قبریں تو اتنی زیادہ ہیں کہ کس کس کو یاد رکھیں۔

قریب کھڑا ایک چھوٹا سا لڑکا بولا: میں بتاؤں۔ وہ جو اوپر بکری کھڑی ہے، اس سے پوچھ لو۔

کیسا عجیب خطّہ ہے یہ اورنگ آباد بھی۔ محمد تغلق کا جی چاہا کہ پوری دلّی کو اُٹھا کر اسی کے آس پاس لے آئے۔ اورنگ زیب تو خود اٹھ کر یہیں آ گیا اور اپنا بڑھاپا اسی علاقے میں گزارا، یہیں بیٹھ کر قرآن کی کتابت کی اور یہیں ٹوپیاں سی کر فروخت کیں۔ اس شہر کے در و دیوار بنائے اور پھر خود بے در و دیوار سا ایک گھر بنا کر اُس میں قیامت تک کے لئے سو رہا۔

اورنگ آباد پر قدامت کا وہ رنگ آج بھی چھایا ہوا ہے۔ وہی پرانی شہر پناہ، اس میں کھلتے ہوئے وہی دروازے، وہی ملک عنبر کا بنوایا ہوا آب رسانی کا نظام اور اس کے وہی مینارے۔ وہی صدیوں پرانی پن چکّی اور اُن سب کے در و دیوار پر اگتا ہوا سبزہ۔ بالکل یوں لگتا ہے کہ ایک پوری نسل، ایک پوری آبادی، ابھی تھوڑے دن ہوئے اٹھ کر کسی طرف نکل گئی ہے اور اس کی جگہ موجودہ نسل اور نئی آبادی نے آ کر پڑاؤ ڈال دیا ہے، اتنی نئی کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ کس مزار میں کون دفن ہے۔

مجھے پتہ نہیں کہ میر تقی میر کبھی اورنگ آباد آئے تھے۔ شاید آئے ہوں گے تبھی تو یہ شعر کہے۔

جہاں آگے بہاریں ہو گئی ہیں وہاں اب خار زاریں ہو گئی ہیں
سُنا جاتا ہے شہرِ عشق کے گرد مزاریں ہی مزاریں ہوگئی ہیں

اورنگ آباد کو میں نے واقعتاً شہرِ عشق پایا۔ اتنی محبت' اتنا دھیان' ایسی اپنائیت اور اس قدر لگاؤ کہیں اور نہیں ملا۔ لوگ بمبئی تک آ کر چلے جاتے ہیں' یا بمبئی سے آگے بڑھتے ہیں تو حیدر آباد پہنچ کر دم لیتے ہیں اور راہ میں اورنگ آباد کو چھوڑ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو کوئی بھولا بھٹکا آ جائے' اورنگ آباد والے اسے دل میں بٹھا لیتے ہیں۔

شاید میں بھی نہ جاتا' میرے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ وہ تو حیدر آباد میں انجمن ترقی اردو کے محمد یوسف عثمانی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ دیکھئے' آپ اورنگ آباد نہیں آئیں گے تو بعد میں پچھتائیں گے۔ اتنا اصرار دیکھ کر میں نے سوچا کہ کچھ ایسی ہی بات ہوگی جو مُصر ہیں۔

بمبئی سے میں نے تار دیا کہ آ رہا ہوں۔ تار بابو کو تار کا مضمون دیا تو اس میں اورنگ آباد کے آگے صوبے کا نام یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ ملک میں کتنے اورنگ آباد ہوں گے' پتہ چلا کہ دو تو یقیناً ہیں۔ تار بابو نے ڈپٹ کر پوچھا: کون سا اورنگ آباد؟ میں اپنے خوف زدہ لہجے میں 'آندھرا پردیش' کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولا: دکن؟۔

کیسی توانا بنیاد رہی ہوگی اُس دکن کی کہ آج تک محو نہیں ہوئی ہے۔

یوسف عثمانی صاحب میرے میزبان تھے۔ انہوں نے میرے ٹھہرنے کا بندوبست ایک ریسٹ ہاؤس میں کیا۔ میں نہا دھو کر اور تھوڑا سا آرام کر کے اُن کے گھر گیا تو ان کی بیگم رعنا حیدری اور تینوں بچے نائلہ' سویدا اور ہشام میرے منتظر تھے۔ نہیں معلوم کیسی تصویر کھینچی تھی انہوں نے اپنے ذہن میں۔ میں گیا اور اگلے ہی لمحے گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ بچے پہلے میری گود میں بیٹھے' پھر میری پیٹھ پر چڑھے اور بالآخر کاندھوں پر سوار ہونے لگے' بالکل بندروں کی طرح۔ آخر رعنا سے نہ رہا گیا اور کہنے لگیں کہ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ بالکل اپنے ہیں تو یہیں گھر میں ٹھہراتے۔

میں صبح صبح اورنگ آباد پہنچا مگر میرے آنے کی خبر مجھ سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو بھی ملا شناساؤں کی طرح ملا۔ جہاں میں نے لب کھولے لوگ مجھے پہچان گئے۔ ہر اک کا اصرار تھا کہ اس کے گھر چلوں۔ ہر ایک کی دعوت کہ اس کے ساتھ چائے پیوں یا کھانا کھاؤں۔ یہی ہوا۔ کسی نے چار پائی پر بٹھا کر چائے پلائی اور کسی نے فرش پر بٹھا کر کھانا کھلایا۔ اوپر سے یہ ہوا کہ کراچی میں ہمارے جتنے بھی دکنی دوست ہیں' اورنگ آباد کا ہر

شخص ان کا بھائی بھتیجا نکلا۔

مولانا آزاد کالج جانے کا اتفاق ہوا جہاں نوجوان اردو میں تعلیم پا رہے ہیں۔ بہت سے اسکول اور مدرسے دیکھے جہاں بچے مسدس حالی سے لے کر پہاڑ اور گلہری تک بہت کچھ پڑھ رہے تھے۔ 'اورنگ آباد ٹائمز' اخبار کا دفتر دیکھا جو اگرچہ کم عمر ہے مگر اردو کا معیاری اخبار ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دیکھا جہاں سے اب بھی اردو میں چھوٹے موٹے پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کے قریب اُس پرانی نشرگاہ کی عمارت بھی دیکھی جہاں سے شکیل احمد کی آواز فضا کی لہروں پر دور تک پھیلتی چلی جاتی تھی۔

اورنگ آباد والوں نے اُن گزری ہوئی شخصیتوں اور اگلے وقتوں کو بھلایا نہیں ہے۔ مرزا ظفر الحسن کا ذکر کریں گے تو بڑے فخر سے' حمایت علی شاعر کی بات کریں گے تو بڑے ناز سے' یہاں تک کہ ان کے جو چھوٹے بھائی وہیں آباد ہیں لوگوں نے ان کے نام کے ساتھ بھی لفظ شاعر لگا دیا ہے: مجاہد علی شاعر' عنایت علی شاعر وغیرہ۔

شعر و شاعری کا اورنگ آباد میں اب بھی بڑا چرچا ہے۔ موسیقی' خصوصاً غزل کی محفلیں خوب سجتی ہیں۔ لوگ فنکار بھی ہیں اور دستکار بھی۔

وہ جو احمد نگر کی بادشاہت کے زمانے میں پارچہ باف سرحد پار سے آ کر یہاں بس گئے تھے وہ اب بھی آباد ہیں' آج بھی ویسی ہی کھڈیاں چل رہی ہیں اور مشروع اور ہمرو جیسے کپڑے اب بھی بُنے جا رہے ہیں۔ ہمرو کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے 'ہم رو' بھی کہا جا سکتا ہے یعنی ایک جیسی صورت۔ مشروع کا قصہ تو یوں ہے کہ چونکہ مرد کے لئے ریشم کا لباس پہننا خلافِ شرع ہے اس لئے ملاوٹ کر کے ایسا ریشمی کپڑا تیار کیا گیا جو شرع کے مطابق ہو چنانچہ مشروع کہلایا۔ بڑے بڑے امراء اور رؤسا اسی کی اچکنیں پہنا کرتے تھے۔ ہم رو دوسری قسم کا کپڑا ہے جس کے پھول بوٹے بُناوٹ کے دوران اس طرح ڈالے جاتے ہیں کہ کپڑے کی دونوں طرف ایک سے بوٹے بنتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں رُخ ایک جیسے ہوتے ہیں اس لئے یہ کپڑا ہم رو کہلاتا ہے۔ اس کے ڈیزائن صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کی بُناوٹ اپنی مخصوص زبان میں لکھی جاتی ہے جسے یہی لوگ لکھ سکتے ہیں اور یہی پڑھ سکتے ہیں۔ اب تو خیر ان کی کھڈیوں میں کہیں بجلی کے موٹر لگ گئے ہیں اور کہیں ڈیزائن تانا بانا گن کر نہیں بلکہ پنچ کارڈ کے ذریعے ڈالے جاتے ہیں اور کہیں وہ مخصوص طرز کے ایرانی لالہ و سنبل ہٹا کر ان کی جگہ اجنتا کے کنول بننے لگے ہیں کیونکہ سیاح یوں ہی چاہتے ہیں۔

اورنگ آباد میں سیاحوں سے بڑی رونق ہے۔ ان کی خاطر شان دار ہوٹل بن گئے ہیں اور تاریخی مقامات کی سیاحت کے لئے جدید طرز کی آرام دہ بسیں چلتی ہیں جو گراں بھی نہیں۔

میرے میزبانوں نے مجھے اُس بس میں بٹھا دیا جو ایلورا کے غاروں تک لے جاتی ہے۔ خدا جانے وہ

کون تھا جس نے ان حیران کر دینے والی تعمیرات کو غاروں کا نام دیا۔ یہ غار نہیں ہیں۔ یہ سنگلاخ پہاڑوں کا کلیجہ نکال کر ان کے اندر تراشی ہوئی ایسی بڑی بڑی عبادت گاہیں ہیں کہ ان میں دنیا بھر کی عقیدت سما جائے پھر بھی کچھ جگہ خالی رہ جائے۔

اورنگ آباد سے صرف انیس میل دور ایلورہ میں ایک دور تک پھیلا ہوا پہاڑ کھڑا ہے جس کے نیچے اور سامنے بہت کشادہ ایک وادی ہے جو آنکھوں کو بھلی لگتی ہے اور روح میں ایک عجب تازگی سی بھرتی ہے۔

فصیل جیسے اس پہاڑ میں پہلے بودھوں نے اپنی خانقاہیں تراشیں' یہ پندرہ سولہ سو سال پرانی بات ہے۔ پھر براہمنوں نے اپنے مندر بنائے جن کے در و دیوار میں سو طرح کی مورتیاں تراشیں' بعض ایسی جنہیں دیکھ کر بچے اپنے بڑوں سے پوچھ رہے تھے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سنا ہے اورنگ زیب کے فوجی پکنک کے لئے یہاں آیا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر انہوں نے نہ کسی دیوی کو ہاتھ لگایا نہ کسی دیوتا کو توڑا پھوڑا ورنہ سنا ہے کہ فتح پور سیکری میں اکبر کے محل میں انہوں نے خوش نما پرندوں اور دیدہ زیب چرندوں کے مجسمے توڑ پھوڑ ڈالے تھے اور انسانی مجسموں کے چہرے بری طرح مسخ کر دیئے تھے۔

براہمنوں کے بعد جین آئے اور انہوں نے پہاڑوں کو ایسے تراشا جیسے یہ مکھن کے بنے ہوں۔ عقیدت دل و دماغ میں ہی نہیں' بازوؤں میں بھی کیسی شکتی بھر دیتی ہے۔

مگر پھر کیا ہوا۔ وہ لوگ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے۔ یہ جگہ انہوں نے کیوں چنی' پوری پوری عمریں لگا کر پہاڑوں کے اندر تک یہ مندر کیوں تراشے' ایک مندر تو سنا ہے پورے ایک سو سال میں مکمل ہوا تھا۔ پھر وہ لوگ گوتم کو یوں بیٹھا اور شیو اور پاروتی کو یوں شطرنج کھیلتا چھوڑ کر کدھر چلے گئے؟ کوئی نہیں جانتا۔

اورنگ آباد کی دوسری طرف اجنتا کی عبادت گاہیں اور خانقاہیں ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے بھی کوئی دو سو سال پہلے ان کی تعمیر شروع ہو گئی تھی اور ہندوستان سے بودھ مت کو دیس نکالا ملنے تک' یعنی تیرہ سو سال پہلے تک نہیں معلوم کتنے عقیدت مند کتنی کتنی عمریں بتا کر یہ عمارتیں پوری کر رہے تھے۔

ابھی وہ ستون کھڑے کر رہے تھے اور ان میں مورتیاں تراش رہے تھے کہ نہ جانے اُن پر کون سی بپتا ٹوٹ پڑی کہ سارے کام ادھورے چھوڑ کر اور اپنے اوزار تک ترک کر کے وہ ایسے گئے کہ آج تک ان کا سراغ نہیں ملتا۔

اجنتا کی یہ انتیس عبادت گاہیں اور خانقاہیں کسی عام پہاڑی میں نہیں تراش دی گئیں۔ اُن لوگوں نے تمام بستیوں اور آبادیوں سے دور' اندھیاری کی وادی میں ایک ایسی اونچی پہاڑی ڈھونڈی جو نئے چاند کی طرح خم کھائے ہوئے ہے اور اس کے چرنوں میں ایک چھوٹی سے ندی بہہ رہی ہے جس میں سات آبشاریں ہیں جیسے

ندی قدم قدم پر ٹھوکر کھا رہی ہو۔

جب بودھ راہب ان اندھیری کوٹھریوں میں آنکھیں موند کر بیٹھتے ہوں گے تو ندی کا دھیما دھیما سا شور ان کے دھیان میں تقدس کا رنگ گھول دیتا ہوگا اور پھر جب پہاڑیوں پر زور کا مینہ برستا ہوگا اور اوپر سے بہہ کر آنے والا پانی خانقاہوں کے دروازوں پر نقرئی پردوں کے طرح گرتا ہوگا تو وہ عبادت گزار اپنے وجود سے باہر آ کر اور آنکھ بچا کر باہر کی فضا میں دھندلی دھندلی لکیریں کھینچنے والی بوندوں کو بھی ایک نظر ضرور دیکھ لیتے ہوں گے۔

جسے فطرت کے حسن سے لگاؤ نہ ہو اس کی عبادتیں قبول نہیں ہوا کرتیں۔

اسی پر تو اورنگ آباد کے نام ور شاعر سکندر علی وجؔد نے کہا تھا:

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنے کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں، وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں
یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہر شانِ جمالی ہے

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں اجنتا اور ایلورہ کے عنوان سے دو شاہکار نظموں کے خالق سکندر علی وجؔد سے ملا۔ ایسے شفیق بزرگ اب زیارت کو بھی نصیب نہیں۔ انہوں نے اپنی نظمیں یوں آنکھیں موند کر سنائیں جیسے وہ اورنگ آباد میں نہیں، خود اجنتا اور ایلورہ میں موجود ہوں۔ میں ان سے پرانی کتابوں کا حال جاننے گیا تھا جن کے کبھی اس شہر میں بڑے بڑے ذخیرے تھے جو زمانے کے ہاتھوں مٹ گئے۔ وجد صاحب کا وہ فقرہ مجھے یاد رہے گا کہ جس گھر میں کتابیں اور بچے نہ ہوں وہاں جا کر دل نہیں لگتا۔

اجنتا میں فرش سے عرش تک بلند گوتم کے مجسمے عبادت کی کیفیت میں آنکھیں موندے بیٹھے ہیں۔ بیٹھنے کی ہر ادا جدا ہے اور ہر ادا کا نام بھی الگ الگ ہے۔ ایک اندھیرے غار میں ایک شخص نے بڑے سے آئینے کی مدد سے گوتم بُدھ کے چہرے پر دائیں جانب سے روشنی ڈالی تو ان کا چہرا اُداس نظر آیا۔ پھر وہی روشنی بائیں جانب سے ڈالی گئی تو وہی چہرہ بشاش دکھائی دیا۔

اجنتا کی دیواروں اور چھتوں پر مہاتما بدھ کی پوری زندگی تصویروں میں ڈھالی گئی ہے۔ وہاں ان کی زندگی کے سارے مرحلے، ان کی داستان کے تمام کردار، ان کے نروان کے کُل منظر صدیوں سے یوں ساکت ہیں کہ لگتا ہے جب آخری بُدّھا ہماری اس دنیا میں وارد ہوگا تو یہ سارے منظر حرکت کرنے لگیں گے، جیسے رُکی ہوئی فلم

اچانک دوبارہ چلنے لگے۔

اس کے بعد تو ہم نے یہ منظر دیکھا کہ ہمارے ساتھ ہی سیاحوں کا جوغول بس کے انتظار میں کھڑا تھا اس میں انگریز' امریکن' جرمن اور سب سے بڑھ کر جاپانی باشندے شامل تھے اور علاقے کے غریب گھرانوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے پیچھے پڑے تھے کہ وہ ان سے اجنتا کی مورتیاں اور مالائیں خرید لیں۔ لڑکے اصرار کر رہے تھے کہ بہت کم دام میں دے دیں گے اور اصل کمال اب دیکھا۔ غریب بچے انگریزوں سے انگریزی' جرمنوں سے جرمن' اور جاپانیوں سے رواں جاپانی زبانیں بول رہے تھے اور صرف صدا لگانے اور مال بیچنے والی زبان نہیں' باقاعدہ گفتگو اور مکالمے والی زبان۔

اب سمجھ میں آیا کہ ہمیں کوئی زبان سیکھنے میں دشواری کیوں ہوتی ہے۔ زبان استاد نہیں' مجبوری سکھاتی ہے۔

ہماری گاڑی اورنگ آباد سے زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ دولت آباد کے قلعے کی چوٹی پر بنی ہوئی عمارت نظر آنے لگی۔ دیوگری کی اس سرزمین پر جیسے جیسے ہمارے قدم اٹھتے گئے' تاریخ کے ورق ایک ایک کر کے الٹنے لگے۔ اِدھر ایک مندر' اُدھر پیرِ قدس کا مزار' سامنے وہ اتنا بڑا حوض کہ جس کا پانی مہینوں ختم نہ ہو مگر جواب سوکھا پڑا ہے۔ پھر وہ مسجد جو مبارک خلجی کے آنے سے پہلے مندر تھی۔ اور سیدھے ہاتھ پر سو فٹ اونچا چاند مینار' اور پھر قلعے کے مضبوط دروازے اور اُن میں ٹھونکی ہوئی میخیں تا کہ دشمن کے ہاتھی اپنے آقا کے حکم سے تنگ آ کر ان سے اپنے سر نہ ٹکرائیں۔ اور ذرا آگے وہ چینی محل جہاں گولکنڈہ کا آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ تیرہ سال تک سر جھکائے اپنی قید کے اور زندگی کے دن گنتا رہا' اور ذرا ہی آگے تانا شاہ کو قیدی بنانے والے اورنگ زیب کی بھاری بھرکم قلعہ شکن توپ جو اس طرح اوندھی پڑی ہے جیسے وقت نے چلتے چلتے اُسے زور کی لات مار دی ہو۔

ہم قلعے کی تاریک سرنگوں میں بھی گھسے۔ کہتے ہیں کہ جب دشمن کی فوجیں وہاں تک پہنچ جاتی تھیں تو سرنگوں میں دھواں بھر دیا جاتا تھا اور سپاہیوں کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اُس گھٹن سے بچنے کا راستہ صرف ایک کھڑکی ہے جس سے باہر چھلانگ لگانے والا دو سو فٹ نیچے کھائی میں گرتا تھا جہاں بھوکے مگرمچھ اس کے منتظر ہوا کرتے تھے۔

پھر ایک دن محمد شاہ تغلق کے جی میں سمائی کہ دارالحکومت دلّی کی پوری آبادی کو اٹھا کر دولت آباد لے جایا جائے۔ ہزاروں جوان' بوڑھے' بچے ڈھور ڈنگر سب کے سب چلے مگر ان کے لئے وقت کھائی بن گیا اور حالات نے بھوکے مگرمچھ کا روپ دھار لیا۔ یہ قلعہ' یہ پہاڑ جیسا قلعہ دلّی جیسے بڑے شہر کے بے شمار باشندوں کو نگل گیا۔ آج کوئی جا کر دیکھے' دولت آباد کی دیواروں پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔

پھر خاموشی ٹوٹی تو خلد آباد میں۔ سوچا تھا کہ شاید وہاں کسی نے جنت آباد کی ہوگی۔ گئے تو پتہ چلا کہ یہ تو زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے جہاں سے جست بھر کر بہت سے بزرگ خلد کو سدھارے ہوں گے۔ ایک شہر پناہ کے اندر اتنی بہت سی ہستیوں کو محوِ خواب دیکھا تو عقیدت سے نظریں جھک گئیں۔ شہر خاموش تھا اور مزار ساکت، درگاہوں میں سکون تھا اور قبروں کے کتبے چپ کھڑے تھے۔

وہیں قریب کوئی مکتب تھا جس میں سیکڑوں بچے مل کر قرآن پڑھ رہے تھے۔ اس سناٹے میں ان کی آواز اور بھی زیادہ بھلی لگی۔

بڑا سا دالان، قدیم اینٹوں کا فرش، چاروں طرف محرابی دروازے اور بیچ میں ایک چھوٹی سے چوکور عمارت جس کا دروازہ اتنا نیچا نہ ہوتا تب بھی داخل ہونے والے کا سر ادب سے جھک جائے۔ یہ حضرت خواجہ شاہ منتخب الدین زر بخش کی آخری آرام گاہ تھی۔ یہ کیسے بزرگ تھے جو حضرت خواجہ نظام الدین کا حکم سنتے ہی دلّی سے نکل کھڑے ہوئے اور راستے کی صعوبتیں اٹھاتے ہوئے اپنے سات سو عقیدت مندوں کے ہمراہ نربدا جیسے بڑے دریا کو عبور کر کے یہاں تشریف لائے تھے۔

خلد آباد کے بیچوں بیچ گزرنے والی سڑک پر چلتے ہوئے ہم شہر میں داخل ہوئے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی پرانی مسجدیں اور ٹوٹے پھوٹے مزار نظر آتے تھے۔ وہی پرانے زمانے کی اینٹوں سے بنی عمارتیں، اور اینٹیں بھی وہ جو اب خاک بن کر اڑا ہی چاہتی ہیں۔

بالآخر وہ مقام آ گیا جو انسان کو آزمائش میں ڈال دے تو حیرت نہ ہو۔ سیدھے ہاتھ پر حضرت سید برہان الدین کی درگاہ اور بائیں ہاتھ پر سید زین الدین کا مزار جو بائیسویں خواجہ ہیں۔ کوئی جائے تو پہلے کدھر جائے۔ حضرت زر بخش کی جگہ ہدایت کی شمعیں روشن رکھنے کا فریضہ برہان الدین نے سنبھالا تھا، ہم اسی طرف چلے۔ اب جو درگاہ میں داخل ہوئے تو سامنے میدان جیسا صحن، چہار جانب عمارتیں جن میں درسِ قرآن کا بہت بڑا مکتب، اور صدیوں پرانا نقار خانہ جس کے آہنی نقارے اب گرے پڑے تھے۔ میں سمجھا کہ یہ بڑے بڑے دیگ ہیں جن میں یہاں آنے والے ہزاروں زائرین کے لئے کھانا پکتا ہوگا۔ اس وقت بھی سیکڑوں مرد، عورتیں اور بچے ان عمارتوں میں قیام کئے ہوئے تھے۔ ہم دالان میں داخل ہوئے تو ہمارے راہنما اور راہبر فرید الدین سلیم صاحب نے بتایا کہ حیدرآباد کے پہلے نظام- نظام الملک آصف جاہ اور ان کے بیٹے کے درمیان جنگ چھڑی تھی تو پھر ان کی صلح یہیں اسی دالان میں اسی مزار کے سامنے ہوئی تھی۔

اب وہ دونوں وہیں پیوندِ خاک ہیں۔ نہ ہاتھ ملا سکتے ہیں اور نہ گلے مل سکتے ہیں۔

آصف جاہ کے قریب ان کے بیٹے کی قبر تھی جو کہیں دور جنگ کرتے ہوئے کئی زخم کھا کر گرا تھا۔ وصیت

کے مطابق اس کی میت یہاں خلد آباد لائی گئی اور کہنے والے کہتے ہیں کہ اُس وقت تک زخموں سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔

اب ہم آگے چلے۔ سیکڑوں سیڑھیاں چڑھ کر' بہت بڑے درسے گزر کر' نقار خانے سے ہوتے ہوئے ہم ایک اور صحن میں داخل ہوئے۔ سامنے بائیسویں خواجہ حضرت زین الدین کی آرام گاہ تھی۔ ان کی دہلیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فریدالدین سلیم صاحب نے کہا کہ دیکھئے' اس دہلیز پر کون دفن ہے؟

ہم نے دیکھا' سنگِ مرمر کی جالیاں کھڑی تھیں' ان میں داخلے کا چھوٹا سا راستہ تھا' اندر سفید پتھر کا سادہ سا فرش تھا۔ درمیان میں ایک کچّی قبر تھی جس پر دوپہر کی تپتی دھوپ پڑ رہی تھے اور جس پر ایک چھوٹا سا پودا اُگا تھا۔ اتنی معمولی سی قبر میں بھلا کون دفن ہے؟

ہم نے یہ سوال پوچھا نہ تھا' صرف سوچا تھا۔ جواب میں سلیم صاحب نے قبر کے کتبے کی عبارت پڑھ کر سنائی:

''ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب''۔ جس نے دس بیس نہیں' پچاس سال پورے ہندوستان پر حکمرانی کی اور جس نے مرتے وقت کہا تھا کہ میں دنیا سے کیسا بے یار و مددگار جا رہا ہوں۔ اور جس نے کہا تھا کہ میں نے ٹوپیاں سی کر جو چار روپے دو آنے بچائے ہیں انہیں میرے کفن پر خرچ کرنا اور قرآن کی کتابت کر کے جو تین سو پانچ روپے کمائے ہیں' خبردار میری ذات پر خرچ نہ ہوں بلکہ میری موت کے دن غریبوں میں تقسیم کر دینا۔

اس کی ساری وصیتیں پوری کی گئیں۔ قبر بھی یوں چھوڑ دی گئی کہ اُس پر دھوپ بھی پڑے اور مینہ بھی برسے۔ بعد میں نظام دکن سے نہ رہا گیا اور انہوں نے اطراف میں سنگِ مرمر کا کٹہرا کھڑا کرا دیا اور پختہ فرش بنوا دیا۔

اس کے بالکل قریب اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا اعظم شاہ دفن ہے۔ جس کے قریب اس کی بیوی اور حضرت خواجہ زین الدین کی صاحب زادی کی قبریں ہیں۔ وہیں قطار در قطار بندھی ہوئی ہرے کانچ کی چوڑیاں آویزاں تھیں جن سے صاف عیاں تھا کہ عورتیں آج بھی خدا جانے کیسی کیسی تمنائیں لئے یہاں آتی ہیں۔

وہاں سے نکل کر ہم اپنی کار میں بیٹھے۔ تھوڑے سے وقت میں بہت سی یادگاریں دیکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا' چنانچہ اب ہم نے حبشہ کے غلام ملک عنبر کا مقبرہ دیکھا جو غلامی سے ترقی کرتا ہوا احمد نگر کے آخری نظام شاہی بادشاہ کا وزیر بنا اور جس نے اورنگ آباد جیسے عظیم الشان شہر کی بنیادوں میں ہاتھ بٹایا۔ ہمارے سامنے اس وقت ویسا ہی عظیم الشان اس کا مقبرہ تھا۔

پھر ہم حضرت حسن سجزی کی درگاہ سے ہوتے ہوئے فارسی اور عربی کے نامی گرامی شاعر غلام علی آزاد

بلگرامی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بڑھتے گئے۔ کہیں لوگ مرادیں لے کر آئے تھے، کہیں منّتیں مان رہے تھے، کہیں منّتیں بڑھا رہے تھے۔ ایک مقبرے کی دہلیز کو دیکھا۔ جن بچّوں کی زبان میں کوئی خرابی ہو انہیں اس دہلیز پر چھڑک کر شکر چٹائی جاتی ہے۔ نا معلوم کتنی صدیوں سے بچے اس دہلیز کو چاٹ رہے تھے۔ وہ بالکل صاف ہو چکی تھی اور صرف کچھ چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔

پتہ نہیں چیونٹیوں کے منہ میں زبان ہوتی ہے یا نہیں۔

سنا ہے خلد آباد میں کوئی گھر ایسا نہیں جس میں ایک حافظِ قرآن نہ ہو۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس نے قرآن نہ پڑھا ہو۔ ہم اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی زمیں دوز مسجد میں گئے جہاں برستی آگ میں بھی لوگ ٹھنڈے فرش پر طویل سجدے کرتے ہیں۔ وہیں قریب ایک مکتب تھا جہاں سیکڑوں بچے قرآن پڑھ رہے تھے۔ بھولی بھالی صورت والے بچوں کو جھوم جھوم کر قاعدے اور سیپارے پڑھتے دیکھا تو ان پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ ہم چلنے لگے تو ایک چھوٹے سے بچے نے ہمیں ایک دعا سنائی۔ مکتب کے دوسرے بچوں کی طرح اس کی آواز میں بھی بلا کی مٹھاس تھی۔ ہم سنتے رہے اور سوچتے رہے کہ اس شہر کے شاید سارے ہی بچے اُس دہلیز پر شکر چاٹتے ہوں گے۔

۲۱ر مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

تیس سال بعد کسی کو ڈھونڈنے نکلو تو یہ فکر نہیں ہوتی کہ ملے گا یا نہیں، بلکہ یہ دعا ہوتی ہے کہ زندہ سلامت ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ اورنگ آباد میں میرے میزبان محمد یوسف عثمانی اور ان کی اہلیہ رعنا حیدری زندہ و پائندہ بلکہ تابندہ ہیں کہ قدرت نے انہیں کئی پوتے پوتیوں اور نواسوں نواسیوں سے نوازا ہے۔ رعنا حیدری پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر ہو گئیں، دونوں بیٹیاں جو میری گود میں اور پیٹھ پر چڑھی رہتی تھیں، وہ میڈیسن پڑھ کر معالج ہو گئی ہیں اور بیٹا جو میرے کندھوں پر سوار ہوتا تھا اور جسے میں بندر کہا کرتا تھا، ایم بی اے کر کے جائیداد کی خرید و فروخت کا کاروبار کامیابی سے چلا رہا ہے اور اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ اس کا پانچ سال کا بیٹا اس سے بھی زیادہ اچھل کود کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جے سنگھ پورا میں ان کا سادہ سا مکان اب کشادہ اور آرام دہ گھر میں تبدیل ہو گیا ہے اور ابا اماں دونوں عمرے پر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

شہر کا واحد اردو روزنامہ 'اورنگ آباد ٹائمز' نہ صرف جاری وساری ہے بلکہ اس کے بانی ایڈیٹر عزیز خسرو کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شعیب خسرو اخبار کو اسی خوبی سے چلا رہے ہیں۔ حمایت علی شاعر کے بھائی مجاہد علی' جنہیں شہر والے مجاہد علی شاعر کہا کرتے تھے' اردو ادب کے سرکردہ نقاد اور اہل قلم نکلے ہیں۔ ہمارے دور کے بڑے شاعر سکندر علی وجد' جن سے ملنے کا شرف مجھے حاصل ہے' چل بسے۔ اسی طرح میرے راہنما اور راہبر فرید الدین سلیم صاحب بھی رحلت فرما گئے۔ قدیم کاریگر وہ کپڑا اب بھی بن رہے ہیں جو شرع کے مطابق ہے اور مشروع کہلاتا ہے اور جو دونوں طرف یکساں ہے ہم رو کہلاتا ہے۔ ان کاریگروں کی ایک شاخ پاکستان چلی گئی ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ مشروع اور ہم رو پاکستان میں بھی دستیاب ہے۔

کچھ عرصہ ہوا حیدرآباد سے ایک صاحب اورنگ آباد پہنچے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اورنگ زیب کی اولاد ہیں اور مغل بادشاہوں کے جانشین ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ خلد آباد میں اورنگ زیب کی قبر کے متولی بھی ہیں چنانچہ اورنگ زیب عالم گیر کا عرس انہوں نے دھوم دھام سے کرایا۔ پرانے مقبروں اور ان سے ملحقہ زمینوں پر ملکیت کے دعوے دار انہیں گھیرے بیٹھے رہے۔ سننے میں آیا کہ تاج محل کی آمدنی میں بھی وہ حصے دار ہیں۔ مگر ان دعووں کی تصدیق کرنے والا کوئی نہ ملا۔

غرض یہ کہ لوگ آرہے ہیں' جا رہے ہیں' وقت کبھی تھمتا نہیں اور کام کہیں رکتے نہیں۔ یہ سلسلہ نامعلوم کب سے جاری ہے اور خدا جانے کب تک چلے گا۔

جے پور ایک دھنک ہے

لوگوں کی طرح شہر بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں لیکن جے پور کا قصہ مختلف ہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے' جے پور پر نکھار آتا جا رہا ہے۔ جس شہر کی سڑکوں پر آوارہ کتوں کے بجائے خوب صورت مور گھومتے پھرتے ہوں' خود ہی سوچیے وہ کیسا شہر ہوگا۔

میں جے پور کے ہوائی اڈے پر اپنے طیارے سے باہر نکلا تو خیال تھا کہ ہر طرف ریت ہوگی' ہوا میں گرد ہوگی اور غضب کی گرمی پڑتی ہوگی' لیکن نکل کر دیکھا تو پتہ چلا کہ رات بھر برسنے کے بعد پانی ابھی ابھی رکا ہے اور کھلے میدان میں ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔

اور جوں ہی ہماری کار شہر میں داخل ہوئی' یوں لگا کہ جیسے کار کسی میلے میں پہنچ گئی ہو۔ جے پور کا شہر ہر روز کا میلہ ہے جس میں رنگوں' آوازوں' خوشبوؤں اور سازوں کا ایک ریلا چلا آتا ہے۔ سودے والوں کی صدا' خریداروں کا شور' دکان داروں کی آوازیں' قلیوں اور مزدوروں کی پکار' سائیکلوں کی گھنٹیاں' موٹر گاڑیوں کے ہارن' مجسمہ ساز کاریگروں اور سناروں کی ٹھک ٹھک' رنگریزوں کی اونچی آوازیں' مندروں میں بھجن' مسجدوں میں اذانیں' لاؤڈ اسپیکروں پر اعلان' اور ٹولیاں بنا کر بھیک مانگنے والے کوڑھیوں کی بے سُری صدائیں۔ اُن سب کو سن کر خیال آتا ہے کہ جے پور شاید ہی کبھی خاموش ہوتا ہو۔ اور کبھی ذرا دیر کو چپ ہوتا ہے تو شہر کے باغوں اور پارکوں سے موروں کی آوازیں آتی ہیں۔

ہم نے کبھی فلموں میں جے پور کے بازار اور سڑکیں دیکھیں تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ ہر مرد رنگین پگڑیاں باندھے اور ہر عورت ہری' گلابی' نارنجی' سرخ اور عنابی اوڑھنیاں اوڑھے گھوم رہی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ فلم والے انہیں یہ رنگا رنگ لباس پہناتے ہوں گے۔ وہاں جا کر دیکھا تو احساس ہوا کہ جے پور میں بے رنگے' میلے یا سفید لباس پہننا بد ذوقی کی علامت ہے۔ جب تک پورا شہر دھنک نہ بن جائے' شہر والوں کو قرار نہیں آتا۔

جے پور کے گرداراولی کی پہاڑیاں فصیل بن کر کھڑی ہیں۔ پھر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پتھروں کی فصیلیں کھڑی ہیں اور خود شہر کے گرد اونچی فصیل کھینچی گئی ہے جس میں جا بجا بڑے بڑے دروازے کھلتے ہیں جن کے اندر بالکل سیدھی چوڑی چوڑی سڑکیں چلی گئی ہیں۔ ان سڑکوں کو آپس میں بالکل سیدھی گلیاں ملاتی ہیں۔ کہیں کوئی پھیر نہیں، کہیں بھٹکنے کا امکان نہیں۔ سیدھی لکیر جیسی سڑکیں، پختہ نالیاں، ڈھلے ہوئے لوہے کے خوب صورت کھمبے جن پر کبھی گیس کی روشنی ہوتی تھی۔ اور پھر دونوں طرف ایسی برابر کی عمارتیں کہ کیا مجال ایک عمارت دوسری سے اونچی ہو یا کم دیدہ زیب ہو۔ سڑک پر کھلتی ہوئی محرابی کھڑکیاں اور دروازے، دیواروں پر نقش ونگار، چوکھٹوں میں رنگین شیشے، کہیں تراشے ہوئے بُرج، کہیں گنبد، جا بجا مینار اور آرائشی ستون۔ گھنٹوں چلتے رہیے، گھنٹوں ایسی عمارتیں آتی جائیں گی اور پیچھے چھوٹتی جائیں گی۔

میں نے کسی سے ہنس کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس شہر کی تعمیر میں بھی میسور کے سر مرزا محمد اسماعیل کا ہاتھ لگا ہے۔ وہ بولا کہ پھر آپ کیا سمجھتے ہیں؟ شہر کے درمیان سب سے بڑی شاہراہ کا نام مرزا اسماعیل روڈ یونہی تو نہیں۔

جے پور کی ان تمام عمارتوں میں ایک خوبی مشترک ہے۔ ان میں ایسی جالیاں ضرور ہیں جن سے جھانک کر گھر کی عورتیں نیچے سڑک پر بسنت پنچمی اور گھن گھور کے جلوس، تیج کے میلے اور ہولی کے اُڑتے گلال دیکھ سکیں۔

آپ نے جے پور کے ہوا محل کا نام سنا ہوگا اور شاید اس کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی سڑک پر کئی منزلہ عمارت ہے جس میں سیکڑوں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں سڑک پر کھلتی ہیں۔ مگر یہ بات وہاں خود جا کر پتہ چلی کہ ان منزلوں اور کھڑکیوں کے پیچھے کوئی عمارت نہیں۔ بس جالیوں اور کھڑکیوں سے سجی دھجی ایک اونچی دیوار ہے، جس کی آڑ سے اونچے گھرانوں کی خواتین جلسے جلوس دیکھا کرتی تھیں۔

تو پھر اوپر تک اتنی فرضی کھڑکیاں کیوں کھولی گئی ہیں؟ میں نے کسی سے پوچھا۔

جواب ملا: تا کہ ہوا کو گزرنے میں آسانی ہو۔ اُس کا خیال بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

اصل قصہ یوں ہے کہ ہوا محل مہاراجا سوائی پرتاپ سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں بنوایا تھا۔ یہ درحقیقت کرشن چندر جی کے تاج یا مُکٹ کی شبیہ ہے۔ بظاہر پانچ منزلہ عمارت میں ۹۵۳ جھروکے ہیں جن کی پشت پر کوئی عمارت نہیں لیکن جن میں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے کے سارے انتظامات ہیں کیونکہ اُس وقت عورتوں کو سخت پردے کا حکم تھا۔

لیکن وہ زمانہ گزر گیا۔ اب کسی جھروکے میں گھنی پلکوں والی کوئی سیاہ اور کجرائی آنکھ نظر نہیں آئی۔ وہ خاتون اب جینز پہن کر نیچے سڑک پر اتر آئی ہے اور میلے ٹھیلے میں شامل ہوگئی ہے۔

کہتے ہیں کہ راجپوتانے کی خواتین کو اُڑتی چڑیا بھی نہیں دیکھ پاتی تھی۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایک روز ڈولیوں سے اتر کر شاہی خاندان کی عورتیں اور کنیزیں محل میں داخل ہو رہی تھیں کہ اچانک پردے میں سے ایک لڑکی کا ہاتھ نظر آیا۔ اُس پر نگہبان نے اس زور سے ہنٹر مارا کہ ہاتھ لہولہان ہو گیا۔

راجا کو علم ہوا تو اس نے نگہبان کو بلا کر پوچھا کہ تمہیں شہزادی کے ہاتھ پر ہنٹر مارنے کی جرات کیسے ہوئی؟ یہ سن کر نگہبان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اُس نے کہا کہ میں نے اُسے کنیز سمجھ کر ہنٹر مارا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ شہزادی ہے تو اُس کی گردن مار دیتا۔

اُن ہی میں سے ایک شہزادی ڈولے میں بیٹھ کر اکبر بادشاہ کے محلوں میں گئی تھی جہاں بادشاہ نے اُسے مریم زمانی کا نام اور قدرت نے اُسے ولی عہد شاہزادہ سلیم کی ماں ہونے کا شرف عطا کیا۔ اُسی گھرانے کے راجا مان سنگھ نے اکبر کے نورتنوں میں جگہ پائی تھی اور وہیں کے راجا جے سنگھ اورنگ زیب کے دربار میں مرزا راجا کہلائے تھے۔

اُن کا آمیر کا قلعہ آج بھی دلّی سے آنے والی اور اجمیر کو جانے والی سڑک کو خاموشی سے تکے جا رہا ہے۔ اس نے کتنی ہی حملہ آور فوجوں کے اسی راستے سے آتے اور نا معلوم کتنی شکست خوردہ فوجوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ ان ہی راستوں پر خدا جانے کتنی گردنیں کٹیں اور کس قدر خون بہا۔ اب محکمہ سیاحت نے اُسے پھولوں کی وادی قرار دے کر سڑک کی دونوں طرف سرخ پھول اُگا دیے ہیں۔

پرانے مندروں، قدیم مقبروں اور درگاہوں کے درمیان سے گزر کر ہم اُس پہاڑی سڑک پر پہنچے جس پر چلتے ہوئے ہاتھی اوپر قلعے تک جاتے ہیں۔ قلعے کے پہلے دالان میں داخل ہوئے تو ہر طرف پرانے اصطبل اور محافظوں کے کمرے نظر آئے۔ ایک کونے میں کالی کا مندر تھا۔ ہمیں پرانی کتابوں کی وہ تصویریں یاد آ گئیں جن میں اس مندر کے سامنے کھڑے بکروں کی گردنیں تلوار کے ایک ہی وار سے بھٹے کی طرح اڑاتے ہوئے دکھایا جاتا تھا اور اس طرح کالی دیوی کو بلیدان دیا جاتا تھا۔ وہیں وہ سیاہ اور تاریک کوٹھری تھی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ اس میں انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ کالی کا مجسمہ دیکھنے کا ہمیں بہت اشتیاق تھا۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس دیوی کو ماننے والے قاتل ٹھگ راہ گیروں کا گلا گھوٹ کر انہیں لوٹا کرتے تھے وہ کیسی ہو گی۔ سنا ہے یہ مجسمہ نہیں معلوم کب سے خلیج بنگال کی تہہ میں پڑا تھا۔ جب راجا مان سنگھ گورنر ہو کر بنگال گئے تو مجسمے نے ان کے خوابوں میں آنا شروع کیا۔ آخر جب خواب میں نظر آنے والے مقام پر غوطہ خور اتارے گئے تو مجسمہ گویا ان کا منتظر تھا۔ اُس وقت سے کمر اور گردن میں سانپ لپیٹے یہ سیاہ مجسمہ آمیر کے قلعے میں کھڑا ہے اور ہر روز سیکڑوں ہزاروں لوگ اس کے درشن کو یوں آ رہے ہیں جیسے مجسمہ ابھی کل ہی لا کر لگایا گیا ہو۔

مندر میں داخلے سے پہلے ہمارے چمڑے کے جوتے اتروالئے گئے' چمڑے کی پیٹی کھلوالی گئی' چمڑے کا تھیلا لے لیا گیا' تب کہیں جا کر ہمیں قلعے میں داخلہ ملا۔ وہاں نقارہ بج رہا تھا۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا' اُس پر بڑا سا چمڑا منڈھا ہوا تھا۔

بس اس کے سوا سارا قلعہ ویران پڑا ہے۔ راجا اور رانیاں ایک روز اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ شان دار کھنڈر کہیں نہیں۔

نومبر ۱۷۲۷ء کی بات ہے' سوائی جے سنگھ نے آمیر کی تنگ گھاٹی سے نکل کر نیچے کشادہ میدانوں میں نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا' اور اس طرح جے پور کی بنیاد پڑی۔ راجا جے سنگھ فلسفی تھے' مفکر تھے' فوجی لیڈر تھے اور ستاروں کی چال پہچانتے تھے۔ شاید نئے شہر کی بنیاد رکھنے کے لئے انہوں نے ایسی شبھ گھڑی چنی کہ جے پور پر کبھی زوال نہیں آیا۔

ہم نے آمیر کا مغل طرز کا دل آرام باغ دیکھا' نہایت دل کش ماوتا جھیل کا نظارہ کیا' عظیم الشان دیوان عام میں گئے' اور وہ شاندار دیوانِ خاص دیکھا جو شیش محل بھی کہلاتا ہے جو اگرچہ قلعہ لاہور کے شیش محل جیسا نہیں مگر اس میں بھی نہ جانے کتنی کنیزیں ناچی ہوں گی اور کتنے شہزادوں نے بے شمار آئینوں میں ان کے عکس دیکھے ہوں گے۔

پھر ہم نے قلعے کے نیچے اکبر کی مسجد دیکھی جو چار سو سال سے وہاں کھڑی اُس دن کی گواہی دے رہی ہے جب اکبر اسی راستے سے گزر کر اجمیر گئے تھے اور اپنا دامن مرادوں سے بھر کر لائے تھے تو اسی آمیر کی شہزادی نے ہندوستان کے تخت کو جہانگیر جیسا بادشاہ عطا کیا تھا۔

آمیر کا قلعہ تو خیر ویران ہو کر بھی آباد ہے لیکن اس کے پچھواڑے وہ قلعہ ہے جس کے سینے میں تاریخ کے دفینے تھے۔ پھر وہ سینہ داغ دار ہوا اور وہ دفینہ خدا جانے کیا ہوا۔ پہاڑ کی چوٹی پر نہار گڑھ اب اپنے اکلوتے مینار سمیت ایک عجب منظر دکھاتا ہے۔ لگتا ہے اس کے آنگن کھود کر ہزاروں ٹن پتھر اور مٹی نیچے پھینکی گئی ہے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ دن رات بہت روز تک کھدائی ہوتی رہی۔ نیچے سے یہ منظر دیکھنے والے لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے۔ مجھے خود لوگوں نے بتایا کہ آخر ایک رات کچھ فوجی ٹرک سخت پہرے میں لدے پھندے اترے اور چلے گئے۔ ان میں کون سی شے لدی ہوئی تھی' کسی کو پتہ نہیں۔

کہتے ہیں کہ نہار گڑھ کے خفیہ تہہ خانوں میں ہیرے جواہرات کا وہ خزانہ چھپا ہوا تھا جس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی اور جسے چند خاندانی محافظوں کے سوا کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ یہ خزانہ افغانستان سے لوٹ کر لایا گیا تھا اور آمیر کے قلعے میں ایک بہت پرانا قبیلہ اس کی نگہبانی کیا کرتا تھا۔ اس قبیلے والے اگرچہ رہزن اور قزاق

تھے مگر خزانے کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز جانتے تھے۔

آمیر کے راجا کو اس کی زندگی میں صرف ایک بار خزانے میں لے جایا جاتا تھا' وہ بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر تا کہ وہ خزانے کا راستہ نہ دیکھ پائے۔ پھر اُسے اپنے لئے خزانے کی کوئی ایک چیز چن لینے کی اجازت ہوتی تھی۔ لہٰذا کوئی راجا اپنے لئے موتیوں کا ہار لایا' کوئی جواہرات سے بنا ہوا پرندلایا اور وہ نوادر ایسے ہیں کہ اُن جیسے ساری دنیا میں کہیں اور نہیں۔

یہ ساری داستانیں سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی اور ریاستوں کے خاتمے کے بعد نہار گڑھ کے خزانے کی صداقت آزمائی گئی' یہ بات تو سب پر عیاں تھی۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ قلعے کے اندر سے ہزار ہا ٹن پتھر کھود کر باہر پھینکے گئے جو آج تک بکھرے پڑے ہیں۔ مگر قلعے کی گہرائی سے کیا نکلا؟ یہ بس تھوڑے سے لوگوں کو معلوم ہوگا۔

مگر دولت اور جواہرات کے خزینوں سے جے پور کے غریبوں کو کیا ملا۔ وہ تو اُسی طرح اودے نیلے پیلے اور ہرے پگڑ باندھے' مال کی گٹھری کاندھوں پر لادے بازاروں میں جوتیاں چٹخارتے نظر آتے ہیں۔ اور نارنجی' چمپئی اور گلابی اوڑھنیاں اوڑھے ہر عمر کی راجستھانی خواتین ایک ذرا سا گھونگٹ کاڑھے آتی جاتی دکھائی دیتی ہیں۔ خزانے کو تو جہاں جانا تھا' گیا' مگر وہ گھنی پلکوں والی کالی کالی کجرائی آنکھیں کہیں نہیں گئیں۔ وہ آج بھی اُسی طرح روز بدلتے منظر دیکھ رہی ہیں۔

۲۵/مارچ ۱۹۸۲ء

تیس سال بعد

مگر جے پور ایک سراب بھی ہے۔ مجھے بعد میں وہاں دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ ایک جے پور اور بھی ہے۔ ایک تو وہ ہے جو سیاحوں کی جنت ہے اور دوسرا جو کہیں چھپا ہوا تھا اور بعد میں نظر آیا وہ وہی ہندوستان کے دوسرے شہروں جیسا علاقہ بھی ہے جہاں مقامی لوگوں کے سوا کوئی نہیں جاتا اور جہاں وہی ہجوم ہے' سودے والے ہیں' کوڑے کباڑ کے ڈھیر ہیں' غلاظت ہے' سڑکوں پر ہزار طرح کی گاڑیاں ہیں' ٹریفک پھنسا ہوا ہے' غریبوں کے بچوں کو کوئی کام دھام نہیں۔

ہاں' جے پور کا شاہی علاقہ اور سنور گیا ہے۔ بے شمار ہوٹل کھل گئے ہیں' ہر طرف ٹیکسیاں دوڑ رہی ہیں'

ترقیاتی کام ہورہے ہیں اور سیاحوں کی ریل پیل ہے۔ سیاحت کا جتنا بڑا دفتر جے پور میں ہے کہیں اور نہیں ہوگا۔ اس کا نظام پورے راجستھان میں پھیلا ہوا ہے کیونکہ سیاح ریاست کے دوسرے علاقوں میں بھی جاتے ہیں۔ اوپر سے اجمیر بھی راجستھان کا حصہ ہے اور وہاں آنے والوں کو شمار کرنا مشکل ہے مگر اس کا قصہ سیاحت سے جدا اور مختلف ہے۔

اجمیر کا کلرک

لندن سے اجمیر جانے والا میں کوئی پہلا مسافر نہ تھا۔ مجھ سے پورے تین سو پینسٹھ سال پہلے سر ٹامس رو بھی اجمیر پہنچے تھے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے ایک شہنشاہ سے ملنے گئے تھے اور میں راجستھان کے ایک کلرک سے۔ اُس کی تفصیل ذرا دیر بعد' پہلے تذکرہ سیستان کے اُس بزرگ کا جو مجھ سے آٹھ سو سال پہلے عراق' شام' ایران اور افغانستان سے چلتا ہوا اجمیر پہنچا تھا اور کیسی تاثیر ہے اس کے فیض کی کہ آج ایک عالم کشاں کشاں اس کی دہلیز پر حاضری دینے پہنچ رہا ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی نے اپنا پڑاؤ اجمیر میں ڈالا اور آج کا منظر نامہ یہ ہے کہ سیکڑوں حاجت مند ان کی درگاہ پر پڑاؤ ڈالے ہیں اور ہر شخص کا کہنا ہے کہ ان کی حاجت روا ہو جاتی ہے' ان کا مرادوں کا دامن بھر جاتا ہے۔

مگر میں نے اُس روز اُن لوگوں کے غول دیکھے جن کی جیبیں بھر جاتی ہیں لیکن دولت سے ان کا جی سیر نہیں ہوتا۔ جو کوئی بھی اجمیر شریف جائے' یہ طے کر کے جائے کہ وہاں جو لوگ خود کو خادم یا صیغہ جمع میں خود کو خدّام کہلواتے ہیں انہیں زائرین سے رقم لینے کے سوڈھنگ آتے ہیں۔ یہ لوگ اجمیر کے ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈّے پر گھومتے رہتے ہیں اور گاڑی سے اترنے والے جس زائر کے شانے پر جو خادم پہلے ہاتھ رکھ دے بس پھر وہ غریب زائر اسی کی ملکیت ہو جاتا ہے اور ایک لمحے کو بھی اس کا ساتھ اور اپنی کمائی کی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ یہ بھی سنا ہے کہ کوئی خادم اس روز آمدنی سے محروم رہ گیا ہو تو پہلا خادم ترس کھا کر اپنا زائر اس کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔

میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ میں داخل ہوا' گلابوں سے بھری ایک ٹوکری خریدی' ننگے سر حاضری میں بے ادبی کا گماں ہوا تو اُسی پھول والے سے اس کی ٹوکری عاریتاً مانگی جو اُس نے جھٹ دے دی۔

بیگمی دالان سے گزر کر میں سنگِ مرمر سے بنے اس مقبرے میں داخل ہوا جس میں قبر کا تعویذ نصب ہے۔ اصل قبر تو نیچے کہیں تہہ خانے میں ہے۔

اس تعویذ کے اوپر تازہ گلاب کا اتنا اونچا انبار تھا کہ قبر بمشکل نظر آتی تھی۔ اور اس کے اطراف زائرین کا ایسا انبوہ تھا کہ ایک جگہ قدم جما کر فاتحہ پڑھنا دشوار تھا۔ مگر غور کیا تو دیکھا کہ اُن میں زائرین کم اور خدّام زیادہ تھے۔ کوئی قبر پر پھول پھینکنے میں ہاتھ بٹاتا تھا اور بخشش کی توقع کرتا تھا۔ کوئی قبر پر پہلے سے پڑے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیوں کا تبرک دیتا تھا اور صلے کی امید کرتا تھا۔ کوئی منّت ماننے والوں کے سروں پر مزار کی چادر کے ایک کونے کا سایہ کرتا تھا اور خود انعام واکرام کی منّت مانتا تھا۔ کوئی مراد مانگنے والوں کو چاندی کے کٹہرے سے باندھتا تھا اور خود اپنی مراد کا دامن پھیلاتا تھا۔ کوئی مقبرے کے نوادر کی تفصیل بتانے پر آمادہ تھا اور ساتھ ہی خود کو اجرت کا حق دار ٹھہراتا تھا۔

لیکن ایک منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ قبر پر چڑھاوے کی رقم ڈالنے کی غرض سے قبر کی پائنتی کی جانب ایک بڑا سا سوراخ بنایا گیا ہے۔ یہ بات کوئی کہتا تو نہیں لیکن سادہ لوحوں کے لئے وہ سوراخ کچھ ایسا منظر دکھاتا ہے گویا چڑھاوے کی رقم، خدا معاف کرے، سیدھی قبر کے اندر اور خواجہ صاحب کے قدموں پر گر رہی ہو۔ اور یہی نہیں۔ اُن ہی میں سے ایک خادم صاحب سوراخ کے قریب بیٹھ کے دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے کتنی رقم ڈالی ہے اور ساتھ ہی طعنہ دیتے جاتے ہیں کہ بس؟

میں نے ان سے کہا کہ معاملہ میرے اور غریب نواز کے درمیان ہے۔ آپ کون ہوتے ہیں میرے نوٹ شمار کرنے والے۔ لیکن وہ میری یہ بات سمجھنے کے اہل ہوتے، خادم نہ ہوتے۔ حاکم ہوتے۔

میں نے اس پر احتجاج کیا تو میرے ساتھیوں نے کہا کہ یہ تو سختیاں ہونے کے بعد آپ کے ساتھ رعایت ہے ورنہ ایک دور ایسا بھی تھا جب کچھ لوگ اندر تہہ خانے میں چھپ کر بیٹھتے تھے اور چڑھاوے کی رقم ڈالنے کے لئے سوراخ میں ہاتھ داخل کرنے والوں کی انگوٹھیاں اور کلائیوں سے گھڑیاں اور کڑے نوچ لیا کرتے تھے۔

میں لپک کر باہر آ گیا۔ پھول والے کی ٹوپی واپس کی اور اسے بھی کچھ رقم دی۔ پھر ہم دیر تک درگاہ کے احاطے میں گھومتے رہے۔ عالی شان نظام گیٹ دیکھا جو نظام دکن نے بنوایا تھا اور وہیں اکبر بادشاہ کے پیش کئے ہوئے وہ نقارے دیکھے جو اس نے بنگال کے سلطان داؤد خاں کی فوجوں سے چھینے تھے۔ شاہ جہانی دروازہ دیکھا جو شاہ جہاں نے اور بیگمی دالان دیکھا جو اُس کی بیٹی جہاں آرا نے بنوایا تھا۔ پھر اُسی بادشاہ کی ایک اور بیٹی حور النساء کی قبر دیکھی جس پر ایک بڑا سا قیمتی پکھراج جڑا ہے اور جس کی حفاظت کے لئے قبر کے گرد جنگلا لگا دیا گیا ہے۔

مالوہ کے سلطان غیاث الدین خلجی کا بلند دروازہ دیکھا۔ لنگر خانہ دیکھا جہاں ہر روز تین من دلیہ پکا کر غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ خود خواجہ صاحب ہر روز بس تھوڑا سا دلیہ کھاتے تھے۔

صندل خانہ مسجد دیکھی جس کے کونے میں صندل کا ماوا کوٹا جاتا ہے اور ہر روز خواجہ صاحب کی قبر پر لگایا جاتا ہے۔ اولیا مسجد دیکھی جو اس جگہ کھڑی ہے جہاں خواجہ صاحب نے اجمیر پہنچ کر پہلا پڑاؤ ڈالا تھا۔ پھر شاہ جہانی مسجد دیکھی جس کی بنیاد شاہ جہاں نے رکھی تھی اور جو اڑھائی لاکھ کے صرفے سے جب چودہ سال میں مکمل ہوئی تو وہاں سب سے پہلے نماز خود شاہ جہاں نے پڑھی تھی۔ اکبری مسجد بھی دیکھی۔ شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا تو باپ نے شکرانے کے طور پر یہ مسجد تعمیر کرائی تھی۔

ہم نے دو اور عجائبات دیکھے۔ ایک تو وہ جنتی دروازہ کہ جو شخص اپنی زندگی میں سات مرتبہ اس دروازے سے گزر جائے، اُسے جنت میں داخلہ ملے گا۔ اور دوسرے وہ دو بڑے دیگ کہ جن میں خشک میوے کے ساتھ میٹھے چاول پکائے جاتے ہیں۔ بڑی دیگ اکبر بادشاہ نے دی تھی، اس میں اڑھائی ٹن چاول پکتا ہے جس پر تقریباً تیس ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ چھوٹی دیگ جہانگیر کا عطیہ ہے جسے بھر کر پکانے پر کوئی بیس ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

مال دار زائرین کبھی کبھار نہیں، اکثر ان دیگوں میں چاول، شکر، گھی اور خشک میوے بھروا کر پکواتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے نام پر یہ کھانا غریبوں میں تقسیم کیا جائے۔ مگر وہاں منظر دوسرا ہی ہوتا ہے۔ چاول رات بھر پکتے ہیں اور صبح تڑکے پک کر جوں ہی تیار ہوتے ہیں، اجمیر کے سقے ان دیگوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ یہ فرض وہ باپ دادا کے زمانے سے ادا کرتے آئے ہیں، چنانچہ پہلے تو وہ بالٹیاں بھر بھر کر چاول نکالتے ہیں، پھر خود بڑے لمبے جوتے پہن کر دیگوں کے اندر اتر جاتے ہیں اور بیس تیس ہزار کے صرفے سے رات بھر پکنے والا نہایت نفیس اور لذیذ چاول دیکھتے دیکھتے لُٹ جاتا ہے اور غریب دور کھڑے تماشا دیکھا کرتے ہیں۔

زیارت کی تجارت کے یہ منظر مجھ سے نہیں دیکھے گئے اور میں اپنا تھیلا اٹھا کر ایک بڑے دروازے کے راستے باہر نکل گیا۔ میرے میزبانوں نے مجھے مبارکباد دی کہ میں نے نکلنے کے لئے جنّت کے نام سے منسوب دروازے کا انتخاب کیا۔

اُس وقت حضرت آدم علیہ السلام بہت یاد آئے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اجمیر کے ایک کلرک کی۔

بی بی سی لندن سے میں سامعین کے خطوں پر مبنی پروگرام 'انجمن' پیش کیا کرتا تھا۔ سنہ ۸۱ء کے آخر میں اس پروگرام میں ایک خط نشر ہوا تھا جس کا مضمون یوں تھا:

''مکرمی۔ پچھلے سال اکتوبر کی ایک پیر کو میرا ایک خط انجمن میں نشر ہوا تھا جس میں مَیں نے لکھا تھا کہ میرے گھر میں سبھی خوشیاں موجود ہیں لیکن میرے چمن میں اولاد کا وہ پھول نہیں جو ماں باپ کو راحت بخشتا ہے۔ آپ کے سامعین دعا کریں۔ کیا عجب کہ کسی کی دعا قبول ہو جائے اور اللہ ہمیں اولاد کی دولت سے نوازے، تو آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ۲۳ اگست کو میرے گھر چاند سی بیٹی پیدا ہوئی ہے اور میں نے اپنی بیٹی کا نام آپ کی ایک اناؤنسر کے نام پر رضوانہ رکھا ہے۔ انجمن کا اور سامعین کا شکریہ۔ فقط۔ مشرف خاں۔ شورگراں محلہ۔ اجمیر۔''

میں نے لندن سے چلتے وقت یہ خط بڑی احتیاط سے اپنے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ اُس روز یہ خط ہاتھ میں لئے لئے اور راہ گیروں سے راستہ پوچھتا پوچھتا میں اجمیر کے محلّہ شورگراں جا پہنچا۔ مشرف خاں کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔

میں نے کہا۔ ''میں رضا علی عابدی ہوں۔''

کہنے لگے۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

اور میں اپنا اتا پتا بتانے والا ہی تھا کہ مجھ سے لپٹ گئے۔ دوڑ کر خاتون خانہ کو اطلاع کی۔ جھٹ پٹ بیٹھنے کا کمرہ آراستہ کیا گیا اور اس بار مجھے اندر لے جانے کے لئے آئے تو ہونٹوں پر ایسا تبسّم کہ جس پر بے ساختہ پیار آئے۔ مشرف خان راجستھان کے کسی سرکاری دفتر میں کلرک ہیں اور ترقی کر کے بہتر عہدہ پانے کے لئے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے گھر میں لے گئے۔ بہت قدیم مکان کی اتنی ہی قدیم سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم بالائی منزل میں پہنچے جو مشرف خاں کا چمن ہے۔

بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ سامنے مسہری پر ایک منّی سی، سانولی سی اور پیاری سی بچّی بالکل نئی فراک پہنے، بال جمائے، اور آنکھوں میں بہت سا سرمہ لگائے بیٹھی تھی۔

مشرف خاں نے کہا: ''یہ ہیں رضوانہ۔''

ماشاءاللہ کہہ کر میں نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ کسی اجنبی کی گود میں بچّے کم ہی آتے ہیں مگر اس نے مسکرا کر بانہیں پھیلا دیں۔

میں نے جوں ہی ننھی رضوانہ کو گود میں لیا، اُس نے آہستہ سے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔

تمیں سال بعد

اب کے کام مشکل تھا۔ اجمیر میں مشرف خان کو ڈھونڈنا تھا جن کے کہنے پر ریڈیو کے لاکھوں سامعین

نے اولاد کی دعا کی تھی اور اسی برس ان کے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی تھی ۔ وہ چھ سات ماہ کی تھی جب میں ان کے گھر پہنچا اور ننھی رضوانہ ہاتھ پھیلا کر میری گود میں آ گئی تھی ۔ ۳۰ سال بعد میں جاننا چاہتا تھا کہ مشرف خان کا گھرانا کس حال میں ہے ۔ میرے پاس ان کا ڈاک کا پتہ تھا: مشرف خان ۔ شورگراں محلّہ ۔ اجمیر ۔ مگر اس پتے پر جا کر کون دیکھے کہ وہ لوگ وہاں ہیں بھی یا کہیں اور چلے گئے ۔ چنانچہ تلاش شروع ہوئی ۔ سب سے پہلے تو دلّی میں ایک صاحب ملے جو کبھی اجمیر کی درگاہ کی انتظامی کمیٹی کے رکن رہ چکے تھے ۔ انہوں نے وہاں پیغام بھیجا کہ یہ جو خدام کی فوج ظفر موج گھومتی پھرتی ہے اس میں سے کوئی رضا کار شورگراں محلّہ میں جا کر پتہ کرے ۔ جواب آیا کہ ایک صاحب زادے گئے تھے ۔ وہاں تو اس نام کا کوئی شخص نہیں ملا ۔ اسی دوران انٹرنیٹ پر اجمیر شریف کے ایک پیر بابا کی ویب سائٹ مل گئی ۔ میں نے ان کو لکھا کہ مجھے شورگراں کے مشرف خان کی تلاش ہے، کسی کو بھیج کر معلوم کیجئے، آپ کو اور آپ کے بال بچوں کو دعا دوں گا ۔ دو تین دن بعد ان کا جواب آیا ۔ وہی جواب جو انہوں نے ہر آرزومند کے لئے چھاپ کر رکھا ہے ۔ اس میں وہی بندھی ٹکی تحریر تھی کہ میں دعا کر رہا ہوں ۔ آپ کی مراد پوری ہوگی ۔ اور آخر میں وہی اصل بات کہ اگر آپ نذر نیاز کے لئے رقم بھیجنا چاہیں تو اس کا آسان طریقہ کیا ہے ۔ میں نے اس دوران ایک کام یہ کیا کہ مشرف خان کے ڈاک کے پتے پر ایک خط ڈال دیا کہ اگر یہ چٹھی آپ کو مل جائے تو دلّی میں میرے دوست عبید صدیقی کو فون کیجئے ۔ اس کے ساتھ ہی خیال آیا کہ جے پور میں راجستھان کے محکمہ سیاحت میں ہماری پرانی دوست ترپتی پانڈے بھی تو ہے، کیوں نہ اس سے کہا جائے کہ اجمیر میں اپنے کسی ملازم سے کہے کہ وہ شورگراں جا کر کچھ معلوم کرے ۔ اس بار تھوڑی سی کامیابی ہوئی ۔ وہ شخص خبر لایا کہ مشرف خان وہاں سے غالباً ٹونک چلے گئے ہیں اور یہ کہ ایک بار ان کے گھر بی بی سی والے آئے تھے ۔ اتنی تصدیق سے میری آس بندھی اور رہ گیا ٹونک تو اس سے میرا تعلق پرانا تھا کیونکہ میں کتابوں کی تلاش میں وہاں بھی گیا تھا اور ایک بڑا خزانہ دیکھ کر آیا تھا ۔ جھٹ ٹونک کے مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو فون کیا ۔ وہاں عبدالمعید خان صاحب مل گئے جنہیں ۲۸ سال پہلے میرا آنا یاد تھا ۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ فکر نہ کیجئے ۔ مشرف خان شہر میں جہاں بھی ہوں گے ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے ۔ سچ ہے کہ جس نے ڈھونڈا اس نے پایا ۔ کرنا خدا کا (یا پیر بابا کی دعاؤں کا) یہ ہوا کہ ڈاکیے نے نہایت مستعدی سے میرا خط شورگراں محلے کے اس گھر میں پہنچا دیا جہاں مشرف خان بہت عرصے رہ چکے تھے اور اب وہاں ان کے بھائی بند رہتے ہیں ۔ ان لوگوں نے فوراً ہی ایک جوان کو دوڑایا جو شہر کے علاقے آزاد نگر میں مشرف خان کی قیام گاہ 'میو پیلیس' جا کر میرا خط پہنچا آیا ۔ اس میواتی خان نے جھٹ دلّی عبید کو اور عبید نے مجھے لندن فون کیا ۔ ایک دھوم سی مچ گئی کہ مشرف خان مل گئے ۔ لیجئے صاحب، تین عشروں بعد وہ بھی مل گئے اور ان کی ۲۹ سال کی بیٹی رضوانہ خان بھی مل گئیں ۔ ان کا مکالمہ ابھی سناتا ہوں ۔ لطف کی بات یہ کہ میں نے ایک بار پھر ٹونک

فون کیا۔ عبدالمعید خان نے کہا کہ اس شہر میں تو مشرف خان نام کا کوئی شخص نہیں ملا۔ میں نے کہا کہ وہ تو مجھے اجمیر میں مل گئے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ ان کے دو قریبی عزیز محمد خان اور نثار خان آپ کے انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے ہیں' آپ نے انہیں سارے شہر میں ڈھونڈا خود اپنے دفتر میں ذرا سا اعلان کر دیتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔

اب 'میو پیلیس' کا حال سنیئے۔ جب میں پہلے پہل ملا تھا تو مشرف اپنے محکمہ تعلیم کے کسی امتحان کی تیاری کر رہے تھے جس کے بعد ان کی ترقی ہونی تھی۔ ہم سنتے آئے ہیں کہ گھر میں بیٹی کا آنا باعث رحمت ہوتا ہے' یہی ہوا کہ مشرف ترقی کرتے گئے اور بالآخر اپنے قدیم مکان سے نکل کر انہوں نے اجمیر کے نواح میں ایک جدید بستی میں اپنا بنگلہ تعمیر کرایا اور اب وہاں رہتے ہیں۔ رضوانہ کے بعد ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور پھر ایک اور بیٹی ہوئی۔ فون پر میری آواز سن کے اتنے ہی خوش ہوئے جتنے اس روز اپنے گھر کے دروازے پر اچانک مجھے دیکھ کر ہوئے تھے۔ بتانے لگے کہ رضوانہ بڑی پیاری بچی نکلی۔

سارے محلے والے اسے اٹھائے اٹھائے گھومتے تھے۔ پھر اس نے اردو میں ایم اے کیا اور بائیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوئی۔ اب چھ سال کے ارمان خان کی ماں ہے اور اپنا بیوٹی پارلر چلا رہی ہے۔ جلد ہی دوبارہ ماں بننے والی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ انشورنس کا کام کرتی ہے۔ اس کا شوہر ندیم بھی انشورنس کے کام میں مصروف ہے اور اسکول کے بچوں کی وین چلاتا ہے۔ رضوانہ کا بھائی جاوید اب چھبیس برس کا ہے، انجینئرنگ پاس کر چکا ہے اور کسی انجینئرنگ کالج میں پڑھاتا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن سمیرہ اب اٹھارہ برس کی ہے بارہویں کلاس میں ہے اور آئی آئی ٹی کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ خود مشرف خان ریٹائر ہو چکے ہیں البتہ ایک پنچایت کمیٹی سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ماشاءاللہ خوش حال ہیں۔

اب میں رضوانہ سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔ وہ باپ کے گھر سے ذرا دور رہتی ہے۔ طے یہ ہوا کہ اتوار کو وہ وہیں آ جائے گی اور مجھ سے بات کرے گی۔

اتوار بھی آئی اور رضوانہ بھی۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا۔ آتے ہی بولی کہ جن دنوں آپ ہم لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے میں نے آپ کو سپنے میں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کیا میں اور میری صورت شکل یاد تھی تمہیں؟ کہنے لگی کہ جی نہیں گھر میں آپ کی اتاری ہوئی ساری بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں محفوظ ہیں۔

میں نے کہا کہ وہ تصویریں تو میرے پاس بھی ہیں لیکن مجھے تو یوں بھی یاد ہے کہ جب میں تمہارے گھر آیا تھا تو تمہاری ماں نے تمہیں بنا سنوار کر تیار کیا تھا۔ تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں' پاؤں میں پازیب تھیں' گال پر سرمے کا تل لگایا گیا تھا اور تم کلّو بیگم نظر آ رہی تھیں۔ جھینپ کر بولی۔ 'اب تو میں بہت گوری ہو گئی ہوں'۔ باپ نے بھی تصدیق کی 'جی۔ خاندان میں سب سے گوری ہے'۔

اس کے بعد رضوانہ اپنے بچپن کا حال سنانے لگی۔ 'میں بہت شیطان تھی۔ اسکول میں بھی شیطانی کرتی تھی لیکن خود مجھے تو کبھی مار نہیں پڑی البتہ ساتویں کلاس میں ٹیچر نے ایک لڑکی کو بری طرح مارا۔ میں ڈر گئی اور اگلے روز اسکول جانے سے انکار کر دیا۔ ابا مجھے بہت چاہتے تھے' انہوں نے ایک سال کے لئے مجھے گھر بٹھا لیا۔

پھر رضوانہ نے بتایا کہ اس نے ایم اے پاس کیا۔ بائیس برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ تمہارا میاں کیا کرتا ہے' مجھے یوں سنائی دیا کہ بینک چلاتا ہے۔ میں حیران ہو رہا تھا تب اس نے وضاحت کی کہ اسکول کے بچوں کی وین چلاتا ہے۔ کچھ روز بعد ان کے کنبے کی تصویریں آئیں جن میں وہ خوب رو نظر آیا لیکن اس کی تعلیم معمولی تھی اور باپ خوش نہیں تھے۔ رضوانہ نے خود اسے پسند کیا تھا۔ میں نے اطمینان دلایا کہ برکت والی بیٹی ہے' خوش رہے گی۔

دوسری لطف کی بات اس وقت ہوئی جب میں نے رضوانہ سے پوچھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے گھر کیوں اور کیسے آیا تھا؟ اس نے نفی میں جواب دیا تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے والدین کی کوئی اولاد نہیں تھی اور انہوں نے مجھے خط لکھا تھا کہ اپنے سامعین سے کہیئے کہ دعا کریں' پھر اسی سال تم پیدا ہوئیں اور میں تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ کیا تمہارے والد نے تمہیں یہ ساری بات نہیں بتائی؟

اس نے ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔ خیر۔ ممکن ہے مشرف خان کو خیال نہ رہا ہو۔ اب آخری سوال اُس نے کیا۔

کہنے لگی کہ مجھے پا کر آپ کو کیسا لگا؟ میں نے کہا کہ یوں سمجھ لو کہ کسی کو تیس سال بعد اس کی بیٹی مل جائے تو اسے کیسا لگے گا۔

تازہ خبر یہ ہے کہ رضوانہ کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ اس کے والد نے بتایا تھا کہ رضوانہ امید سے ہے۔ میں نے فون کیا تو کہنے لگی کہ میں آپ کی دعا سے پیدا ہوئی تھی۔ اب دعا کیجئے کے میرے ہاں آپ کے بقول ایک کلّو بیگم پیدا ہو۔ میں نے جھٹ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ کچھ عرصے بعد فون کیا تو بولی 'بڑے ابا، مبارک ہو، میرے گھر ایک کلّو بیگم آگئی ہیں لیکن آپ کو یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ وہ گوری ہے۔ اب آپ آکر اسے بھی گود میں لیجئے، یقین ہے وہ بھی ہاتھ بڑھا کر آئے گی۔'

کیوں نہ آئے۔ نواسی جو ہوئی۔

تو یہ ہے کہانی کسی ایک وقت کی نہیں' بلکہ بدلتے ہوئے وقت کی۔ اس کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں' اس کے علاقے بدلتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی ایک منظر بھی نہیں' اس کے منظر بدلتے رہتے ہیں۔ وقت کا سفر کوئی تنہا سفر نہیں' اس میں افراد ہی سفر نہیں کرتے' ان کے احساسات اور جذبات بھی سفر کرتے ہیں۔ اس سفر کی چال ہمیشہ اور

ہر جگہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کہیں طے کرنا ممکن نہیں کہ اگلے برس یا اگلے دس برسوں میں کس پر کیا گزرے گی، کس کا کیا بنے گا اور وقت کس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ہر صبح طلوع ہونے والا سورج ہر روز جو داستان رقم کرتا ہے وہ پہلے سے طے نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو آثار کچھ اور کہتے ہیں اور حقیقت کوئی نیا ہی جامہ پہن کر نمودار ہوتی ہے۔ یہ ایسا سفر ہے جو کہیں ٹھہرتا نہیں۔ اسے کسی مقام پر روکنا بھی چاہیں تو رکتا نہیں۔ اسے نہ کہیں ثبات ہے اور نہ کہیں قرار۔ یہ ایسا اسٹیج ہے جس پر اداکار آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں اگلا مکالمہ کب اور کیسے ادا کرنا ہوگا۔ وہ کتنے ہی مسودے لکھوا کے لے آئیں، اگلا منظر ان کی امیدوں اور امنگوں سے جدا اور مختلف ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ انہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ پردہ کب گرے گا۔

بس اتنا سا خیال ہے جو یہ پوری داستان کہہ سنانے کا سبب بھی بنا اور جواز بھی۔

یہ داستان سننے والے کے ذہن میں ایک چھوٹا سا چراغ ہی روشن ہو جائے تو اس کے منظروں میں نور بھر جائے۔

یہ واحد آس ہے جو یہ سفر بندھاتی ہے۔

سخت جان دلّی

واپسی کا سفر مجھے دوبارہ دلّی لے آیا ہے۔

میں پرتھوی راج روڈ کے کنارے کھڑا ہوں۔ دفتروں میں ابھی ابھی چھٹی ہوئی ہے اور لوگ گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ سائیکلوں پر سوار ہیں اور پیچھے کیریئر پر یا تو چولہے میں جلائی جانے والی لکڑیاں رکھی ہیں' یا پھر اسی چولہے کو جلانے والی بیوی بیٹھی ہے۔ بس اسٹاپ پر بہت سے لوگ کھڑے ٹاٹا کی لوہالاٹ بسوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ عورتوں نے لمبی قمیصیں اور تنگ پاجامے پہن رکھے ہیں اور اُسی کپڑے کا دوپٹہ ہے۔ مردوں نے جو کچھ مناسب سمجھا ہے یا جو کچھ ہاتھ لگا ہے' پہن لیا ہے۔ بس اسٹاپ کے اوپر اور بجلی کے کھمبے پر 'جیا جی' کپڑے اور 'اپنا بنالو' فلم کے اشتہار لگے ہیں اور کراچی اور لاہور کے ٹریفک کے مقابلے میں اکا دکا کاریں' آٹو رکشہ اور ٹیکسیاں گزر رہی ہیں اور سامنے بڑے سے بورڈ پر انگریزی' ہندی' گورمکھی اور اردو میں سڑک کا نام لکھا ہے: پرتھوی راج روڈ۔

دلّی صحیح معنوں میں راج دھانی ہے۔ ہندوستان بھر کی تہذیبیں یہاں جمع ہیں۔ پھر سمندر پار سے آئی ہوئی تہذیبیں بھی یہیں اکٹھی ہیں اور ان سب کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پھیلتا پھیلتا یہ شہر نا معلوم کہاں تک چلا گیا ہے۔ ہم نے تو یہ دیکھا کہ جہاں تک ہم چلے' وہیں تک شہر دلّی بھی چلا۔ وہ سارے مضافات' وہ سارے نواحی علاقے' وہ قدیم بستیاں اور وہ دور دراز مقام کہ جہاں کبھی باہر سے آنے والے قافلے شہر میں داخل ہونے سے پہلے اپنا آخری پڑاؤ ڈالا کرتے تھے' وہ سارے مقام اب دلّی کے اندر آ گئے ہیں' لائے نہیں گئے' دلّی خود چل کر ان تک پہنچی بلکہ ان سے بھی آگے نکل گئی ہے۔

اوپر سے ایشیائی کھیلوں کی تیاریاں ہیں اور پرانی مٹی سے نئی عمارتیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ سبھی مصروف ہیں' کوئی پُل بنا رہا ہے اور کوئی چاہ بنا رہا ہے۔ دلّی کو جو بھی دیکھتا ہے وہ اس شہر کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتا ضرور ہے۔ ہم نے دیکھا تو یہ کہا کہ اگر بار بار بجلی نہ جائے اور بھرے شہر میں راہ گیروں کو لوٹا نہ جائے تو دلّی برا شہر نہیں۔

بجلی تو خیر نئے زمانے کی دریافت ہے اس لئے آتی جاتی رہتی ہے' جب مشق ہو جائے گی تو یوں آئے گی کہ پھر کبھی نہیں جائے گی۔ البتہ لوگوں کو لوٹنے اور لٹنے کی مشق اب صدیوں پرانی ہوگئی ہے۔ ٹھگی کا کاروبار تو جاتے جاتے جائے گا۔ اس بے حد مالدار مگر غریب شہر کو کس کس نے نہیں لوٹا اور کس کس نے نہیں اجاڑا لیکن سخت جان ہونے کے معاملے میں دلّی نے بلّی کی خصوصیات پائی ہیں۔

دنیا میں دو تین ایسے مقامات ہیں جہاں جایئے تو پہلے ان کی تاریخ پڑھ کر نہ جایئے ورنہ یہ مقام بڑے دکھ دیتے ہیں۔ مثلاً قرطبہ' بغداد اور دلّی۔ دلّی کا تو یہ حال ہے کہ شہر نہیں گویا مصور کے اوراق ہیں کہ اس میں جو شکل نظر آتی ہے' سراپا تصویر بن کر۔ ذرا غور سے دیکھئے تو کوئی مغل نظر آتا ہے کوئی افغان' کوئی جاٹ ہے اور کوئی سکھ' کوئی سید ہے اور کوئی روہیلہ۔ غرض یہ کہ بھولی ہوئی داستانوں کے سارے کرداروں کے چھوڑے ہوئے نقش پا ابھی مٹے نہیں ہیں۔ وہ فصیلیں اور وہ دروازے ابھی موجود ہیں جنہیں زیر کر کے جنرل نکلسن کی فوجیں شہر میں در آئی تھیں' اور جنرل صاحب آج تک کشمیری دروازے کے قبرستان میں محو خواب ہیں۔ وہ مسجدیں' وہ مینار' وہ حویلیاں' وہ قلعے' وہ گلیاں اور وہ تنگ و تاریک کمرے اب بھی موجود ہیں جن کی کڑیاں' دہلیزیں اور روشن دان آج بھی اپنے وقت کی گواہی دیتے ہیں۔

میں جامع مسجد سے نکلا تو جی اداس تھا۔ یہ مسجد میں نے اپنے بچپن میں دیکھی تھی اور اس کے صاف ستھرے در اور سفید گنبد ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ اب جو گیا تو دیکھا کہ جہاں تک انسان کا قد جاتا ہے' اتنی اونچائی تک دیواریں گندی اور چکنائی میں اٹی ہوئی ہیں۔ چھتوں میں مکڑی کے جالے دیکھے تو طبیعت بوجھل ہوگئی۔ سامنے لال قلعہ تھا جس پر بڑا سا ترنگا لہرا رہا تھا۔ میں اس عمارت میں جتنے اشتیاق سے داخل ہوا اتنے ہی دکھی دل کے ساتھ باہر نکلا۔ تاریخ کے اس شاندار ورثے کے بیچوں بیچ انگریزوں نے اپنی چھاؤنی بنا دی تھی اور بیرکیں تعمیر کر کے ان میں اپنی فوج رکھی تھی۔ میں اس یقین کے ساتھ گیا تھا کہ قالین میں لگے ہوئے وہ ٹاٹ کے پیوند اب نکال دیئے گئے ہوں گے مگر وہ بیرکیں بھی موجود ہیں اور اُن کا وہی استعمال بھی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ دیوانِ عام اور دیوانِ خاص الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ سیکڑوں سیاح ان کی چھتوں' دیواروں اور ستونوں کو دیکھ رہے تھے اور میری چشمِ تصور دیوان عام میں کبھی نادر شاہ کو دیکھتی تھی اور کبھی احمد شاہ کو' کبھی انگریز فوج کو فتح کا جشن مناتے دیکھتی تھی اور کبھی بہادر شاہ ظفر ملزم کے کٹہرے میں نظر آتے تھے۔

اور دیوانِ خاص میں تو میری آنکھوں نے آنکھوں کا عجب حشر دیکھا۔ میں نے شاہ عالم کی چھاتی پر روہیلوں کو سوار دیکھا' وہ خنجر کی نوک سے حاکم وقت کی آنکھیں نکال رہے تھے۔ میں نے فرخ سیر کے سینے پر گرے پڑے لوگوں کو نہیں' سیّدوں کو چڑھے دیکھا جن کا جب اور جسے جی چاہتا تھا' بادشاہ بنا دیتے تھے۔ کیسے دن تھے کہ

بادشاہِ وقت کو مار کر ہمایوں کے مقبرے میں گاڑ آتے تھے اور یہ خیال بھی نہیں رکھتے تھے کہ قبر کا رخ قبلے کی جانب ہو یا اس پر کوئی پتھر لگا کر اس پر میت کا نام ہی لکھا ہو۔ میں چاندنی چوک میں چلا تو محسوس ہوا کہ میرے ساتھ وہ ہاتھی چل رہا ہے، جس پر شاہ جہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ بیٹھا ہے' اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہیں' تن پر کھدر کا لباس ہے اور سر پر خاک ڈالی گئی ہے۔ وہی سر جو بالآخر تن سے جدا ہوا اور وہی تن جو آخر کار اسی خاک میں مل گیا۔

دلّی نے مجھے بہت ستایا اور میں نے طے کر لیا کہ اب نہ کسی مقبرے پر جاؤں گا نہ کسی مزار پر۔ نہ کسی محل میں قدم رکھوں گا نہ کسی فصیل پر۔

چاندنی چوک میں رونق بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ میرے قریب آ کر کان میں کہہ رہے تھے کہ کرنسی بدلی کرا لیجئے صاحب' فارن کا مال ادھر ملے گا صاحب۔ مگر میں چلتا گیا اور میں نے وہ لسّی بھی نہیں پی جو اب بجلی کے موٹر کی مدد سے بنائی جاتی ہے۔ میں تیز تیز چلتا ہوا پالم پہنچا جہاں شاہ عالم کی حکمرانی ختم ہو جاتی تھی۔ اُس کے آگے کا علاقہ جس سفید فام حاکم نے سرکتے سرکتے اپنی حکمرانی میں شامل کر لیا تھا' میرا اگلا پڑاؤ اُسی کی راج دھانی لندن میں تھا۔

وقت پَر سکیڑ کر اُڑا اور پھر سات سمندر پار جا اُترا۔

میرا خواب ختم ہوا۔

کیسا خواب تھا جو میری جاگتی آنکھوں نے دیکھا تھا۔

ہمارے کُتب خانے

پیش لفظ

جب بی بی سی کی اردو سروس کے ڈیوڈ پیج نے مجھ سے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کو کہا تو میں آمادہ نہ تھا۔ میں نے کہا ''اردو میں میرے کام کی نوعیت ایسی نہیں رہی کہ کتب خانوں کی چھان بین کی ضرورت پڑتی' اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس کام کے لیے موزوں آدمی ہوں۔ اس پر ڈیوڈ کہنے لگے ''آپ فوراً انکار نہ کیجیے مجھ سے اور رضا علی سے آ کر ملیے تا کہ ذرا تفصیل سے گفتگو ہو''۔

میں گیا اور جب گفتگو تفصیل سے ہوئی تو میری دلچسپی کا سامان نکلا۔ میں مسودہ اپنے ہمراہ گھر لے گیا اور پہلی فرصت میں پڑھنا شروع کیا۔

میں جیسے جیسے پڑھتا گیا' میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ اسی دوران میں نے ڈیوڈ اور رضا علی کو فون کر کے بتایا کہ میں پیش لفظ یقیناً لکھوں گا۔

کتاب کے بہت سے حصوں کو میں نے توجہ سے پڑھا۔ مثلاً وہ باب جس میں کلیات غواصی کی دریافت کا بیان ہے اور وہ حصہ جس میں رضا علی نے ''بیاض غالب بخط غالب'' کا سارا قصہ لکھا ہے' کسی جاسوسی ناول سے کم دلچسپ نہیں۔ جو بات پڑھیے آپ کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ (یہ ضمنی بات ہے لیکن لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ رضا علی عابدی کی زبان اور طرز بیان دونوں اتنے اچھے ہیں کہ پڑھ کے طبیعت خوش ہو گئی۔ نہ انگریزی الفاظ کا بلا ضرورت استعمال اور نہ ثقیل اردو الفاظ سے مرعوب کرنے کی کوشش۔ سلیس اور رواں اردو میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں اور پڑھنے والے کو بڑا لطف آتا ہے۔)

ایک طرح سے یہ کتاب ایک پرزور اپیل کی تمہید ہے۔ اس کتاب نے افراد' انجمنوں اور ارباب حل و عقد' سب کی توجہ اس طرف دلانی چاہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں پبلک اور ذاتی کتب خانوں اور مدرسوں' خانقاہوں اور گھروں میں بیش بہا کتابوں اور مخطوطوں کا ایسا بڑا ذخیرہ ہے کہ بقول مصنف ''اگر یہ ساری کتابیں یکجا

ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آ جائے'' اور اگر اس کا تحفظ نہ کیا گیا اور بہت جلد نہ کیا گیا تو اس کا بہت بڑا حصہ تباہ ہو جائے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں اس ورثے کی قدر ہے بی بی سی اور اس کتاب کے ناشر کا شکر گزار ہو گا اور اس اپیل کی پوری پوری حمایت کرے گا۔

لندن

4 فروری' 1985ء　　　　　　　　　　رالف رسل

ان سے ملیے

یہ وہ کتابیں ہیں جو آج ہیں اور شاید کل نہ ہوں اور یہ ان بے شمار کتابوں کے مزار ہیں جو خاک کی صحبت میں رہتے رہتے خود بھی خاک ہو گئیں۔ ایسی خاک جس سے اب کوئی شگوفہ نہیں پھوٹے گا۔

یہ اس قافلے کا ذکر ہے جس کے قدموں کے زیادہ تر نشان مٹ چکے ہیں لیکن جو باقی ہیں وہ اتنے کم بھی نہیں کہ سمتوں اور منزلوں کا پتہ نہ چلے۔ گفتگو ہماری یہی ہے کہ اب جیسے بھی بنے ان نشانوں کو نئے شعور کے دامن سے یوں ڈھانپ لیا جائے کہ اب نہ کوئی جھونکا ادھر سے گزرے اور نہ پگڈنڈیوں پر نئی گھاس اُگے۔

یہ قدیم کتابوں اور دستاویزوں کو مٹنے سے بچانے کی امنگ کا ذکر ہے۔

پرانی کتابوں کی بات 1975ء کے شروع میں یوں چھڑی تھی کہ بی بی سی' لندن کی اردو سروس نے اس وقت ''کتب خانہ'' کے عنوان سے پہلا سلسلے وار پروگرام نشر کیا تھا۔ وہ برطانیہ میں محفوظ پرانی اردو کتابوں کا تعارف تھا۔ ایک عام تاثر یہ تھا کہ یہ کتابوں سے بیزاری کا دور ہے اور یہ کہ کتابوں کی باتیں بس گنے چنے لوگ سنیں گے۔ مگر وہ قیاس صحیح نہ تھا۔ برصغیر کے ہر گوشے اور قریے میں کتابوں کی باتیں دلچسپی سے سنی گئیں۔ پروگرام کی حمایت میں آنے والے خطوں کا تانتا بندھ گیا اور یوں لگا کہ قدیم کتابوں کے بارے میں جو ہم نے کہا' گویا ہر ایک کے دل میں پہلے سے تھا۔ وہ پروگرام 14 ہفتوں کے لیے شروع کیا گیا تھا لیکن 140 ہفتے چلا اور اس کا بند ہونا بے شمار سننے والوں کی خفگی کا باعث بنا۔

لیکن شکایتوں کے خطوں میں کچھ حکایتیں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ کتنے ہی سامعین کو اندازہ نہ تھا کہ خود برصغیر میں کیسے کیسے عظیم الشان کتب خانے موجود ہیں جن کی الماریوں میں سلیقے سے چنی ہوئی نایاب کتابیں کب سے اپنے قاری کی منتظر ہیں۔ اس پر بی بی سی کو خیال آیا کہ کیوں نہ اسی عنوان سے ایک نیا پروگرام ترتیب دیا جائے۔ موقع پر جا کر تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ ڈیرہ اسماعیل خان کی پہاڑیوں سے لے کر مدراس کے

ساحلوں تک اور بنگال کے سبزہ زاروں سے راجستھان کے ریگ زاروں تک قدیم کتابیں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

اس تحقیق کا شرف مجھے ملا۔ موضوع پسندیدہ ہو تو صعوبتوں کا احساس مٹ جاتا ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ میں نے بہت کونے جھانکے کسی میں نور بھرا تھا اور کہیں اندھیروں کا راج تھا۔ کہیں کتابیں بچائی جا رہی تھیں اور کہیں کیڑوں کی غذا بن رہی تھیں۔ ان سب کا احوال جمع کیا تو کتب خانہ ہی کے عنوان سے پروگرام کا دوسرا سلسلہ تشکیل ہوا۔ یہ 1982ء کے اوائل کی بات ہے۔ اس تحقیق کو ریڈیائی گفتگو بننے میں آدھا برس لگا اور یہ پروگرام اسی سال اکتوبر سے شروع ہوئے اور چھ ماہ چلے۔ بات اب کے ذرا مختلف تھی اور دل کو ایک دھڑکا سا تھا لیکن یہ پروگرام بھی بہت مقبول ہوا اور اتنا سراہا گیا اور اتنی توجہ سے سنا گیا کہ اس پر سامعین کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

اسی غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اس ساری تحقیق کو کتاب کی شکل میں محفوظ کرنے کا خیال آیا میں نے سوچا کہ ہواؤں میں بکھر جانے والی بات اس طرح محفوظ رہ جائے گی' اطمینان سے پڑھی جائے گی اور ان لوگوں تک بھی پہنچ جائے گی جو کسی وجہ سے ریڈیو پروگرام نہیں سن سکے۔ کراچی کی ایک نشست میں اسماعیل سعد صاحب سے اس کا ذکر ہوا تو بڑے بڑے فیصلے ایک لمحے میں ہو جانے کی ایک نئی مثال قائم ہوئی۔ انہوں نے فوراً ہی یہ کتاب شائع کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور کام چل نکلا۔ بی بی سی ان کی شکر گزار ہے انہوں نے بلاشبہ اپنے علم دوست گھرانے کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس طرح کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

یہ کتاب دوسری کتابوں سے ذرا مختلف ہے۔

یہ دراصل ریڈیو کا دستاویزی پروگرام ہے جسے کتاب کی شکل دی گئی ہے۔ اس کی ساری تحریر میں تقریر کا انداز ہے۔ اس پوری گفتگو میں قدم قدم پر مختلف اہل علم بھی محوِ گفتگو ملیں گے۔ یہ وہ محترم شخصیتیں ہیں جن کی آنکھیں کتابوں کے قرب سے منور اور جن کے دل کتابوں کے درد سے معمور ہیں۔ ان کا انداز بھی تقریر کا ہے' گفتگو کے وقت ان کے سامنے کوئی تحریر نہ تھی۔ لہٰذا کہیں جملے ذرا سے بے ربط ہیں تو کہیں لفظوں کی تکرار ہے۔ اکثر جگہ علاقائی لب و لہجہ بھی برقرار ہے۔ بات کا یہ فطری انداز کتاب میں جوں کا توں رکھا گیا ہے تاکہ اس پر پیوند کا گماں نہ ہو۔

بی بی سی کی نشرگاہ اس معاملے میں خوش نصیب ہے کہ جیسے جیسے یہ پروگرام نشر ہوتا گیا معزز سامعین کے تبصرے اور مشورے موصول ہوتے گئے۔ کہیں انہوں نے ہماری اصلاح کی اور کہیں راہنمائی کی۔ ان کی یہ نشان دہی بڑی کارگر ہوئی جس کے مطابق کتاب کے مسودے میں رد و بدل کر لی گئی اور گراں قدر اضافے بھی ہوئے۔ وہ سامعین شکریہ کے مستحق ہیں۔

چند اور باتیں اور بہت اہم ہیں۔

یہ کتاب برصغیر کے کتب خانوں کی جامع فہرست نہیں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں کتب خانے اتنے بہت سے ہیں اور دور دراز علاقوں میں ہیں کہ ان کی فہرست ترتیب دینا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ اس میں کئی ایسے کتب خانوں کا ذکر شامل نہ ہو جن کا ہونا بہت ضروری تھا' میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کی بیشتر گفتگو اردو' فارسی اور عربی کتابوں اور دستاویزوں کے حوالے سے ہے۔ برصغیر کی دوسری زبانوں کی کتابوں اور ان کے مخصوص کتب خانوں کا ذکر بہت کم ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے مسئلے اور ان کے تقاضے مختلف یا کم تر ہیں۔ ان کو بھی توجہ اور دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہے۔

تیسری بات یہ کہ اپنی تحقیق کے دوران ہر جگہ خود جانا اور موقع پر مشاہدہ اور تصدیق کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ ایسی صورت میں کوئی نہ کوئی راوی میرا حوالہ بنا ہے۔ اگرچہ ہر راوی مستند' معتبر اور باخبر ہے لیکن کہیں روایت میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہو تو سہو سمجھیے اور درگزر کر دیجیے۔

ایک اور بات یہ کہ ساری تحقیق 1982ء کے ابتدائی چار مہینوں میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بعض منصوبے مکمل ہو گئے ہیں' کچھ کتب خانوں میں توسیع ہوئی ہے' کسی سے شکایتیں تھیں ان کی چھان بین ہوئی ہے۔ چند کتب خانوں کی حالت بگڑی ہے اور دو ایک کتب خانے اس وقت تھے اب نہیں ہیں۔ تعمیر و تخریب کا یہ عمل تیز ہے۔ ترمیم و تنسیخ اس سے قدم ملا کے نہیں چل پائے گی' یہ سوچ کر میں نے اپنے اصل بیان کو جوں کا توں چھوڑ دیا ہے۔ اس سوچ میں یہ امید چھپی ہے کہ پھر کوئی تازہ دم محقق اٹھے گا اور میری اس تحقیق کو آگے بڑھائے گا جو ایک کوہ کن کی پہلی ضرب سے زیادہ نہیں۔

مگر اس وادی میں ایک تنہا آبلہ پا میں ہی نہ تھا میرے بہت سے شریک سفر بھی تھے جو بڑے شکریے کے مستحق ہیں۔ کتنے ہی اساتذہ' محقق' نقاد' مصنف' کتب خانوں' عجائب گھروں اور آرکائیوز کے ذمہ دار افراد' طالب علم' تاجر' عام سامعین اور جہاندیدہ بزرگ میری مدد کو آئے۔ میرے لیے انہوں نے اپنے گھروں' اداروں اور کتب خانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اپنا قیمتی وقت دیا اور اکثر بڑی زحمت اٹھائی۔ ان کی فہرست طویل ہے لیکن کتاب کے مطالعے کے دوران قدم قدم پر ان کے نام آئیں گے۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا شکر گزار ہوں۔

ان میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں جو چند برس کے اس وقفے میں اس جہاں سے سدھاریں۔ وہ سب کتابوں کی محبت سے سرشار تھے۔ مجھے یقین ہے کہ خدا ان کی اس عبادت کی جزاء انہیں دے گا۔ وہ بھی اس پروگرام اور اس کتاب کے مرکزی خیال سے متفق تھے کہ قدیم کتابوں کے ورثے کو بچانے اور محفوظ کرنے کی ضرورت کا شعور بیدار کیا

جائے۔ پرانے مخطوطوں اور دستاویزوں کے تحفظ کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جائے اور یہ کام جس قدر جلد شروع ہو جائے اچھا ہے۔

اس موقع پر برطانیہ میں اردو کے نامور محقق اور استاد رالف رسل☆ کا شکریہ کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ پڑھا اور پیش لفظ لکھا۔ بی بی سی کی اردو سروس کے پروگرام آرگنائزر ڈیوڈ پیج کا شکریہ کہ انہوں نے اس پروگرام کا پہلا خیال ذہن میں سمانے سے لے کر اس کتاب کے چھاپے خانے سے باہر آنے تک غیر معمولی تعاون کیا اور سہارا دیا۔

اور سب سے بڑھ کر بی بی سی کے سامعین کا شکریہ جو پروگرام کے نشریے اور کتاب کی اشاعت کے درمیانی وقفے میں ہمارے حوصلے بڑھاتے رہے اور ہمیں سنبھالے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بی بی سی کی مطبوعات کی تاریخ میں یہ پہلی اردو کتاب وجود میں آئی ہے جو سامعین اور قارئین کی نذر ہے۔

رضا علی عابدی
بی بی سی اردو سروس
بش ہاؤس۔ لندن۔ ڈبلیو سی 2
5 فروری 1985ء
razaali33@hotmail.com

☆ استاد گرامی رالف رسل اس دوران چل بسے اور زبان اُردو اپنے ایک محسن سے محروم ہو گئی۔

☆☆ نہایت اہم۔ اس کتاب کی تمام تحریر ابتدا ۱۹۸۲ء میں لکھی گئی تھی۔ براہِ کرم مطالعے کے وقت یہ بات ذہن میں رکھیے گا۔

کتاب کس حال میں ہے

فروری کا دوسرا ہفتہ تھا۔ اسلام آباد کی پہاڑیوں پر صبح کی پیلی دھوپ پھیل رہی تھی اور دور قراقرم کی چوٹیوں پر برف اب چمکنے لگی تھی۔ میں ہوئی اڈے سے باہر نکلا اور فوراً ہی ٹیکسی لے لی تا کہ جلد سے جلد اپنے ہوٹل پہنچ جاؤں اور وہاں پہنچ کر آئینے میں یہ بھی نہ دیکھا کہ سر کے بال درست ہیں یا نہیں، ٹائی کی گرہ سیدھی ہے کہ نہیں۔ میں لپکتا ہوا اسلام آباد سیکرٹریٹ کی جلسہ گاہ میں جا پہنچا۔

وہاں حکومت پاکستان کے زیر اہتمام دستاویزوں کی حفاظت کے موضوع پر بین الاقوامی مجلس مذاکرہ جاری تھی۔ دو اڑھائی سو مندوب بڑی سنجیدگی سے بیٹھے اتنے ہی سنجیدہ سوال پر غور کر رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کاغذ وہ دستاویزیں، وہ کتابیں اور وہ نسخے کیونکر محفوظ کیے جائیں جن کی بنیادوں پر قوموں کی، ملکوں اور معاشروں کی تاریخ لکھی جاتی ہے۔ وہ خط، وہ عرضیاں وہ احکامات اور وہ فرمان جو وقت کے دھاروں کے رخ موڑ دیا کرتے ہیں انہیں حالات کی گرد سے، لمحات کے سیلاب سے اور قدامت کے بدن میں پلنے والے کیڑوں سے کس طرح بچایا جائے؟

ملک بھر میں یہ فرض انجام دینے والے حکام، افسر، اساتذہ، تحقیقی اداروں کے نگراں اور دفتر خانوں کے نگہبان وہاں جمع تھے۔ چین سے کئی ماہر آئے تھے جو صدیوں پرانی پوتھیوں کو محفوظ رکھنے کے ماہر تھے۔ برٹش لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری کے مہتمم آئے تھے جو دنیا زمانے کی کتابوں، نقشوں، فائلوں اور رجسٹروں کو کچھ اس طرح سینت سینت کر رکھتے ہیں کہ جیسے آتے جاتے لمحوں کی روداد کو وقت کی دستبرد سے بچا بچا کر رکھنے کی ساری ذمہ داری ان ہی پر آن پڑی ہو۔

حاضرین جلسہ مصروف تھے اور مسرور تھے۔ برصغیر میں اب یہ احساس جاگ رہا ہے کہ تاریخ کے ورثے کو بچایا جائے۔ آنے والی نسلوں کے لیے وہ تمام نشانیاں چھوڑ دی جائیں جو بعد میں مشعل بن کر ان کی راہوں میں نور پھیلائیں۔

مگر اس احساس کی تہہ میں کتنے ہی درد اور کتنے ہی کرب چھپے ہوئے ہیں۔ یہ گزری صدیوں کی نہیں حالیہ برسوں کی بات ہے جب اعلیٰ روایات اور تہذیب کے اسی گہوارے میں اور اسی سرزمین میں نہ معلوم کتنی دستاویزیں مٹی میں اور نہ جانے کتنے کتب خانے خاک میں ملے ہیں۔

یہاں ہم علم کے ان سفینوں کی باتیں کریں گے جو بے خبری کے ساحلوں سے چلے اور قدر شناسی کے محفوظ کناروں پر جا لگے اور علم کے ان قافلوں کا ذکر بھی ہوگا جو راہ میں دن دہاڑے لٹ گئے۔

ہم بات کریں گے اس موضوع پر کہ کہاں کہاں کیسی کیسی کتابیں محفوظ ہیں اور وہ کس حال میں ہیں اور کہاں کہاں علم وحکمت کے خزانے یوں گاڑے گئے کہ پھر کبھی انہیں دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

ہم گفتگو کریں گے برصغیر کے اہل علم حضرات سے، علم دوست حضرات سے، ان سے جو ساری زندگی کتابوں کے درمیان گزارتے ہیں اور ان سے جن کے دل اور دماغ کے درمیان اب کتابوں کا بسیرا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی دفن کیے جانے والے خزینوں کی۔

مشفق خواجہ ادب کے شیدائی ہیں جس مکان میں رہتے ہیں اس کے کمروں اور برآمدوں کی دیواریں نظر نہیں آتیں کیونکہ ان کے آگے کتابیں چنی ہیں۔ بتا رہے تھے کہ کتابوں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں۔

''بعض ذخیرے ایسے بھی ہیں جو بزرگوں کے مزاروں پر موجود ہیں۔ میرے سننے میں یہ آیا کہ جب کچھ عرصہ قبل حکومت نے مزاروں کو محکمہ اوقاف کی تحویل میں دے دیا تو وہاں جو لوگ تھے انہوں نے مخطوطات کو زمین میں گاڑ دیا کہ حکومت ان پر قبضہ نہ کر لے۔ اب زمین میں گاڑے ہوئے مخطوطات کا حشر کیا ہوگا؟ میرا خیال ہے وہی ہونا چاہیے جو آدمی کا ہوتا ہے''۔

کتابوں کے دشمن صرف کیڑے مکوڑے ہی نہیں، کچھ اور بھی ہیں۔ جو پرانے گھرانے باپ دادا کے ورثے کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں، ان پر خوف کا عالم طاری ہے کیونکہ انہیں ستانے والوں کی کمی نہیں۔ مثلاً انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی جام شورو کے نگراں ڈاکٹر غلام علی الانا بتا رہے تھے کہ ٹھٹھہ جیسے تاریخی علاقے کے گھرانوں سے اگرچہ سیکڑوں نادر اور نایاب کتابیں اور خصوصاً قرآن، تفاسیر اور احادیث کے نسخے حاصل کر لیے گئے ہیں لیکن:

''اب لوگ یہ تاریخی کتابیں دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں، وہ ڈرتے ہیں کہ یہ ورثہ ان سے کوئی چھین نہ لے۔ ماضی میں بارہا یہ ہوا کہ کوئی ایسا ضلعی حاکم آیا جسے تاریخی نوادر سے دلچسپی ہوگئی اور لوگوں کو مجبوراً یہ کتابیں دینا پڑیں۔ اس لیے اب وہ اپنی کتابیں دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں''۔

اور کتنے ہی گھرانے ایسے ہیں جہاں علم وحکمت کے موتی نسل در نسل چلے لیکن جوں ہی بزرگوں کی آنکھ بند ہوئی یہ موتی اِدھر اُدھر رُل گئے اور ایسی ایسی کتابیں، دستاویزیں، نقشے اور فرمان جو ہماری تاریخ کی گم شدہ کڑیوں

کا پتہ دیتے' آپ ہی گم ہو گئے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے استاد ہیں اور ادب کے ہر تاریک اور روشن گوشے تک ان کی رسائی ہے۔ انہوں نے کتنے ہی کتب خانے بنتے دیکھے اور ان ہی کی آنکھوں نے کتنے ہی ذخیرے مٹتے دیکھے۔ انہوں نے کہا:

''جو ذاتی ذخیرے ہیں اب لوگ دبائے بیٹھے ہیں کہ صاحب یہ تو کروڑوں روپے کا سرمایہ ہے اور بڑی نادر چیزیں ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ نادر ہیں لیکن جو آدمی اپنی تحویل میں لیے بیٹھا ہے جب اس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے تو اس کی اولاد اور اس کے ورثا نہیں جانتے کہ ان چیزوں کی کیا اہمیت ہے' چنانچہ ایسے بعض ذخیروں کا تالا ہی نہیں کھلتا، بکس ہی نہیں کھول کر دیکھے جاتے' یا لوگ چرا کر لے جاتے ہیں یا جو ورثا ان کی اہمیت کو نہیں جانتے وہ ان کوڑی کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں اور اسی طرح بہت سے ایسے ذخیرے جو ملک کے دور دراز علاقوں میں نجی تحویل میں ہیں وہ برباد ہو رہے ہیں اور ان کے ضائع ہونے کا شدید خطرہ ہے''۔

جن لوگوں کو کتابوں سے عشق ہوتا ہے' جنگل اور دریا پھر ان کا راستہ نہیں روکتے۔ آندھرا پردیش کے نامور محقق ڈاکٹر ضیا الدین احمد شکیب علم کی جستجو میں متھرا سے لے کر سیتا مئو تک کہاں کہاں نہیں گئے۔ جہاں خبر ملی کہ قدیم دستاویزوں کا ذخیرہ موجود ہے' ڈاکٹر صاحب وہاں ایک بار نہیں بار بار گئے۔ وہاں انہوں نے کیا دیکھا:

''میں نے بعض جگہ دیکھا کہ ایسی ایسی کتابیں ہیں جو بارہ سو اور تیرہ سو سال پرانی ہیں اور ایسی چھت کے نیچے ہیں جو ہر سال بارش میں ٹپکتی ہے۔ اور مالک یہ چاہتے ہیں کہ ان سے جدا نہ ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ لاکھوں کی چیز ہے لیکن ان میں اتنی بھی استعداد نہیں کہ کسی بینک میں رکھوا دیں۔ ایسے بہت سے کتب خانے ہیں کہ جب ہم سال بھر کے بعد دوبارہ جاتے ہیں کہ ذرا دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یا تو دیمک چاٹ گئی یا چوہوں نے کتر لیا' یا پانی لگ گیا یا کچھ جل گئے یا بچوں نے لاپروائی سے کہیں پھینک دیا۔ ایسے حادثے دن رات ہو رہے ہیں''۔

اپنی اس گفتگو میں جب ہم مطبوعہ یعنی چھپی ہوئی اور مخطوطہ یعنی ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کے ذخیروں کی بات کریں گے تو پرانی کتابوں کے تاجروں کا ذکر بھی آئے گا۔ ایسے تاجروں کا بھی جنہوں نے علم کا اور تاریخ کا بیوپار کیا اور ایسے تاجروں کا بھی جنہیں کتابوں کی تجارت کرتے کرتے ان سے جذباتی لگاؤ ہو گیا اور جنہوں نے بیل گاڑیوں اور چھکڑوں میں بھری ہوئی کتابیں کوڑیوں کے مول فروخت ہوتے دیکھیں' مثلاً حیدر آباد دکن کے علیم الدین جنہوں نے کہا:

''امیر پائیگاہ ظہیر یار جنگ کی مثال لیجیے۔ ان کا انتقال ہوا تو ان کی بیوہ نے ایک لاری بھر کر کتابوں کا ذخیرہ بیچ دیا اور وہ یہاں سے ایران چلی گئیں اور یہ لاری بھر ذخیرہ کوڑیوں کے دام' صرف اڑھائی ہزار میں دے

گئیں۔ کم سے کم دو لاکھ تین لاکھ کی چیزیں تھیں۔ مجھے اتنا دکھ ہوا' اتنا دکھ ہوا کہ کھانا نہیں کھایا گیا۔ بالفاظِ دیگر''۔

کتاب کا معاملہ بھی خوب ہے۔ کتاب اپنے قاری سے بیک وقت دو عشق طلب کرتی ہے' ایک تو خود کتاب کا عشق اور دوسرے علم کا عشق۔ یہ بات ہم بھی کہتے ہیں اور یہی بات اردو کے بزرگ شاعر اور خدمت گزار سکندر علی وجد نے بھی کہی جنہوں نے برس ہا برس بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رفاقت میں کام کیا اور گاؤں گاؤں' قریہ قریہ جا کر پرانی کتابیں جمع کیں' کہنے لگے:

''کتاب کے عشق کے بغیر کتاب محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اب اس میں شک نہیں کہ ہماری کتابیں ملک سے باہر چلی جا رہی ہیں مگر مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ وہاں انہیں بڑی احتیاط اور اہتمام سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ فیومی گیشن ہوتا ہے' ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں رکھا جاتا ہے۔ اب ہمارے پاس کتابوں میں نیم کے پتے رکھ دیتے ہیں' اس لیے اور کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تو کتابوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ عشق چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ علم کا بھی عشق چاہیے مگر اب علم بھی نہیں ہے اور عشق بھی نہیں ہے۔ ہمارے گھروں میں ریڈیو ہے' ٹی وی ہے' سب کچھ ہے لیکن کتاب نہیں ہے''۔

اسلام آباد کی کانفرنس' پاکستان میں لائبریری آرڈیننس نافذ کرنے کی تجویز' دہلی میں دستاویزوں کے تحفظ کی تعلیم و تربیت اور کلکتہ میں ہر وہ کتاب جمع کرنے کی تگ و دو کہ جو کسی بھی چھاپے خانے سے نکلے' یہ سب ایک نئی امنگ کی پہلی پہلی علامتیں ہیں۔ حکومتیں' ادارے اور افراد اب بے عملی کی اندھیری کوٹھری سے آگہی اور دانش کے روشن دالان میں نکل آئے ہیں مگر یہ محض آغاز ہے ابھی بہت سا کام ہونا ہے' مریض کی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈے پھاہے رکھنے کی ضرورت ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اس گفتگو کو ہم گوپی چند نارنگ کی اس بات پر ختم کرتے ہیں:

''بالعموم کتب خانوں کی جو حالت ہے' چند ایک کو چھوڑ کر' وہ زیادہ اچھی نہیں کیونکہ ان سے استفادہ کرنے والے اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ کہنے کو تو ہر شخص محقق ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہتا ہے مگر اس کے لیے جس لگن کی ضرورت ہے وہ لوگوں میں دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرف آپ جتنی بھی توجہ دلائیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہ صرف ایک طرح کی خدمت ہوگی بلکہ انتباہ بھی ہوگا اور قومی ذخیرے' خواہ کسی ملک کے ہوں' کسی قوم کے ہوں' کسی معاشرے کے ہوں' کسی زبان کے ہوں وہ پوری بنی نوع انسان کی میراث ہیں اور ان کے تحفظ کے لیے جتنی بھی کوشش آپ کر سکیں اور اس سلسلے میں جتنی بھی بیداری آپ پیدا کر سکیں' میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی مستحسن اقدام ہوگا۔''

روشنیوں کے جزیرے

کہتے ہیں کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب برصغیر کے ہر صاحبِ حیثیت کے دولت خانے میں تین خانے اور ہوا کرتے تھے۔ مہمان خانہ' اسلحہ خانہ اور کتب خانہ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف حیدر آباد دکن میں چار ہزار کتب خانے تھے مگر ہوا کے رخ بدلے تو وقت کے جھونکے ان دولت خانوں کو سوکھے پتوں کی طرح اڑا کر لے گئے۔

بوسیدہ مکانوں کے اندر اور ٹوٹی پھوٹی چھتوں کے نیچے ایسے کئی بزرگوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنی آنکھوں سے کتابوں کے یہ شاندار ذخیرے دیکھے تھے' اور پھر ان ہی کی آنکھوں نے سونے چاندی کے پانی سے لکھی ہوئی کتابیں ٹھیکروں کے بھاؤ بکتے یا وقت کے ہاتھوں مٹتے دیکھیں۔ ان کتابوں کی باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔

کتابوں اور کتاب گھروں کی یہ تیرتھ یاترا مجھے سندھ سے دکن تک اور بہار سے راجستھان تک لیے پھری اور یہ میرا شرف کہ مجھے طرح طرح کے کتب خانے دیکھنا نصیب ہوئے۔ جہاں کہیں میں خود نہ جاسکا' ان کا احوال دوسروں کی زبانی سنا۔ اس کے باوجود کتنے ہی ایسے گوشے باقی رہ گئے جہاں نہ تو میری رسائی ہوئی نہ وہ میرے علم میں آئے اس لیے مجھے اعتراف ہے کہ میری فہرست ادھوری ہے۔ یوں بھی اس گفتگو کا مقصد برصغیر کے تمام کتب خانوں کی مکمل فہرست ترتیب دینا نہیں بلکہ اس بنیادی سوال کا جواب ڈھونڈنا ہے کہ ہماری کتابیں کس حال میں ہیں اور اگر وہ حال اچھا نہیں تو پھر اس کا کیا علاج ہو؟

تو آیئے ایک سرسری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ برصغیر میں کتابیں اور دستاویزیں کہاں کہاں محفوظ ہیں۔
سب سے پہلے تو وہ سرکاری کتب خانے آتے ہیں جن میں قومی اور پبلک کتب خانے دونوں ہی شامل ہیں۔ سرکار انگلیشیہ نے جب برصغیر میں بڑے کتب خانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی نگاہ ہندوستان کے دو

بازوؤں پر پڑی۔ بڑی لائبریریوں کے قیام کے لیے ایک جانب انہوں نے کلکتہ کو چنا اور دوسری طرف لاہور کو۔

کلکتہ کا کتب خانہ بالآخر ہندوستان کا قومی کتب خانہ قرار پایا اور اگرچہ اس کی راہ داریوں میں بھی یہی شکایت گونجا کرتی ہے کہ ناشر اپنی کتابیں وہاں نہیں بھیجتے اور کتابیں لازماً جمع کرانے کے قانون کی پروا نہیں کرتے، پھر بھی ایشیا کا یہ بھاری بھرکم کتب خانہ مسلسل پھلتا پھولتا نظر آتا ہے۔

لاہور میں شاہ جہاں کے دور کی شاندار بارہ دری کو کتب خانہ میں تبدیل کیا گیا اور اس طرح پنجاب پبلک لائبریری وجود میں آئی جس کے قیام کو ایک سو سال پورے ہو رہے ہیں مگر بد قسمتی سے یہ سو سال کی داستان مسلسل زوال کی داستان ہے۔

اسی قسم کے کتب خانوں میں کراچی کی لیاقت میموریل لائبریری، خیر پور اور بہاولپور کے کتب خانے اور لاہور کی سردار دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری بھی آتی ہے اور اسی شہر لاہور کو اب چند نئے اور بڑے کتب خانوں کے قیام کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

ہندوستان یوں تو کتب خانوں سے بھرا پڑا ہے مگر مشرقی علوم کے تعلق سے وہاں کم سے کم تین ایسے سرکاری کتب خانے ہیں جن پر ہندوستان جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ ان میں اوّل خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ہے۔ اس کے بعد یوپی کی رام پور رضا لائبریری ہے اور تیسرا شاندار ذخیرہ جو ابھی تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے راجستھان کے شہر ٹونک میں ہے اور وہ ہے ''عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ''۔

ان سب میں علامہ اقبال کے بقول، خزانے علم و حکمت کے اور کتابیں اپنے آباء کی بھری پڑی ہیں اور منتظر ہیں کہ کوئی قدر شناس آئے اور ان جوہروں سے اپنے علم کا دامن بھر بھر کر لے جائے۔ ان اداروں کی داستانیں بھی ہمارا موضوع بنیں گی۔

اس کے بعد آتے ہیں تعلیمی اداروں کے کتب خانے۔

ویسے تو ہر کالج اور یونیورسٹی سے ایک نہ ایک کتب خانہ منسوب ہے مگر پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی اور ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے ایسے ہیں کہ دیکھا ہی کیجیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں اردو کے استاد اور محقق گوپی چند نارنگ کہتے ہیں:

''علی گڑھ میں تین یا چار کلکشن بہت ہی زبردست اہمیت کے ہیں۔ سبحان اللہ کلکشن، حبیب گنج کلکشن، سید سلیمان ندوی کلکشن اور ابھی حال ہی میں اردو کے بہت بڑے اسکالر اور محقق اور ناقد پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی بہت سی کتابیں اور مخطوطات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحویل میں دے دیئے گئے اور اس ذخیرے کا نام مسعود حسن رضوی کلکشن ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کے اس ذخیرے سے نہ صرف علی گڑھ کے طالب علم

استفادہ کرتے ہیں بلکہ ملک کے کونے کونے سے بھی لوگ وہاں پہنچتے ہیں اور دوسرے ممالک سے بھی''۔

تعلیمی اداروں کے بعد وہ کتب خانے آتے ہیں جو تحقیقی اداروں سے وابستہ ہیں اور خوش قسمتی سے برصغیر میں جیسے جیسے تحقیقی ادارے کھل رہے ہیں اسی رفتار سے جدید کتب خانے بھی قائم ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد بہت بڑی ہے۔ پاکستان میں اقبال اکیڈمی' بھارت میں غالب اکیڈمی اپنے اپنے کتب خانے قائم کر رہی ہیں۔تحریک آزادی کے موضوع پر علیحدہ تحقیقی کتب خانے کھل رہے ہیں اور ادبیات کے عنوان سے کتنے ہی کتب خانے وجود میں آئے ہیں۔

عجب اتفاق ہے کہ سندھ کے قدیم شہر حیدر آباد کو تین بڑے تحقیقی اداروں اور ان سے منسلک کتب خانوں کی ملکیت کا اعزاز حاصل ہے۔اول جامعہ سندھ کا انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی ہے' دوئم سندھی ادبی بورڈ ہے جس کے پاس نایاب کتابوں کا خزانہ ہے اور ان سے بھی بڑھ کر حیدر آباد سندھ کی شاہ ولی اللہ اکیڈمی جہاں تاریخ اسلام پر اتنی نایاب کتابیں جمع ہیں کہ اس خطے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے بارے میں خود اس کے نگراں علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی نے بتایا:

''ہمارے ہاں ایک بہت بڑی لائبریری ہے جس میں مطبوعہ کتابوں کے علاوہ خطی کتابیں بھی ہیں جونا گڑھ کے قاضی اختر صاحب برصغیر کے بہت بڑے عالم تھے ان کی وفات کے بعد ان کی جتنی نادر کتابیں تھیں وہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے حاصل کر لیں۔اس لحاظ سے اسلام پر' تاریخ اسلام پر ہمارے ادارے میں جو کتابیں ہیں اور ان میں انگریزی کتابیں بھی شامل ہیں وہ اتنی نایاب ہیں کہ ان سے استفادے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں''۔

تحقیقی اداروں کے بعد آرکائیوز اور میوزیم آتے ہیں۔آرکائیوز اصولاً دفتر خانے ہوتے ہیں اور سرکاری دستاویزیں محفوظ رکھنے کے ذمے دار ہوتے ہیں لیکن برصغیر کے کئی آرکائیوز پرانی کتابوں کو بھی اپنے تحفظ میں لے رہے ہیں۔نئی دہلی میں ہندوستان کا قومی آرکائیوز اب بھی قدیم کتابیں خرید کر محفوظ کر رہا ہے اور سب سے بڑا کام حیدر آباد دکن میں آندھرا پردیش کے صوبائی آرکائیوز نے کیا ہے۔اس نے کتب خانہ آصفیہ کی تمام قلمی کتابیں اپنی تحویل میں لے کر محفوظ کر لی ہیں ورنہ ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو چھپی ہوئی کتابوں کا ہو رہا ہے۔اس آرکائیوز کے متعلق ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب نے ہمیں بتایا جو کتابوں اور کاغذوں کے اس سمندر میں بارہا غوطے لگا چکے ہیں۔انہوں نے کہا:

''حیدر آباد میں آندھرا پردیش کے آرکائیوز میں دو کروڑ کاغذ تو مغلوں کے ہیں اور ان کے علاوہ بہمنیوں کے' قطب شاہوں' عادل شاہوں اور بری شاہوں اور انگریزوں کے بہت سے کاغذ ہیں۔قدیم ترین کاغذ تو اس دور

کے ہیں جو ابھی تیمور زندہ تھا اور فیروز شاہ بہمنی کا فرمان 1406ء کا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ قدیم ترین کاغذ ہے جو سرکاری اداروں میں محفوظ ہے۔''

جہاں تک میوزیم کا تعلق ہے' کراچی اور دہلی کے قومی عجائب گھروں میں قلمی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور برصغیر کے کتنے ہی عجائب گھروں میں تاریخ کی ایسی ایسی دستاویزیں محفوظ ہیں جن کی قیمت لگانا مشکل ہے لیکن چھپی ہوئی اور قلمی کتابوں کا ایک عظیم الشان خزینہ حیدر آباد دکن کے سالار جنگ میوزیم میں ہے جسے وہ اتنے اہتمام سے رکھتے ہیں کہ دوسرے عجائب گھروں کو ان کی تقلید کرنی چاہیے۔

اس کے بعد ہم آتے ہیں ذاتی یا نجی کتب خانوں کی طرف۔ ان کے مالک تین قسم کے ہیں: ایک تو وہ جو خاندانی ذخیروں کو لیے بیٹھے ہیں۔ ایک وہ جنہیں علم اور کتابوں سے لگاؤ ہے اور ساتھ ہی صاحب حیثیت بھی ہیں اس لیے ان کے گھر کتابوں سے بھر گئے اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو صاحب حیثیت نہیں مگر کتابوں کے پیچھے دیوانے ہیں اور نہ معلوم کیسے کیسے جتن کر کے اپنے کتب خانوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔

یہ ذاتی یا نجی کتب خانے دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کے دروازے بند ہیں اور دوسرے وہ جو ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔

ذاتی کتب خانوں کے بعد وہ ادارہ آتا ہے جس کا تذکرہ اگرچہ آخر میں مگر جو اولیت کے معاملے میں بہت اوپر ہے اور وہ ہیں ہماری مسجدیں' مدرسے اور خانقاہیں۔ دینی مدارس تو پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نامور مدرسے رہے ایک طرف بعض چھوٹے مدرسوں میں بھی علم و حکمت کے ایسے ذخیرے موجود ہیں کہ باہر کی دنیا کو ابھی ان کا علم ہی نہیں۔ مسجدوں کا عالم یہ ہے کہ چونکہ ان میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی تھا اس لیے ان کے اپنے کتب خانے بھی تھے۔ ان کی فہرست طویل ہے لیکن بھوپال کی تاج المساجد اور بمبئی کی جامع مسجد میں کتابوں کا بے مثال ذخیرہ موجود ہے' مگر یہ کتابیں برسوں استفادہ کرنے والوں کی راہ تکا کرتی ہیں اور کوئی نہیں آتا۔ ان کی قدر نہ کی گئی تو ان کتابوں کی باتیں محض خوابوں کی باتیں رہ جائیں گی۔

اولیاء اور صوفیا نے مشائخ اور درویشوں نے بھی جہاں علم کے موتی لٹائے وہیں خود بھی علم کے خزانے بٹورے اور کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے جمع کیے۔ ایسے ہی ایک ناقابل یقین کتب خانے کے بارے میں اجمیر کے ڈاکٹر ظہور الحسن شارب نے بتایا:

''گجرات کے اندر شاہ وجیہہ الدین صاحب ایک بہت ہی مشہور درویش ہوئے ہیں وہ درویش ہی نہیں تھے بلکہ بڑے عالم بھی تھے اور خود ایک مدرسہ چلاتے تھے۔ ان کے پاس کتابوں کا ذخیرہ اٹھارہ ہزار بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگ ستائیس ہزار کہتے ہیں۔ بہر حال یقینی بات ہے کہ ایک اچھا خزانہ تھا اور سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی

کہ یہ کتب خانہ صرف دو موضوعات پر مشتمل تھا یعنی تفسیر اور حدیث۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کتابیں چاہے اٹھارہ ہزار ہوں یا اس سے بھی کم صرف دو موضوعات پر اتنا بڑا ذخیرہ ہونا بہت بڑی بات ہے''۔

برصغیر کی درگاہوں میں تکیوں اور گدیوں میں اَن گنت کتابیں موجود ہیں لیکن اب ان میں سے زیادہ تر کتب خانوں کی حالت اچھی نہیں۔ کتنے ہی کتب خانوں کو تو پیروں فقیروں کی دعائیں بھی نہ بچا سکیں۔ شاید ان کی دعاؤں میں اک ذرا سا پھیر تھا۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ خدا ان کتابوں کو بچائے' انہیں کہنا چاہیے تھا کہ خدا اپنے بندوں کو یہ کتابیں بچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

علم کی وادی

جن دنوں میں برصغیر کے کتب خانوں کے سفر پر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا ان ہی دنوں ایک روز فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی۔ میں نے فیض صاحب کو بتایا ہم لوگ ایک دستاویز ترتیب دیں گے جس میں دیکھیں گے کہ ہماری قدیم کتابیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ میری بات سن کر فیض صاحب بہت خوش ہوئے۔ میں نے بتایا کہ برصغیر میں ایک مہینے کام کروں گا ان کے سننے میں مغالطہ ہوا۔ فیض صاحب ایک مہینے کو ایک سال سمجھے اور کہنے لگے کہ اتنے بڑے کام کے لیے ایک سال تو بہت کم اور نا کافی ہوگا۔

وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔

میں نے پاکستان اور ہندوستان کا سفر شروع کیا تو احساس ہوا کہ چھوٹے بڑے کتب خانوں کا حال جاننے کے لیے ایک سال نہیں ایک عمر درکار ہے اور عمر بھی ایسی کہ جس میں ہر برس کے پچاس ہزار دن ہوں۔

بہر حال میں جتنی بھی معلومات سمیٹ سکتا تھا بٹور لایا۔ اب میرے سامنے کتابوں اور کتابچوں کے نوٹس، خطوط، مضامین اور تراشوں کے انبار لگے ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں تمام کروں۔

ہر چند کہ وہ زمانہ گیا جب گھر گھر کتب خانے ہوا کرتے تھے اور امراء کو تو جانے دیجیے، غریب غربا تک جیسے بھی بن پڑتا تھا، گھر کے ایک طاق میں کچھ نسخے ضرور سجالیا کرتے تھے اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب خوش نویس راتوں کو چراغ کی روشنی میں کتابیں نقل کر کر کے بیچا کرتے تھے ان دنوں کوئی گھر کتابوں سے خالی نہ تھا مگر جب راتوں رات چھاپ کر ارزاں کتابوں کے ڈھیر لگا دینے والا چھاپہ خانہ آیا تو کتابوں کا ذوق جاتا رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے جانے کی آہٹ ابھی نہیں گئی ہے اس کے قدموں کی چاپ سننے میں آ رہی ہے اس کے پیروں کے نقش ماند سہی مگر باقی ہیں۔ تو آیئے آج وہی نقوش دیکھنے چلیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' پورے برصغیر کی بات کرنے کے لیے تو ایک عمر بھی ناکافی ہوگی اس لیے ہم یوں کرتے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کا ایک ایک صوبہ چن لیتے ہیں تاکہ اس علاقے کے گھر گھر اور گاؤں گاؤں جاکر پرانی کتابوں کا سراغ پانے کی کوشش کریں۔ ایک ایک صوبہ چننے کا مقصد یہ ہے کہ اسے نمائندہ مان کر دوسرے علاقوں کی صورتحال کا بھی اندازہ ہو جائے۔ اس مفصل گفتگو کے لیے ہم نے پاکستان کا صوبہ سندھ اور ہندوستان کی ریاست مدھیہ پردیش چنی ہے جس کا علاقہ بھوپال' برصغیر میں مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست رہا ہے اور جہاں علم کا چرچا رہا ہے اور حکمت کی سرپرستی ہوئی ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں حیدرآباد دکن کا انتخاب کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے احوال کو ہم نے ایک باب میں مقید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ دکن کا تذکرہ تو پوری گفتگو میں پھیلا ہوا ہے اور قدم قدم پر اس کا نام آنا ناگزیر ہے۔

دو صوبوں کی گرد چھاننے اور اس میں دبی ہوئی اپنے آباء کی کتابیں دیکھنے کے بعد ہم برصغیر کے دوسرے علاقوں کا رخ کریں گے شہروں اور بستیوں میں جائیں گے۔ تعلیمی اداروں کے اندر بھی چلیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیسے کیسے عجائبات روپوش ہیں کہ عرف عام میں جنہیں کتاب کہا جاتا ہے۔

سندھ کی بات کرتے ہوئے ہم نے کراچی کو الگ رکھا ہے۔ اس کے لیے ہم ایک علیحدہ باب قائم کریں گے۔ سندھ کی اس گفتگو میں ڈاکٹر غلام علی الانا کا نام بار بار آئے گا جو سندھ کے بڑے عالم محقق اور سندھی ادب اور لسانیات کے استاد ہیں اور اس تحقیق کے وقت انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی کے نگراں تھے۔ ان کا تعاون نہ ہوتا تو یہ مقالہ بھی نہ ہوتا۔

انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی میں صرف سندھ کے موضوع پر پچپن ہزار کتابیں جمع ہیں اور ان میں زیادہ تر اب نایاب ہیں۔ جام شورو میں سندھ یونیورسٹی سے وابستہ اس ادارے میں بہت بڑے کتب خانے کے ساتھ ساتھ قدیم کتابوں کو محفوظ کرنے کے وہ تمام انتظامات بھی ہیں جو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

وہاں فیومی گیشن چیمبر ہیں جن کے اندر رکھی ہوئی پرانی کتابوں کے کیڑے مکوڑے ختم ہو جاتے ہیں' سلین نکل جاتی ہے اور پرانا کاغذ گلنے سے بچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کتاب کے ہر ورق پر جھلی جیسا کاغذ چڑھانے کا بندوبست بھی ہے جس کے بعد پرانا کاغذ صدیوں کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے۔ انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی میں کتابوں کے ایک ایک صفحے کی چھوٹی سی فلم بنانے کے جدید انتظامات بھی ہیں اور اس مائیکرو فلمنگ کے علاوہ ہر صفحے کی فوٹو کاپی اتارنے کے آلات بھی لگے ہیں۔ پرانی کتابوں کی از سر نو جلد بندی ہوتی ہے اور قابل ذکر اور قابل دید کتابوں کو شوکیسوں میں سجا دیا جاتا ہے اور وہیں اس کتاب کے بارے میں تمام ضروری معلومات تحریر کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ وہاں سیکڑوں کتابیں ایسی ہیں کہ انہیں پڑھنا تو رہا ایک طرف' دیکھنا ہی نصیب ہو

جائے تو خود کو خوش نصیب جانیے۔

انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی کو ملا کر صوبے میں اس نوعیت کے تین ادارے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر الانا نے بتایا:

''ان میں سب سے سینئر ادارہ سندھی ادبی بورڈ ہے۔ اس کے بعد ہے انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی۔ اس کے بعد ہے خیر پور کی پبلک لائبریری۔ ان تینوں اداروں میں جہاں تک قلمی نسخوں کا تعلق ہے تو سندھی ادبی بورڈ اول ہے۔ وہاں سب سے پرانے نسخے ہیں کیونکہ وہ پرانا ادارہ ہے۔ اس کے بعد سندھ کے عالموں اور فاضلوں کی لکھی ہوئی کتابیں سندھالوجی میں ملیں گی لیکن خیر پور کی لائبریری بھی کم نہیں کیونکہ تعداد کے لحاظ سے وہاں قلمی نسخے زیادہ ہیں۔ اس لائبریری میں تالپور حکمرانوں کے زمانے کا کلکشن موجود ہے۔ وہاں خود سندھ کے متعلق کتابیں اتنی زیادہ نہیں لیکن برصغیر کے قلمی نسخے وہاں زیادہ ہیں۔''

حیدرآباد سندھ کے بڑے کتب خانوں میں شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی لائبریری قابل ذکر ہے اس میں خود شاہ صاحب کی تصانیف کے علاوہ اسلام اور تاریخ اسلام پر مخطوط اور مطبوعہ کتابوں کا ایسا نادر ذخیرہ محفوظ ہے کہ یورپ اور امریکہ میں تحقیق کرنے والوں کو بھی اپنی بات تکمیل کو پہنچانے کے لیے وہاں جانا پڑتا ہے۔

سندھ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے اور وہاں پانچ چھ سو قلمی کتابیں موجود ہیں جن کی اب مائیکروفلم بنائی جا رہی ہے تاکہ ان کا عکس ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد میں صوبائی میوزیم کے پاس بھی بہت سی نایاب کتابیں ہیں اور انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو قلمی نسخوں کا ایک ذخیرہ حال ہی میں خریدا ہے۔ حیدرآباد شہر میں پاکستان نیشنل سنٹر کا کتب خانہ بھی ہے جہاں تقریباً بیس ہزار نئی اور پرانی کتابیں ہیں۔

ان سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے بعد اب ہم آپ کو سندھ کے ایک عجیب وغریب کتب خانے کے بارے میں بتاتے ہیں جو پتھریلے میدانوں اور سنگلاخ چٹانوں کے پچھواڑے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹری محمد کبیر میں ہے اور علم کا یہ ذخیرہ دنیا کی نگاہوں سے روپوش ہے۔

کوٹری محمد کبیر نواب شاہ میں نیشنل ہائی وے پر ایک قدیم گاؤں ہے جہاں کبھی مخدوم شیخ محمد کبیر اور سخی شیخ اللہ یار کی درسگاہیں تھیں اور اب ان دو بزرگوں کی درگاہیں ہیں۔ وہاں پرانی درسگاہوں کی کتابیں ابھی تک موجود ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر الانا نے کہا:

''وہاں میری نظر میں سب سے زیادہ قیمتی اور نایاب کتابیں مخطوطوں کی شکل میں پائی جاتی ہیں۔ کوٹری محمد کبیر ایک ایسا گاؤں ہے جہاں کے بزرگوں نے صدیوں پہلے کتابیں اکٹھا کرنا شروع کی تھیں اور مشہور ہے کہ

سندھ کے بزرگ شاعر شاہ لطیف بھی وہاں گئے تھے اور انہوں نے بھی کچھ کتابیں دیکھی تھیں"۔

کوٹری محمد کبیر کے اس کتب خانے کے بارے میں پہلے یہ سنا جاتا تھا کہ وہاں کتابوں کی حالت اچھی نہیں کیونکہ وہاں قدیم کاغذوں کے تحفظ کا انتظام نہیں۔ لیکن اب سنا جاتا ہے کہ درگاہوں کے سجادہ نشین پیرزادہ میاں غوث محمد گوہر ان نایاب کتابوں کو بچانے کی کوشش کررہے ہیں اور اس کام کے لیے متعلقہ اداروں کی مدد لے رہے ہیں۔

کوٹری محمد کبیر کے بعد سندھ میں نایاب کتابوں کا دوسرا بڑا ذخیرہ بھی ایک چھوٹے سے قصبے منصورہ میں ہے۔ منصورہ کا دینی علوم کا مدرسہ' جہاں یہ کتابیں موجود ہیں، عالم اسلام میں بہت مشہور ہے چنانچہ اس میں مشرق وسطی اور شمالی افریقہ سے طالب علم بڑی تعداد میں آتے ہیں۔

ایسا ہی ایک اور ذخیرہ سندھ کے ایک گاؤں پیر جھنڈو شریف میں تھا۔ وہاں برطانیہ' ترکی اور مصر کے کتب خانوں سے نایاب کتابوں کی نقلیں منگوا کر جمع کی گئی تھیں۔ اب یہ کتب خانہ نیشنل میوزیم کو دے دیا گیا ہے۔

سندھ میں دو اور ایسے پرانے مدرسے ہیں جہاں دینیات اور سیرت پر نایاب کتابیں اور مخطوطے پائے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر الانا نے بتایا:

"خیر پور میرس کی طرف ایک چھوٹا سا شہر ہے ٹھیڑی جہاں جامعہ دارالہدیٰ ہے۔ اس مدرسے میں بھی پانچ چھ سو قلمی نسخے موجود ہیں جو دینیات اور فقہ پر بڑی نادر کتابیں ہیں۔ اسی طرح اگر ہم زیریں سندھ میں جائیں تو وہاں میرپور بٹھورو کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے "چھبان" جس کو سومرو بھی کہتے ہیں وہاں بھی ایک پرانا مدرسہ ہے۔ اس میں قدیم زمانے کے سندھی کاتبوں کی لکھی ہوئی فقہ اور سیرت پر کتابیں ملتی ہیں۔

اسی طرح ضلع ٹھٹھہ کے ایک گاؤں چوہڑ جمالی میں شاہ بندر ادبی سوسائٹی کا کتب خانہ اور اسی علاقے میں مدرسہ ہاشمیہ سجاول کا کتب خانہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ضلع سانگھڑ کے دیہات میں بھی دو بڑے کتب خانے ہیں ان میں سے ایک چوٹیاریوں اور دوسرا اڈھروں نامی گاؤں میں ہے جو سادات کا بڑا کتب خانہ تصور کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد سے تقریباً بیس میل دور ٹنڈو سائیں داد میں سرہندی بزرگوں کا ایک بڑا کتب خانہ ہے۔ جس میں مخطوطات اور نوادر کا ذخیرہ ہے۔

لاڑکانہ کے قریب پیر جو گوٹھ میں پیر نجیب اللہ شاہ کا کتب خانہ موجود ہے جو بڑا علمی سرمایہ ہے۔ اسی نام کا ایک گاؤں خیر پور میرس کے قریب ہے۔ جس میں پیر صبغت اللہ شاہ مرحوم کی کتابیں اور ان کے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کتابیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ زیادہ تر کتابیں حدیث' تاریخ' صرف ونحو' فقہ اور لسانیات کے موضوع پر

ہیں۔ دو بڑے دینی مدرسے کراچی کے علاقوں کھڈہ اور ملیر میں موجود ہیں جو مخطوطوں اور نایاب کتابوں سے مالا مال ہیں۔ ایک اور مدرسہ بھی ہے جو کہ جناب مولانا عبدالحق ربانی کا ہے اور یہ میر پور خاص کے قریب واقعہ ہے، وہ بھی قیمتی کتابوں سے خالی نہیں ہے۔

یہ تھا سندھ کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور مدرسوں میں موجود تاریخ کے شہ پاروں کا ایک جائزہ۔ بلاشبہ اس میں کئی نام اور مقام شامل ہونے سے رہ گئے اور یہ مقام معذرت طلبی کا ہے۔

آئندہ باب میں ہم نایاب کتابوں کے ان ذخیروں کی بات کریں گے جو صوبہ سندھ کے امیروں، رئیسوں، عالموں، سیاست کاروں اور غریبوں کے گھروں میں، ان کی اپنی ذاتی ملکیت میں موجود ہیں۔ ان میں سے کئی کتب خانے تباہ ہو رہے ہیں، کئی کو بچا لیا گیا ہے اور کتنے ہی کتب خانے ایسے ہیں جنہیں ہم اور آپ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ البتہ جانتے ہیں کہ وہاں تاریخ کی ایسی ایسی نادر یادگاریں موجود ہیں کہ انہیں خدانخواستہ نقصان پہنچا تو پھر تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

عبادت جاری ہے

سندھ کے دیہات اور قصبوں کی بات تو ہو چکی جہاں دینی مدرسوں میں قدیم کتابوں کے ایسے ایسے خزانے موجود ہیں کہ اگر انہیں بچایا نہ گیا تو ہمارے یہی آب وہوا جن میں ہم جیتے ہیں ہمارے بزرگوں کی ان کتابوں کو مار ڈالیں گے۔

آج کے سفر میں ہم سندھ کے مختلف گھرانوں میں چلیں گے اور دیکھیں گے کہ لوگ اس ورثے کو کس طرح سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کتنے ہی ذخیرے خاک ہوئے اور خواب ہوئے اور ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جنہیں ہم دیکھ بھی نہیں سکتے۔

سندھ ہمیشہ علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کے حکمران عالموں کی سرپرستی کرتے رہتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف مدرسے بلکہ اہل علم کے گھرانے اور حکمران خاندانوں کی ڈیوڑھیاں آج بھی ایسی ایسی کتابوں سے بھری پڑی ہیں جن کے صفحوں پر حکمت ودانش بکھری ہوئی اور وہ بھی سونے چاندی کے پانی میں گھلی ہوئی۔

مغلوں کے عہد میں شہر ٹھٹھہ اتنا خوش حال اور آسودہ تھا کہ نہ صرف برصغیر بلکہ سمندر پار سے بھی ارباب علم وقلم کھنچے کھنچے ٹھٹھہ چلے آتے تھے لیکن جب مغلوں کا عروج اور دریا کا کنارہ، دونوں اس شہر کو چھوڑ گئے تو یہ کھنڈر بن کر رہ گیا۔

ایسے کھنڈروں کو کریدنے اور گزرے وقتوں کی یادگار نشانیاں نکال کر لے جانے والوں کی کمی نہیں چنانچہ ٹھٹھہ لٹتا رہا۔ کہتے ہیں کہ وہاں بعض گھرانوں میں قدیم کتابیں اب بھی موجود ہیں مگر وہ لوگ اپنا یہ ورثہ دکھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

یہ احتیاط مجھے کئی جگہ نظر آئی۔ میں حیدرآباد پہنچا تو ڈاکٹر غلام علی الانا نے مجھ سے کہا:

''آپ حیدرآباد آئے ہیں تو کوشش کریں کہ یہاں جو تالپور حکمران تھے ان کے گھرانے کا ذخیرہ

دیکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر کے اس علاقے میں سابق حکمرانوں کا سب سے اچھا ذخیرہ تالپور گھرانے میں ہے۔ نادر شاہ جب سندھ میں آئے اور کلہوڑہ خاندان سے صلح کی تو وہ صلح نامہ قرآن شریف پر لکھا گیا تھا۔ قرآن کا وہ نسخہ وہاں موجود ہے۔ اسی طرح خطاطی کے بے مثال نمونے' قرآن مجید کے نسخے اور مصوری کا جو ذخیرہ تالپور خاندان کے پاس ہے وہ کسی اور کے پاس نہیں۔ مگر وہ دکھانے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ایک دفعہ ان پر کچھ ایسی سختی ہوئی جس کے بعد وہ محتاط ہو گئے۔ اسی طرح خیر پور کے حکمران خاندان کے پاس بھی اچھے ذخیرے ہیں''۔

حیدرآباد شہر کے اندر نایاب کتابوں کا ذخیرہ مرزا عباس علی صاحب کے پاس ہے۔ وہ خود تو رئیس اور مالدار نہیں لیکن ان کے خاندان کا تعلق تالپور حکمرانوں سے رہا ہے چنانچہ ان کے پاس خود تالپور کللکشن کی اور تالپوروں کے وزیروں کی کتابیں موجود ہیں۔ مرزا عباس علی صاحب کے بارے میں بھی یہی روایت ہے کہ کچھ بااثر لوگوں کو ان کے کتب خانے کا علم ہوا تو انہوں نے کتابیں حاصل کرنے کے لیے مرزا صاحب پر طرح طرح سے دباؤ ڈالا۔ ڈاکٹر الانا کا خیال ہے کہ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی کتابیں عام لوگوں کو نہیں دکھاتے لیکن شہر کے کچھ اہل علم حضرات کو یہ کتابیں اتنے اشتیاق سے دکھاتے ہیں کہ تھیلا بھر کر خود ان کے گھروں پر پہنچ جاتے ہیں جہاں بعض اوقات رات رات بھر مطالعہ جاری رہتا ہے۔

مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے ڈیرے میں قیمتی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے لیکن وہ باہر والوں کے لیے کھلا ہوا نہیں۔

یہ تو خیر پورے پورے کتب خانوں کی بات تھی۔ آیئے اب آپ کو ایک تنہا کتاب کا قصہ سنائیں جس کے راوی ڈاکٹر الانا ہیں:

''جاتی ایک قصبہ ہے' وہاں ایک درگاہ ہے جس میں ایک پرانا قلمی نسخہ موجود ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ کتاب درگاہ سے منسوب ہے۔ لہٰذا وہ کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتے حالانکہ وہاں کہ سجادہ نشین میرے بہت اچھے دوست ہیں' بالکل بھائیوں کی طرح ہیں۔ میں جاتا ہوں تو بڑی عزت کرتے ہیں لیکن جوں ہی اس قلمی نسخے کی بات آتی ہے تو اس کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ایسی دوستی ہم نہیں رکھتے''۔

اس معاملے میں ایک بڑا فراخ دل گھرانا شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کا ہے۔ مرحوم کی کتابوں کا ذخیرہ ان کے بیٹے کے پاس محفوظ ہے جسے عام قاری دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں سیکڑوں کتابیں خود مرزا صاحب کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ سندھ کا قدیم گھرانا ہے جس میں میرزا خسرو بیگ تالپوروں کے وزیر رہے ہیں۔ اس وجہ سے وہاں نادر کتابیں موجود ہیں۔

ذاتی کتب خانوں میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کا ذخیرہ بے مثال ہے' جید عالم ہیں' اسی مناسبت

سے نہایت اعلیٰ مخطوطے جمع کیے ہیں جو نادرونایاب ہیں۔

سندھ کے مشہور شہر سیہون میں حکیم محمد مراد صاحب کے پاس قدیم کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ ویسے تو وہ طبیب ہیں لیکن ان کا تعلق عباسی خاندان سے ہے اور ممکن ہے کہ بزرگوں سے چلتی ہوئی کتابیں حکیم صاحب تک پہنچی ہوں۔

لاڑکانہ کے قریب شہر وگھن ہے اور اس کے پاس پیر جو گوٹھ۔ اس میں جو پیر صاحب ہیں ان کا تعلق راشدی خاندان سے ہے اور پیر پگاڑا کے عزیز بھی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر الانا نے بتایا:

''پیر صاحب کی عمر بیانوے برس ہے لیکن وہ بالکل جوانوں جیسے نظر آتے ہیں۔ ان کا مطالعہ آج تک جاری ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے سال تک انہوں نے پینتالیس سو کتابیں پڑھی ہیں جو اب انہوں نے ایک جگہ عطیے کے طور پر دے دی ہیں۔ لیکن اب بھی ان کے پاس تقریباً پندرہ سو قلمی نسخے ہیں''۔

اسی طرح شہر مورو ہے جو قومی شاہرہ پر واقع ہے۔ مورو کے قاضی اپنے فتوے کی وجہ سے مشہور ہیں' وہاں بھی نایاب کتابیں ملتی ہیں۔ ٹنڈو محمد خاں سے بیس پچیس میل جنوب مغرب میں ایک گاؤں ہے کھوڑوا۔ وہاں ایک عالم وفاضل گھرانہ ہے جس کا کتب خانہ نورنگ زادہ کے کتب خانے کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بھی نہایت بیش قیمت کتابیں موجود ہیں۔

سندھ کے شہر شکار پور کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ اب وہ اپنی عظمت سے محروم ہے لیکن گزرے دنوں کی نشانیوں سے محروم نہیں۔ شکار پور میں بہت سے لوگوں کے پاس نایاب کتابیں موجود ہیں مثلاً ایک علوی گھرانا اور ایک صدیقی گھرانا ہے جن کے اپنے کتب خانے ہیں۔ اسی طرح وہاں ایک چشتی گھرانے کی کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔

لیکن اس علاقے کے جس شاندار کتب خانے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ گڑھی یاسین کا کتب خانہ ہے جو بہت اچھی حالت میں ہے اور جہاں کتابیں جدید طریقے سے خانہ بند کر کے رکھی گئی ہیں۔ اس کی عمارت بطور خاص تعمیر کرائی گئی تھی جہاں تحقیق کرنے والوں کے لیے طعام و قیام کا بندوبست بھی تھا۔ برصغیر میں اس قسم کے رہائشی کتب خانے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ خیر پور میں لطف اللہ بدوی مرحوم کے بیٹوں کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے جس میں نایاب قلمی نسخے شامل ہیں۔ نصر پور' ہالہ اور سیہون سندھ کے قدیم شہر ہیں جہاں بعض گھرانوں میں پرانی کتابیں ملتی ہیں۔ اسی طرح روہڑی اور بھکر میں کچھ ایسے خاندان ہیں جو عہد معصومین سے وہیں آباد ہیں۔ ان کے پاس قدیم کتابیں یقیناً ہوں گی۔ سکھر میں کچھ گھرانے ہیں جن میں خلافت تحریک کے پمفلٹ' پوسٹر اور خطوط محفوظ ہیں۔

میر پور بھورو میں ایک صاحب کے پاس پرانے اخباروں کا ذخیرہ ہے۔ ٹھل، جیکب آباد اور میر پور خاص میں بھی اخباروں کے بہت اچھے ذخیرے ہیں۔

شہر بدین میں مولانا احمد ملھا کا، جنہوں نے قرآن کا منظوم ترجمہ کر کے نام پایا' قدیم کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ بدین میں مولوی عبداللہ صاحب کے پاس بھی ان کا ذاتی کتب خانہ ہے۔ ٹنڈو محمد خان میں دو بھائی تھے' سلطان علی اور محب علی' ان دونوں کو نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کا لاجواب ذخیرہ موجود ہے اور اب اسے محفوظ کیا جا رہا ہے۔ وہیں سندھ کے میروں کی کتابوں کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔ خیر پور میرس میں ڈاکٹر گھومرو کے ذاتی کتب خانے میں بیش قیمت کتابیں ہیں۔ اب ان کی مائیکروفلم بنائی جا رہی ہے۔ حیدر آباد میں محمد خاں غنی صاحب کا کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے۔

ذاتی کتب خانے قائم کرنے والوں میں دور حاضر کی کتنی ہی شخصیتیں قابل ذکر ہیں۔ مولانا قاسمی کا ذکر تو ہو چکا ان کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ' جی ایم سید' میر علی احمد تالپور' شیخ ایاز' پیر حسام الدین راشدی' مولانا امین اللہ علوی اور محمد سعید صدیقی صاحبان نے اس راہ میں بڑا کام کیا ہے۔

اب آخر میں آپ کو سندھ کے ایک ایسے ذاتی کتب خانے کی داستان سنائیں جو کتابوں سے مالا مال تھا مگر خاک میں پنہاں ہو گیا۔ اس کا احوال بھی ڈاکٹر غلام علی الانا نے سنایا:

''کندھ کوٹ سے دس میل جنوب میں ایک گاؤں ہے غوث پور۔ اس میں اللہ جوایو شاہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے سسر دھنی بخش کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ ان کے پاس کافی کتابیں تھیں' تقریباً چار پانچ ہزار قلمی نسخے اور مطبوعہ۔ ان میں قلمی نسخے زیادہ تھے۔ میں کتابوں کو بچانے کے لیے چار پانچ سال سے ان سے خط و کتابت کر رہا تھا' اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ حال ہی میں میرا جانا ہوا تو ان کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ وہ لائبریری اب ختم ہو گئی ہے کیونکہ کچھ بڑے لوگ ان سے کتابیں لے گئے ہیں۔ کچھ ہمارے اثر ورسوخ والے افسران لے گئے ہیں لیکن اس وقت بھی ان کے پاس دو ہزار کتابیں ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو دیکھا کہ کتابیں ایسی حالت میں تھیں کہ مجھے رونا آ گیا۔ میں بات نہیں کر سکا۔ ان کا بیٹا نوجوان ہے جو کتابوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اس نے مجھے اجازت دی کہ سائیں آپ کو جتنی کتابیں چاہئیں آپ لے جائیں کیونکہ ہم سے یہ سنبھالی نہیں جاتیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان کتابوں پر اتنی گرد تھی اور اتنی دیمک تھی کہ میرے ساتھ دس افراد تھے جنہیں میں نے حویلی کی چھت پر بلایا جہاں وہ کتب خانہ ہے' تو چار پانچ افراد گرد صاف کرنے میں لگے اور چار پانچ دیمک کو ہٹانے میں مصروف ہوئے اور خود میں کتابوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے صرف چھتیس کتابیں چھانٹ سکا۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہوگی''۔

اب صورتحال یہ ہے کہ جتنی پرانی کتابیں ہیں اوپر سے دیکھنے میں وہ چاہے کتنی ہی اچھی حالت میں نظر آئیں لیکن اگر ان کی دیکھ بھال جدید سائنسی طریقوں سے نہیں ہو رہی ہے تو سمجھئے کہ ان کا چل چلاؤ قریب ہے۔ جو لوگ باشعور ہیں وہ اپنی اس میراث کو جو درحقیقت پورے معاشرے کی میراث ہے' اب ایسے اداروں کو دے رہے ہیں جہاں ان کتابوں کو مٹنے سے بچایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کراچی کے نیشنل میوزیم اور حیدرآباد کے سندھی ادبی بورڈ' انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی اور صوبائی میوزیم میں کافی کتابیں پہنچ رہی ہیں۔

انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی نے کتابوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کے جدید سائنسی طریقے اختیار کیے ہیں۔ دسمبر 1981ء میں وہاں قدیم دستاویزوں کے تحفظ کا ایک تربیتی کورس اور سیمینار ہوا تھا۔ جس میں تربیت دینے کے لیے لندن سے انڈیا آفس لائبریری نے اپنا ایک ماہر حیدرآباد میں بھیجا تھا۔

ان تمام کوششوں کو دیکھ کر ان لوگوں کی ہمت بندھی ہے جو اپنے باپ دادا کی کتابیں کہیں محفوظ کرانے کے خواہش مند تھے۔ سندھ کے بڑے عالم دُر محمد شاہ مرحوم کا پورا کتب خانہ ان کے رشتے داروں نے انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی کو دے دیا۔ اسی طرح پروفیسر محبوب علی چنا' محمد ہاشم گزدر' غلام رضا بھٹو' پیر سعید حسن اور علی اکبر عباسی مرحومین کی کتابوں کے ذخیرے بھی اسی ادارے کو بطور عطیہ مل گئے ہیں۔

حصول علم عبادت ہے اور خوش نصیب ہیں وہ مرنے والے جن کی عبادت' ان کے اس جہاں سے اٹھ جانے کے بعد بھی جاری رہے گی۔

بکھرے ہوئے ورق

جب میں نے ہندوستان کا سفر شروع کیا' فروری کا مہینہ تھا اور دھوپ بدن کو بھلی لگ رہی تھی۔ میں دلی سے چلا اور ہاپوڑ اور امروہہ کے راستے مراد آباد پہنچا۔ میری ڈائری میں وہاں اپنے کچھ سامعین کے پتے لکھے تھے۔ میں نے نئی بستی میں محمد سلیم صدیقی صاحب کے دروازے پر دستک دی اور اگلے ہی لمحے گرمجوشی اور تپاک کا دروازہ کھل گیا۔

باتوں باتوں میں مَیں نے بتایا کہ میں ہندوستان میں پرانی کتابیں اور کتب خانے دیکھنے آیا ہوں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ صدیق صاحب اٹھے' اپنی الماری سے دو پرانے قلمی نسخے نکالے اور میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کہنے لگے کہ یہ بزرگوں کی نشانی ہے یہاں ضائع ہو جائے گی آپ اسے ہم غریبوں کے تحفے کے طور پر قبول کر لیں گے تو یہ کتابیں محفوظ رہ جائیں گی۔

ان میں سے ایک مولوی عظمت اللہ صاحب کا ''قیامت نامہ'' تھا جو تقریباً ایک سو ساٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا' یہ اس کی ڈیڑھ سو سال پرانی نقل تھی۔ اس میں قیامت کے متعلق تمام حدیثیں نظم کر دی گئی ہیں۔ دوسری کتاب ''فراست نامہ رنگین'' ہے جو ایک سو ستر سال پہلے لکھی گئی تھی۔۔ اس کا موضوع ہے ''گھوڑوں کی مختلف بیماریاں اور ان کا علاج''۔ اور لطف یہ ہے کہ سب کچھ منظوم ہے۔

اس ساری گفتگو کا مقصد صرف اتنی سی بات کہنا ہے کہ ہندوستان میں اردو' فارسی اور عربی سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس میں بزرگوں کے زمانے کی ایک نہ ایک پرانی کتاب موجود نہ ہو۔ میری اس رائے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر یہ ساری کتابیں یکجا ہو جائیں تو دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ وجود میں آ جائے۔

ہندوستان کی سرزمین پر بکھرے ہوئے تاریخ کے ان اوراق پر کوئی تفصیل سے بات کر سکے یہ ناممکن ہے۔ بے شمار گھروں میں آج تک ایسے صندوق اور ایسے کمرے بند پڑے ہیں جن کے اندر پرانی کتابیں بھری

ہوئی ہیں اور ہماری نسل کو ان کا خیال تک نہیں چنانچہ ان پر دیمک کی نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں۔

پاکستان میں کتابوں کے مختلف اور معلوم ذخیروں کا ایک خاکہ پیش کرنے کے لیے ہم نے نمونے کے طور پر صوبہ سندھ چنا تھا۔ ہندوستان میں ہم نے مدھیہ پردیش اور خصوصاً اس علاقے کو منتخب کیا ہے جہاں حیدر آباد کے بعد مسلمانوں کی دوسری بڑی ریاست قائم تھی یعنی بھوپال۔

بھوپال کالی داس کی سرزمین ہے اور راجا بھوج سے لے کر سلطان جہاں بیگم اور نواب محمد حمید اللہ خان کے دور تک یہاں علم و حکمت کا اتنا چرچا رہا ہے کہ اس علاقے کے بال بال میں آج بھی دانش و آگہی کے موتی پروئے ہوئے ہیں۔ ہر گھر میں علم ہے ہر گھر میں کتابیں ہیں اور جہاں نہیں ہیں وہاں یقین ہے کہ ہوں گی ضرور خود گھر والوں کو علم نہیں۔

بھوپال میں سب سے بڑا کتب خانہ ''مولانا آزاد لائبریری'' ہے جس کی بات ذرا تفصیل سے اور بعد میں کریں گے۔ پہلے آئیے بھوپال کے دوسرے کتب خانوں کی سیر کریں۔ شہر میں مولانا محوی صاحب کے پاس عربی اور فارسی کے قلمی نسخوں کا بڑا ذخیرہ تھا جو انہوں نے بڑے جتن کر کے جمع کیا تھا لیکن مولانا صاحب کے آخری ایام میں لوگ ان سے جو کتابیں عاریتاً لے گئے تھے ان میں سے بیشتر کتابیں پھر کبھی واپس نہیں آئیں۔ اس پر مولانا محوی صاحب بہت مایوس ہوئے اور وصیت کر کے گئے کہ جو ذخیرہ بچ رہا ہے وہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ منتقل کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے مرحوم کی وصیت پر عملدرآمد ہو گیا۔

بھوپال کے چند ایک قابل ذکر کتب خانوں کے متعلق وہاں اردو کے محقق، نقاد اور استاد جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے بتایا:

''یہاں نواب صاحب کی لائبریری میں دیوان غالب کا نسخہ بھوپال تھا جو وہاں سے لاپتہ ہو گیا ہے معلوم نہیں کہاں گیا ہے۔ اس لائبریری میں عربی اور فارسی کے بہت سے نسخے تھے لیکن ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں خود تلاش میں ہوں کہ وہاں سے کچھ چیزیں دستیاب ہو جائیں لیکن وہ یا تو کسی صندوق میں بند ہیں یا کسی ایسے کمرے میں بند ہیں جہاں کسی کی آمد و رفت نہیں ہے۔ خیال ہے کہ دیوان غالب کا نسخہ بھوپال بھی وہیں کہیں موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اسماعیل صاحب ہیں، بہت ضعیف ہیں، ان کا کتب خانہ بھوپال کتاب گھر مشہور رہا ہے۔ انہوں نے واقعی بہت محنت کی، اردو سے عشق کیا، رسائل کا، قلمی نسخوں کا اور پرانی مطبوعات کا بہت اچھا ذخیرہ ان کے ہاں تھا لیکن ان کی بیماری نے ان کے کتب خانے کو تقریباً ضائع کر دیا''۔

گوالیار میں حضرت محمد رضا غمگین تھے۔ ان کے پاس غالب کے خطوط تھے اور بہت سے قلمی نسخے تھے، خصوصاً فارسی کے۔ غمگین مرحوم کا سارا ذخیرہ اب ان کے عزیزوں کے پاس ہے لیکن یہ خبر نہیں کہ کس حال

میں ہے۔

بھوپال کے اہل علم حضرات کا تذکرہ ہو تو نواب صدیق حسن خان مرحوم کا ذکر کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ انہوں نے اپنے دور کے قریب قریب ہر علم پر کل ملا کر دو سو سے زیادہ کتابیں لکھی تھیں اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر ہی نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نے ان سے شادی کی تھی۔ کہتے ہیں کہ نواب صدیق حسن خان کی ذاتی لائبریری بہت بڑی تھی جس میں بہت سے ایسے قلمی نسخے تھے کہ جن کی نقل کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کا خاندان بھوپال کے نور محل میں آباد ہے ممکن ہے کہ علم کے بہت سے جواہر ابھی وہاں محفوظ ہوں۔

بھوپال اپنی داستان کے ایک کردار کو عرصے تک نہیں بھلا سکے گا اور وہ تھے ایم عرفان مرحوم جن کے بارے میں خان شاکر علی خان نے کہا تھا کہ ایم عرفان جن ہے۔ انہیں علم اور اردو دونوں سے غضب کا لگاؤ تھا اور ان دونوں کی خاطر رات دن کام کیا کرتے تھے۔ وہ شاہی محل کے فوٹو گرافر تھے اور کتابوں کے ایک بڑے ذخیرے کے مالک تھے۔ اب ان کے صاحبزادے ایم عمران صاحب اس کتب خانے کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

جہانگیر آباد میں رمزی ترمذی صاحب کا گھرانا بھی اہل علم کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بزرگوں کے زمانے سے کتابوں کا ایک ذخیرہ چلا آتا ہے۔

بھوپال میں رام سہائے صاحب کا گھرانا بھی بڑا نامور ہے۔ رام سہائے صاحب بفضلہٖ ابھی زندہ ہیں اور 90 سال سے اوپر ان کی عمر ہے۔ بھوپال کی تاریخ پر جیسی ان کی نگاہ ہے شاید ہی کسی کی ہو۔ ان کے پاس فارسی مخطوطے ہیں جن کا موضوع حسن و عشق نہیں بلکہ سائنس اور ریاضی ہے۔ (یہ تحریر سنہ ۱۹۸۲ء کی ہے)

اسی طرح قاضی وزیر الحسینی صاحب، صدرالدین صاحب اور حکیم قمر الحسن صاحب کے نام نامی بھی آتے ہیں۔ ان بزرگوں نے قدیم کتابوں کو اولاد کی طرح بڑے چاؤ سے رکھا۔ حکیم قمر الحسن صاحب نامور طبیب تھے، ندیم کے ایڈیٹر تھے اور بہت اچھے انشا پرداز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں بہت سے مخطوطے ہیں جن میں علم طب کی کتابیں بھی ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو کے خالد عابدی صاحب نے مجھے بتایا کہ شمالی مدھیہ پردیش کے علاقے ریوا کی سنٹرل لائبریری میں کچھ فارسی مخطوطے ہیں جو غالباً تاریخ سے متعلق ہیں اور تحقیق کرنے والوں کی نگاہ سے ابھی تک چھپے ہوئے ہیں۔

والیان ریوا کے گھرانے میں جو کتابیں دیکھی گئی ہیں وہ غالباً اکبر اعظم کے زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ اسی دور میں وہاں مولوی رحمان علی خان اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اور انہوں نے تاریخ بندیل کھنڈ لکھی تھی جس کی دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخ کی یہ کتاب بیک وقت فارسی اور بگھیلی زبانوں میں لکھی گئی تھی۔ بگھیلی بہت حد

تک اودھی سے ملتی جلتی ہے اور اس زبان میں بہت کم کتابیں ملتی ہیں، لیکن مولوی رحمان علی خان کی خود اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی یہ کتابیں ریوا میں موجود ہیں۔

اندور میں ایک قدیم لائبریری ہے جس کا سن تعمیر اور نام دونوں دلچسپ ہیں۔ یہ لائبریری 1857ء میں قائم ہوئی تھی اور نام اس کا وکٹوریہ لائبریری ہے۔ یہ نام تو باقی نہیں رہے گا مگر خدا کرے وہ قدیم قلمی کتابیں محفوظ رہ جائیں جو ایک الماری میں بند پڑی ہیں۔

اسی طرح اُجین میں بھی ایک کتب خانہ ہے جو پنڈت پربھولال اشعر نے قائم کیا تھا بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ وہاں بھی بہت سی قلمی کتابیں رکھی ہیں۔

البتہ مدھیہ پردیش کی ایک لائبریری ہے جسے ہندوستان کی تاریخ کے طالب علم فراموش اور نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔ یہ کتب خانہ سیتا مئو میں ہے اور کہتے ہیں کہ مغل دور کے روزنامچوں اور اخباروں کا وہاں ایسا ذخیرہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی اور خوش قسمتی سے اس ذخیرے کی دیکھ بھال بھی ہو رہی ہے۔

سیتا مئو چھوٹا سا دور دراز مقام ہے جو ہندوستان کے نقشے پر مشکل ہی سے نظر آتا ہے لیکن جنہیں علم کی جستجو ہے وہ اسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ چنانچہ تحقیق اور مطالعہ کرنے والوں کے رہنے سہنے کا سارا بندوبست بھی کتب خانے ہی میں ہے۔ میرے علم میں ایسا ایک اور اقامتی کتب خانہ سندھ کے مقام گڑھی یاسین میں ہے۔ سیتا مئو کے اس کتب خانے کے بارے میں تاریخ کے استاد حامد جعفری صاحب نے بتایا:

''سیتا مئو کی لائبریری کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رگھوویر سنگھ صاحب ہیں اور ان کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں بڑے اعلیٰ پائے کے محقق ہیں۔ ان کی لائبریری میں مخطوطات اور ترجمے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان کے شوق کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے مولوی اور منشی مقرر کیے ہیں اور مترجم مقرر کیے ہیں۔ خود بھی بہت اچھی فارسی جانتے ہیں۔ ان کے ہاں ترجمے کا کام مسلسل جاری ہے۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہے انہوں نے عبدالحمید لاہوری کا پادشاہ نامہ ترجمہ کرایا ہے جو اب شائع ہونے والا ہے۔ ان کی لائبریری سے استفادہ کرنے والوں میں سر جادو ناتھ سرکار سے لے کر ڈاکٹر ایشوری پرشاد، بنارسی پرشاد، ڈاکٹر بنی پرشاد، غرضیکہ ہندوستان کا کوئی بڑا مورّخ ایسا نہیں کہ جس نے سیتا مئو کے اس ذخیرے سے فیض حاصل نہ کیا ہو''۔

یہ تو تھی ایک بڑے کتب خانے کی بات۔ بھوپال کے قریب ایک مقام آشٹا ہے۔ وہاں ایک صاحب ہیں جو پیشے کے لحاظ سے درزی ہیں۔ ان کے پاس کتابوں کا پرانا ذخیرہ موجود ہے جس میں فارسی کی بہت سی کتابیں شامل ہیں۔ اسی طرح اسی پیشے کے ایک اور صاحب کی بات خالد عابدی صاحب نے بتائی:

''اندور میں ایک خیاط ہیں ان کے پاس میں نے گیتا کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے جو بلا مبالغہ ایک ہزار

صفحوں پر ہے۔اس کا رسم الخط فارسی لیکن اس کی زبان اودھی ہے۔ وہ اس کو فروخت کرنا چاہتے ہیں''۔

اندور ہی میں ایک اور صاحب ہیں عبدالنور دانش ان کے پاس اکبر نامہ کا ایک بہت بڑا نسخہ موجود ہے۔جنھوں نے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ کتاب کی لمبائی چوبیس انچ سے کم نہیں۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اکبر نامہ ابوالفضل کے بھائی نے نقل کیا تھا۔اس پر طلائی کام ہے اور خود نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے۔عبدالنور دانش صاحب اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں اور اس کی قیمت چھ ہندسوں میں مانگتے ہیں۔اگر یہ روایت صحیح ہے کہ اکبر نامہ کا یہ نسخہ تیس سال میں مکمل ہوا تھا تو یہ قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔

کتابوں کا فروخت ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔اس طرح کتابیں قدردانوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں اور ان کی عمر بڑھ جایا کرتی ہے۔لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جب کتابوں کے یہ قدرداں کتاب بیچنے والے کی مجبوریوں اور پریشانیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور جن جواہرات کا مول لگانا مشکل ہے وہ کوڑیوں کے مول خرید لے جاتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں ایسے نیلام گھر اور ایسے ادارے نہیں جو کتاب کے مالک کو صحیح دام دلاسکیں۔چنانچہ ہندوستان میں ایک بات میں نے جگہ جگہ سنی اور بھوپال میں خالد عابدی صاحب نے بھی کہی:

''ایک صاحب ہیں، میں ان کا نام تو نہیں لے سکتا کیونکہ وہ میرے ہم جماعت رہے ہیں۔میں نے ان کو دیکھا ہے شاید وہ مفلسی کے عالم میں ہیں وہ اکثر تھیلے کے اندر کچھ پرانے مخطوطے ایک صاحب کو فروخت کرتے رہتے ہیں۔بہر حال یہ سلسلہ جاری ہے''۔

یہ سلسلہ بھی جاری ہے اور مدھیہ پردیش کی سرزمین پر پھیلی ہوئی کتابوں کا تذکرہ بھی ابھی جاری ہی۔ آئندہ باب میں علم و دانش کے ان اونچے نیچے راستوں پر ہم اور آگے چلیں گے۔

آثار اچھے نہیں

ہم نے ایک الماری سے ٹین کا بنا ہوا لمبا سا گول ڈبا نکالا۔ زمانے کی ٹھوکریں کھا کھا کر وہ ڈبا جگہ جگہ سے پچک گیا تھا۔ اسے کھولا تو اندر سے لپٹا ہوا وزنی کاغذ نکلا۔ گول تھان کی طرح لپٹے ہوئے کاغذ کو کھولنا شروع کیا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ کم سے کم اٹھارہ فٹ لمبا' دبیر اور مضبوط کاغذ تھا جس پر کسی خطاط نے برسوں سر جھکا کر نہایت خوش خط قلم سے پھول بوٹوں اور قرآن کی آیتوں کے درمیان ایک شجرہ لکھا تھا جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہندوستان کے کسی رئیس پر ختم ہوتا تھا۔ پورا تھان کا تھان بالکل صحیح سلامت تھا مگر افسوس کہ آخری ایک انچ کا وہ ٹکڑا پھٹ کر ضائع ہو چکا تھا جس پر غریب خطاط نے اپنے چھوٹے سے قلم سے باریک حروف میں خود اپنا نام اور کتابت کی تاریخ لکھی ہوگی۔ خوش خطی کا یہ شاہکار بھوپال کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔

ہمارا یہ باب بھی مدھیہ پردیش اور خصوصاً بھوپال کے لیے مخصوص ہے۔ شمالی ہندوستان کے ہنگاموں سے دور وہ پرسکون خطہ جسے علامہ اقبال نے غور و فکر کے لیے ساز گار پایا۔ بھوپال میں اسی مناسبت سے علامہ اقبال لائبریری قائم ہوئی تھی اور اب تک موجود ہے۔ کتابوں کا ایک اور بڑا ذخیرہ خان باسط صاحب کے پاس ہے وہ عبیدیہ مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور غالباً نواب صدیق حسن خان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے گھر میں ایک بڑا کمرہ ہے جس میں پرانی کتابیں قرینے سے چُنی ہیں۔

قاری شفیق الحسن خان صاحب پرانی کتابوں کے تاجر ہیں اور خود غالب کے ہاتھ سے لکھے ہوئے دیوان کا وہ نسخہ بھوپال انہوں نے ہی دریافت کیا تھا جس کے ساتھ پھر غریب کی جورو والا معاملہ ہوا اور جس کی مٹی دربدر ہوئی۔ قاری صاحب کے پاس بھی نادر اور نایاب کتابیں موجود ہیں' مثلاً ایک کتاب کے بارے میں انہوں نے بتایا:

''اعجاز خسروی حضرت امیر خسرو کی فارسی تصنیف ہے۔ اگرچہ طبع ہو چکی ہے لیکن میرے پاس اس کا جو نسخہ ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ حضرت امیر خسرو کے ہاتھ کا ہو کیونکہ ایک جگہ اس کے سن کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ سو کچھ ہجری میں لکھی گئی اور یہ سن حضرت امیر خسرو کی وفات سے پہلے کا ہے''۔

بھوپال میں گوبند پرشاد آفتاب کی شخصیت بھی نامی گرامی تھی۔ علاقہ بے نظیر کے قریب ان کی رہائش گاہ تھی جس میں ان کا ذاتی کتب خانہ موجود ہے۔ گوبند پرشاد آفتاب صاحب نے خود بھی بہت سی کتابیں اردو میں لکھی تھیں جن میں ڈراما اور ناول سے لے کر معدنیات کے علم اور زمین دوز پائپ بچھانے کے فن تک ہر موضوع شامل تھا۔ ان کتابوں کے قلمی نسخے ابھی تک موجود ہیں۔

اسی طرح بھوپال کے ایک اور محقق سلیم حامد صاحب تھے جن کے پاس بہت سی چھپی ہوئی اور ہاتھ سے لکھی ہوئی قدیم کتابیں موجود تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے کتب خانے پر آج کل قفل پڑا ہوا ہے۔

نواب صدیق حسن مرحوم کے خانوادے میں علی حسن مجیب صاحب موجود ہیں جن کے پاس کئی ایسے نسخے محفوظ ہیں جن پر سونے کے پانی سے منقش حاشیے بنائے گئے ہیں اور جو خوش قسمتی سے اچھی حالت میں ہیں۔

بھوپال کے ایک اور گھرانے کے متعلق عربی کے استاد مسلم سلیم صاحب نے بتایا:

''یہاں ایک مفتی گھرانا ہے جس نے کافی کام کیا ہے اور اُس کے دو بڑے عالم گزر چکے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کے زمانے میں مولوی ذوالفقار احمد صاحب تھے جنہوں نے نواب صاحب کی فرمائش پر دس یا بارہ کتابیں لکھیں۔ دوسرے مفتی خلیل اللہ صاحب تھے جنہوں نے صرف ونحو کے موضوع پر چار جلدوں میں محاسن الادب لکھی اور دو جلدوں میں لسان العرب لکھی۔ وہ خود خطاط تھے اور بڑی محنت سے کتابیں لکھتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے مخطوطے اچھی حالت میں موجود ہیں''۔

بھوپال کے محلہ ہوا محل میں ایک نابینا طبیب حکیم مشفق محمد خان صاحب رہتے ہیں۔ ان کے پاس بھوپال کی تاریخ کا وہ نسخہ موجود ہے جو خود ریاست بھوپال کے بانی نواب دوست محمد خان نے لکھا تھا۔ ایک اور کتب خانے کے بارے میں عربی کے استاد عقیل احمد صاحب نے بتایا:

''وکیل غیاث الدین صاحب بھوپال میں تھے اور گوہر گنج میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی کتابوں کا ذخیرہ ایک کمرے میں بند پڑا ہے اور ان کے انتقال کے بعد غالباً وہ کمرہ کھلا ہی نہیں ہے۔ اب خدا جانے کتابوں کی کیا حالت ہوگی''۔

خالد عابدی صاحب جن کا تعلق آکاش وانی اندور سے ہے، لکھنے پڑھنے اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں اور خود بھی قدیم کتابیں جمع کرتے ہیں۔ ان کے پاس فقہ ہندی اور تذکرہ مراۃ الخیال کے قلمی نسخے ہیں اور شاعری پر

کچھ رسالے ہیں جن میں مختلف اشکال سے فن عروض سمجھایا گیا ہے۔ کچھ کتابیں طب کے بارے میں ہیں اور گزشتہ صدی کی ایک فارسی شاعرہ کا تذکرہ ہے جو غالباً بھوپال میں رہتی تھیں۔

بھوپال میں قلمی نسخوں اور پرانی کتابوں کے دو بڑے ذخیرے دینی مدرسوں میں ہیں۔ ان میں سے ایک جامعہ اسلامیہ عربیہ ہے اور دوسرا دارالعلوم تاج المساجد ہے۔ تاج المساجد میں جو برصغیر کی بڑی مسجدوں میں شمار ہوتی ہے، دو کتب خانے ہیں جن میں سے ایک طالب علموں کے لیے مخصوص ہے اور دوسرا عام پڑھنے والوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ سیفیہ کالج اور حمیدیہ کالج میں بھی بعض بہت نادر کتابیں موجود ہیں۔

اور آخر میں ہم آتے ہیں بھوپال کی مولانا آزاد لائبریری کی طرف جو تواراروڈ پر ایک وسیع میدان کے درمیان بنی ہوئی ہے۔ یہ کتب خانہ ریاستی دور کی شاندار سرخ عمارت میں قائم ہے۔ گنبدوں، برجوں اور محرابوں کی اس عمارت کے بڑے حصے میں تو آجکل جدید کتابیں رکھی گئی ہیں البتہ ایک بہت بڑے بغلی کمرے میں دیوار کے ساتھ ساتھ یورپین طرز کی شانداراور بھاری بھرکم الماریاں کھڑی ہیں جن کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کتب خانے کے لیے ریاست حیدرآباد نے بطور خاص پیش کی تھیں۔ کسی زمانے میں یہ دیوقامت الماریاں قدیم کتابوں اور دستاویزوں سے بھری پڑی تھیں مگر اب ان کی حالت اس بوڑھے کی ہے جس کے دانت جابجا ٹوٹ گئے ہوں۔

جب یہ شاندار کتب خانہ قائم ہوا تو اس کا نام نواب محمد حمید اللہ خان صاحب کے نام پر حمیدیہ لائبریری رکھا گیا۔ پھر وقت بدلا تو سنٹرل لائبریری کہلائی اور چونکہ وقت کا بدلنا کبھی رکتا نہیں، اب مولانا آزاد لائبریری کے نام سے بس اتنی ہی مشہور ہے کہ جب رکشہ والے سے کہا کہ مولانا آزاد لائبریری لے چلو تو وہ حیرت سے منہ تکنے لگا۔

یہ کتب خانہ بڑے چاؤ سے قائم ہوا ہوگا کیونکہ اس میں والیان ریاست کے ذاتی ذخیروں سے نکال کر بے مثال نادر نسخے رکھے گئے۔ مثلاً نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی ایک کتاب میں جہاں دنیا بھر سے بیش قیمت کتابیں حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے وہیں ان کتابوں کا احوال بھی ہے جن پر انہیں ناز تھا مثلاً صحیح بخاری کی ایک شرح جو تین جلدوں میں تھی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام کتابیں ابھی تک محل میں ہوں گی یا ادھر اُدھر ہو گئی ہوں گی مگر میں نے محض آزمائش کی خاطر دیکھا تو صحیح بخاری کی اس شرح کو جو خطاطی کا بے مثال نمونہ ہے وہیں مولانا آزاد لائبریری کے اسی بغلی کمرے میں پایا۔

لیکن گزشتہ تین دہائیوں کے دوران ان کتابوں پر جو کچھ بیتی اسے سن کر دل دُکھتا ہے۔ اس کتب خانے میں فارسی کے تقریباً نو سو نسخے تھے اب سات سو ہیں۔ عربی کی یہاں ساڑھے پانچ سو کتابیں تھیں اب ساڑھے تین سو ہیں۔ اردو کے ایک سو چون مخطوطے تھے اب ایک سو تیس ہیں۔ تو پھر یہ چار سو کتابیں کیا ہوئیں؟ رجسٹر میں ان کے ناموں کے

آگے لکھا ہے:LOST/MISSING۔

کسی نے کہا کہ یہاں محمود حسن صاحب اس کتب خانے کے نگراں ہوا کرتے تھے اور یہ نگرانی انہیں باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی۔ وقت سے پہلے ریٹائر کر دیئے گئے۔ انہیں علم ہوگا علم کی اس بے قدری کا۔ یہ سن کر میں محمود حسن صاحب کی تلاش میں نکلا۔ وہ ایک چھوٹی سی پرسکون مسجد میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے میں نے کہا کہ یہ گمشدہ کتابیں کہاں گئیں؟ کہنے لگے:

''جاتیں کہاں؟ انہیں دیمک کھا گئی۔ بعض کتابیں اتنی خستہ ہوگئیں کہ ان لوگوں نے جلا دیں۔ میرے پاس ایک اخبار رکھا ہے جس میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ کتابیں 1974ء میں جلائی ہیں''۔

قاری شفیق الحسن صاحب بھوپال کے پرانے باشندے ہیں اور اس کتب خانے کو اکثر دیکھتے رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں کچھ کہیے:

''میں نے ایک مرتبہ وہاں کی کتابوں کا سرسری طور سے جائزہ لیا تو بہت سے مخطوطے خراب حالت میں تھے اور بعض اچھی حالت میں بھی تھے۔ ویسے وہاں پر اب جو لائبریرین ہیں وہ حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں کہ یہ کتابیں محفوظ رہیں۔ اس سے پہلے وہاں کافی قلمی کتابیں ضائع ہوگئیں۔ بعض دیمک کی نذر ہوگئیں۔ چنانچہ انہیں نذر آتش کر دیا گیا اور بعض کی حالت اتنی خراب ہوئی کہ انہیں ناقابل استعمال قرار دے کر جلا دیا گیا۔ اس کے باوجود وہاں موجودہ حالت میں کافی قلمی کتابیں موجود ہیں''۔

مولانا آزاد لائبریری کے بارے میں خود وہاں کے عملے نے اچھی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ جو کچھ بچ گیا ہے غنیمت ہے مگر یہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ کوئی مداخلت کرے اور اس خزانے کو بچا لے۔

مگر آثار اچھے نہیں اور بھوپال شہر میں اس عظیم الشان لائبریری اور اس کی شاندار عمارت کے متعلق کچھ اور ہی سننے میں آرہا ہے۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا:

''یہ بھی سنتے جایئے کہ اس لائبریری کو اس عمارت سے ہٹایا جا رہا ہے۔ اکثر و بیشتر سنا جاتا ہے کہ اب اس شاندار عمارت میں شاید پولیس کا دفتر یا ایسا ہی کوئی محکمہ قائم کیا جائے گا''۔

بیشک۔ سب کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔

بے خبری کا سلسلہ

میں رام پور کے بس اسٹینڈ پر اپنی بس سے اترا تو فوراً ہی بہت سے سائیکل رکشا والے میری طرف لپکے۔ ان میں سے جو شخص شکل وصورت سے ذہین اور سمجھدار لگا میں نے اس کا رکشا چنا۔

''کہاں جائیں گے صاحب؟'' اس نے ایسے اعتماد سے پوچھا جیسے وہ رام پور کے چپے چپے سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔

میں نے اتنے ہی اعتماد سے جواب دیا: ''رضا لائبریری'' رام پور رضا لائبریری''۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا'' وہ کہاں ہے صاحب؟''

یہ تو خیر رکشہ والے کی بات تھی وہ اگر مشرقی علوم کے' برصغیر کے سب سے بڑے کتب خانوں میں سے اس ممتاز کتب خانے کو نہیں جانتا تو کوئی بڑی حیرت کی بات نہیں۔

مگر بے خبری کا یہ سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔

میں اودھ سے لیکر دکن تک اردو' فارسی اور عربی کے بہت سے عالموں اور محققوں سے ملا۔ ان میں سے دو یا تین کے سوا کسی نے رام پور رضا لائبریری کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ تھوڑے ہی فاصلے پر لکھنؤ ہے جہاں دو نوجوانوں کو گزشتہ صدی کے اردو شاعروں پر تحقیق کرتے ہوئے پایا اور وہ آج تک رام پور نہیں گئے تھے۔

اور جب میں خود اس کتب خانے کی عمارت میں داخل ہوا تو صرف ایک اسکالر کو مغل دور کی تصویروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے پایا۔ وہ ایک انگریز خاتون تھیں جو لندن سے چل کر رام پور پہنچی تھیں۔

اس عظیم الشان کتب خانے کا آغاز رام پور کے پہلے والیُ ریاست نواب فیض اللہ خان کی ذاتی لائبریری سے ہوا۔ یہ دو سو سال پرانی بات ہے۔ پھر مختلف نوابوں کے دور آتے گئے اور سبھی علم کے اس خزانے میں اضافہ کرتے گئے۔ اس کے بعد 1857ء کا ہنگامہ ہوا جس میں دلی اور لکھنؤ دونوں ہی لٹے۔ اس وقت اہل کمال برہنہ سر

برہنہ پا بھاگے مگر چلتے چلتے گھر کی دو چار قیمتی کتابیں اور تصویریں سینے سے لگا کر لے گئے۔ان دنوں غالب کے شاگرد نواب یوسف علی خان رام پور کے والی تھے۔انہوں نے اہل کمال اور ان کے اثاثوں دونوں کی پذیرائی کی اور پھر ان کے بیٹے نواب کلب علی خان کے دور تک رام پور میں کتابوں اور تصویروں کے اعلیٰ نمونوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ پھر آخری شاندار دور نواب رضا علی خان کا تھا جو 1930ء میں حاکم ہوئے اور کہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں رام پور کی لائبریری کتابوں اور خصوصاً مخطوطوں سے پٹ گئی۔

اس کتب خانے کی خوش نصیبی تھی کہ ان ہی دنوں مولانا امتیاز علی عرشی صاحب مرحوم اس کتب خانے کے ناظم مقرر ہوئے۔علم سے ان کو جو عشق' کتابوں سے لگاؤ اور تحقیق سے جو والہانہ محبت تھی وہ کس سے چھپی ہے؟ عرشی صاحب نے اپنی باقی تمام زندگی اس کتب خانے میں گزار دی اور آج بھی کتب خانے کی عمارت کے سائے میں آنکھیں مونڈے سو رہے ہیں۔ بعد میں ان کی جگہ ان کے بیٹے اکبر علی خان عرشی زادہ نے سنبھالی۔

اس روز ملے تو بتانے لگے کہ اس کتب خانے اور عرشی صاحب مرحوم کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی ہر بات' ہر تجویز مانی جاتی تھی۔ جب کبھی انہوں نے نواب صاحب یا اس وقت کے وزیر اعلیٰ کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب کے سامنے کوئی تجویز رکھی' فوراً مان لی گئی۔ چنانچہ اکبر علی خان عرشی زادہ کے بقول۔

''آج یہ لائبریری ہندوستان کی نہ صرف قدیم ترین لائبریری ہے بلکہ اپنے ذخیرے کے اعتبار سے شاید سب سے زیادہ اہم لائبریری ہے۔ ہمارے پاس اس وقت پندرہ ہزار کے قریب مخطوطے ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد عربی کی ہے۔یعنی تقریباً چھ ہزار مخطوطات۔اتنے ہی لگ بھگ فارسی کے ہیں۔تقریباً دو ہزار اردو کے ہیں اس کے علاوہ پشتو اور ترکی مخطوطات بھی ہیں''۔

اب صورتحال یہ ہے کہ جو لوگ قرآن' حدیث' فقہ' اسلامی تاریخ' مسلم تہذیب اور دنیائے عرب کے دوسرے موضوعات پر تحقیق کرنا چاہیں انہیں رام پور تو جانا ہی پڑے گا۔ یا اگر آپ ہندوستان کی تاریخ اور ہندوستان کے ادب پر کام کرنا چاہیں تو رضا لائبریری کا استعمال لازمی ہے۔اپنے کتب خانے کی خوبیاں گنواتے ہوئے عرشی زادہ صاحب نے کہا:

''ہماری لائبریری کو اگر آپ دیکھیں تو آپ کو نمایاں قسم کی کتابیں ملیں گی۔ مثلاً اردو کے قدیم شعراء! تو ہمارے ہاں تقریباً سارے ہی اہم تذکرے ان کے محفوظ ہیں۔ بیشتر شعراء کے دواوین موجود ہیں جن کی وہ قدیم شکلیں ہیں مثلاً میر تقی میر پر کوئی شخص کام کرنا چاہے تو ہمارے ہاں بعض نسخے ایسے ہیں کہ ان سے کام لیے بغیر وہ میر کی تدوین نہیں کر سکتا۔اسی طرح مصوری کی بات ہے۔مغل مصوری کے سلسلے میں جتنا بڑا اور اہم ذخیرہ ہمارا ہے شاید بہت کم جگہوں پر ایسا ہوگا۔اگر کوئی اکبر کے زمانے کی مصوری پر کام کرنا چاہے

تو اس کے لیے یہاں آنا لازم ہو جاتا ہے چاہے وہ مغل دور کا کوئی بھی موضوع ہو مثلاً نیچر اسٹڈی یا سماجی زندگی یا لباس''۔

اکبر ابھی جوان تھا جب ہندوستان کے مصوروں نے ایک مرقع بنایا جو مرقع طلسم کہلاتا ہے۔ ویسے تو اس کا موضوع ستارے اور برج ہیں جن کو مختلف حصوں' مہینوں اور دنوں میں تقسیم کر کے بہت سی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ ان ستاروں کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے وہ تو ستارہ شناس جانیں مگر اس مرقع میں جو تصویریں ہیں انہیں دیکھا جائے تو اکبر کے عہد کے ہندوستان کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ لوگوں کا کھانا پینا' اوڑھنا بچھونا' اٹھنا بیٹھنا وہ سب کسی فلم کے مناظر کی طرح اس مرقع طلسم میں موجود ہیں اور وہ مرقع رام پور کے قلعے میں شاندار گنبدوں' برجیوں' محرابوں اور میناروں سے آراستہ اس شاہی عمارت کے اندر محفوظ ہے جس میں کبھی خود نواب صاحب کا قیام تھا مگر جسے علم و ادب کی خاطر انہوں نے کتب خانے میں بدل دیا۔ آیئے کچھ اور کتابوں کا احوال عرشی زادہ صاحب کی زبانی سنیں:

''ایسے ہی ہمارے ہاں ایک بہت اہم نسخہ قرآن مجید کا ہے جو ابن مقلیٰ بغدادی کے قلم کا لکھا ہوا ہے جن کی وفات 239 ھ میں ہوئی یعنی قرآن کا یہ نسخہ ایک ہزار برس سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ ابن مقلیٰ خط نسخ کا موجد ہے یعنی کوفی خط کو اس نے ذرا سہل بنایا' زیادہ خوبصورت بنایا اور اس طرح وہ خط پیدا ہوا جو آج کا نسخ بنا۔ اب عربی خط کی تاریخ پر کوئی شخص کام کرنے والا ہو تو اس کے لیے یہ نہایت اہم نسخہ ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم ہمارے ہاں قرآن مجید کا ایک اور مخطوطہ ہے جو چمڑے پر لکھا گیا ہے۔ وہ پہلی صدی ہجری کا ہے اور اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دست مبارک کا نقل کیا ہوا ہے۔ کوفی خط میں ہے خط کی تاریخ پر کام کرنے والا اس سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتا''۔

رام پور کے اس کتب خانے میں ایک اور قابل ذکر کتاب تاریخ محمدی ہے۔ یہ کتاب اورنگ زیب کے دور میں مرزا محمد حارث بدخشی نے مرتب کی تھی۔ اس کی ترتیب کی صورت یہ ہے کہ سن ایک ہجری سے سن گیارہ سو اکسٹھ ہجری تک سال بہ سال جو مشہور اور نامور لوگ انتقال کرتے رہے اس سال کے خانے میں ان کی زندگی کے حالات درج ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ حالات جن جن کتابوں سے لیے گئے ہیں ان کے حوالے بھی درج ہیں مثلاً آپ مغل دور کے کسی اہم درباری کے حالات جاننا چاہتے ہوں تو آپ یہ تاریخ محمدی اٹھایئے اور اس میں اس کا سال وفات دیکھیے تو وہاں اس کا نام بھی ملے گا' اس کے والد کا نام بھی ملے گا۔ دربار میں اس کا کیا منصب تھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا اور مرزا محمد حارث بدخشی نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں' یہ بھی مل جائے گا۔ رامپور کے کتب خانے میں اتفاق سے اس کتاب کی دوسری جلد ہے۔ پہلی جلد خدا معلوم کہاں ہے۔

اکبر علی عرشی زادہ نے مزید بتایا:

''اسی طریقے سے ہمارے ہاں ایک کتاب ہے جو ایک زمانے میں تو قدیم ترین تفسیروں میں شمار ہوتی تھی اور وہ ہے ''سفیان ثوری علیہ الرحمۃ کی تفسیر''۔ اس کے ہمارے ہاں 36 صفحے ہیں۔ ہماری لائبریری کی طرف سے اسے شائع بھی کر دیا گیا ہے، بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ فقہائے شافعیہ کا ایک تذکرہ ہے جس کی دنیا میں ایک ہی کاپی ہے اس کو بھی ہم سوچ رہے ہیں کہ شائع کر دیں''۔

رام پور کی رضا لائبریری اب تک اس قسم کی کئی نایاب کتابیں شائع کر چکی ہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے اور آئندہ کے لیے بھی بڑے منصوبے ہیں بشرطیکہ وسائل کا قحط نہ ہو۔

یہ تو ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا ذکر تھا چھپی ہوئی کتابوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ وہ اتنی زیادہ ہیں کہ الماریوں میں شاید اب مزید گنجائش نہیں رہی۔ لیکن جیسا کہ عرشی زادہ صاحب نے مجھے بتایا علم کے اتنے بڑے خزانے سے فیض اٹھانے کے لیے سال بھر میں وہاں صرف ساٹھ ستر محقق آتے ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے علم، تحقیق اور جستجو کا وہ دور گیا جب لوگ ضرورت پڑنے پر چین تک چلے جاتے تھے۔ یہ تن آسانی کا زمانہ ہے لوگ دنیا زمانے کی ریسرچ اپنے گھر کے کمرے میں بیٹھ کر کر لینا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ برصغیر میں عربی اور فارسی کا علم ختم ہوتا جا رہا ہے جبکہ ان عظیم الشان کتب خانوں میں زیادہ تر قلمی نسخے عربی اور فارسی ہی میں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رام پور الگ تھلگ ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں باہر سے آنے والوں کے لیے وہ سہولتیں ناپید ہیں جو پٹنہ، حیدر آباد، دلی یا لکھنؤ وغیرہ میں باآسانی دستیاب ہیں۔ رام پور میں ایک آدھ ہوٹل ہے اور وہ بھی معمولی، چنانچہ اب رضا لائبریری والے کوشش کر رہے ہیں کہ کتب خانے کے قریب ایک عمارت حاصل کر کے اس میں شایان شان مہمان خانہ قائم کر دیں جہاں اسکالروں اور محققوں کو قیام کرنے اور کام کرنے کی ساری سہولتیں حاصل ہوں۔

جو لوگ دور کہیں رہتے ہیں اور تھوڑی بہت تحقیق کے لیے اتنی دور کا سفر نہیں کر سکتے انہیں دنیا کے تمام بڑے کتب خانے کتابوں کی نقل فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کے صفحوں کی نقل اتارنے کے کام میں فوٹو گرافی نے بہت مدد دی ہے اور اب تو چند منٹوں میں پوری پوری کتاب کا عکس اتارا جا سکتا ہے۔ یہ فن REPROGRAPHY کہلاتا ہے۔ جن دنوں میں رام پور گیا وہاں اس کا پورے طور پر انتظام نہیں تھا لیکن تیاریاں ہو رہی تھیں اور خیال تھا کہ سال بھر کے اندر اندر زیروکس کاپیاں اور مائیکروفلم بنانے کے انتظامات پورے ہو جائیں گے۔

جن دنوں میں رضا لائبریری گیا کتابوں کی نقل کے لیے مقامی باشندوں کی خدمات حاصل کی جا رہی

تھیں جو عربی' فارسی اور اردو بخوبی جانتے ہیں اور خوشخط بھی ہیں۔ باہر کے شہروں سے نقل کی جو فرمائشیں آتی تھیں، یہ لوگ ان کے مطابق کتابوں یا محض صفحوں کی ویسی ہی نقلیں اتار دیتے تھے جیسی کہ خود اصل ہے۔ عرشی صاحب مرحوم تو بعد میں اصل اور نقل کو ملا کر دیکھ لیا کرتے تھے اور پورا اطمینان کرنے کے بعد محقق کو وہ نقل بھیجا کرتے تھے۔

ویسے لوگ اب کہاں ہیں۔

رام پور کی رضا لائبریری سے یوں تو بے شمار ادیبوں' شاعروں' مورخوں اور محققوں نے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان میں دو نام بہت ممتاز ہیں۔ ایک تو مولانا شبلی نعمانی صاحب جنہوں نے رضا لائبریری میں بہت وقت گزارا اور دوسرے علامہ نجم الغنی خان رام پوری صاحب جنہوں نے تاریخ میں اپنی زیادہ تر تحقیق یہیں کی ہے۔ ان کے علاوہ رضا لائبریری کے بیش بہا ذخیرے سے موتی چن چن کر لے جانے والوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی جیسے بزرگوں کے نام نامی شامل ہیں۔

مگر پھر وہی بات کہ وہ لوگ گئے تو ان کے ساتھ وہ دور بھی گیا۔ حیدرآباد دکن میں ایک شام ڈاکٹر گیان چند جین صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ اردو سے انہیں والہانہ لگاؤ ہے اور تحقیق کی خاطر اتنے بہت سے پرانے اور تاریک کتب خانے جھانک چکے ہیں کہ بینائی پر بن آئی ہے۔ رضا لائبریری کے بارے میں انہوں نے بہت دلچسپ بات بتائی۔ اس باب کو ہم ان ہی کی بات پر ختم کرتے ہیں۔

''رام پور کے کتب خانے میں ایک عجیب و غریب چیز داستانیں ہیں۔ وہاں کے درباری داستان گویوں نے طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کے انداز میں داستانیں تصنیف کیں اور وہ ان ہی کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک سو پانچ جلدیں موجود ہیں۔ انیسویں صدی میں لکھی گئیں۔ ایک ایک کاپی ہے اس کی اور نقل نہیں۔ اور ہر جلد ہزار سوا ہزار صفحے کی ہوگی۔ بہت بڑے سائز کی۔ جہاں تک ان کی زبانوں اور اسلوب کا تعلق ہے تو میری رائے میں وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فسانہ عجائب یا مطبوعہ طلسم ہوش ربا کا۔ معلوم نہیں ان میں کیا کیا گوہر بند ہوں گے۔ کوئی ان کی سیر کرے تو معلوم ہو۔ میں نے ان کو الٹ پلٹ کے دیکھا ہے۔ اتنی زیادہ تعداد میں ہیں کہ کوئی توقع نہیں کہ وہ کبھی شائع ہو سکیں گی۔ اور یہی بدقسمتی ہے کہ ہم ایسی زبان کے امین ہیں کہ جس میں اتنے ذخیرے ہیں اور جس کا خزانہ اتنا بیش بہا ہے لیکن ہمارے وسائل اتنے محدود ہیں کہ ہم ان کو محفوظ بھی نہیں کر سکتے۔''

انہیں خدا بخشے

جب کبھی کہیں اجاڑ موسم آتا ہے تو پرندے وہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔ کچھ یہی حال کتابوں کا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ جب تاتاریوں نے بغداد کو لوٹا تو وہاں کی کتابیں ٹونک تک پہنچیں اور جب عیسائیوں نے قرطبہ پر دھاوا بولا تو وہاں کی کتابیں پٹنہ تک گئیں۔

ہمارا یہ باب پٹنہ کے لیے مخصوص ہے۔

ایک صاحب تھے ''خدا بخش''۔ علم و ادب پر ان کے اتنے احسانات ہیں کہ دل سے ان کے لیے یہی صدا نکلتی ہے کہ خدا بخشے۔ ان کے والد جب انتقال کرنے لگے تو ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک ہزار چار سو کتابیں بیٹے کے حوالے کر گئے اور کہہ گئے کہ جوں ہی حالات اجازت دیں ان کتابوں کو عوام کے لیے کھول دینا۔

خدا ایسی کتابیں اور ایسے بیٹے سب کو دے۔ خدا بخش علم کے اس خزانے میں نئے نئے جواہر بھرتے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس چار ہزار مخطوطے جمع ہو گئے۔ اب یہ کھیتی پک کر تیار تھی۔ بیٹے نے باپ کا خواب پورا کر دکھایا۔ 29 اکتوبر 1891ء کو یہ کتب خانہ وقف قرار پایا اور کتب خانے کا نام رکھا گیا ''اورینٹل پبلک لائبریری'' اس کے نام میں نہ کسی شخصیت کا نام شامل تھا نہ کسی کاروباری ادارے کا۔

مگر اس زمانے میں عوام طے کیا کرتے تھے کہ ان کا محسن کون ہے۔ چنانچہ لوگ نہ مانے انہوں نے اورینٹل پبلک لائبریری کو اول دن سے خدا بخش لائبریری کہا اور بانکی پور کے بارونق علاقے میں وہ آج بھی خدا بخش لائبریری کے نام سے ماضی کی عظمتوں کا مینارہ بنی کھڑی ہے اور اس کی کرنیں کہاں کہاں نہیں بکھری ہیں۔

پہلے پہل اس کا تعارف پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یوں کرایا:

''اس وقت کتب خانہ جو سب سے اچھا کام کر رہا ہے وہ ہے خدا بخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ جس کے ڈائریکٹر ہیں عابد رضا بیدار صاحب۔ بڑی محنت سے، بڑے سلیقے سے، بڑی کوشش سے، بڑی لگن سے انہوں نے

اہتمام کرایا ہے۔ پرانی چیزوں میں سے بعض بعض چیزوں کو چھاپ بھی رہے ہیں۔ سال میں ایک دو مرتبہ وہ خاص مشاہیر کو بلا کر ان کے توسیعی خطبات بھی کراتے ہیں اور خدا بخش جرنل کا بھی انہوں نے اجرا کیا ہے۔ جو بھی ملکی یا غیر ملکی اسکالر ہندوستان سے' پاکستان سے' مغرب کے یورپی ملکوں سے یا امریکہ یا روس سے وہاں پہنچتا ہے اس کی وہ ہر ممکن مدد کرتے ہیں''۔

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں کتابیں اور خوبیاں دونوں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ یہ بنیادی طور پر مخطوطات کی لائبریری ہے۔ خصوصاً عربی اور فارسی کتابوں کا یہاں بے مثال ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانے میں اردو' فارسی اور عربی کے پندرہ ہزار قلمی نسخے ہیں جن میں سے ابھی صرف آدھے نسخوں کی فہرستیں چھپی ہیں اور وہ چار نہیں۔ چونتیس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اشاعت کا یہ کام ابھی جاری ہے۔ اور نہ معلوم کتنے عرصے تک جاری رہے گا۔

لیکن خدا بخش کے والد نے تو انہیں صرف 14 سو کتابیں سونپی تھیں پھر یہ پندرہ ہزار کیسے ہو گئیں؟ یہی سوال میں نے لائبریری کے ڈائریکٹر جناب عابد رضا بیدار سے کیا۔ کہنے لگے:

''یہ تو کچھ ایسا ہے کہ آدمی کو کسی بھی چیز کی لگن ہو۔ پیاس چاہیے انسان کو۔ شدت کی پیاس ہو تو شاید کنواں بھی پیاسے کے پاس آ جائے۔ یہ مثال کم سے کم ہمارے لیے تو سچ ثابت ہوئی کہ خدا بخش کے پاس کتابیں کھنچ کر آتی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی کیا کہ ایک عرب کو ملازم رکھا جسے اس زمانے میں وہ پچاس روپے مہینہ دیتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں پچاس روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ شخص ڈھونڈ ڈھونڈ کر کتابیں لاتا تھا اور اطلاع دیتا تھا کہ فلاں جگہ کتابوں کا ذخیرہ ہے آپ خود خط و کتابت کر لیجیے۔ یہ اطلاع ہے۔ تو اس طرح مصر' حجاز' ایران و عراق سے کتابیں ان کو ملتی تھیں۔ ہندوستان بھر سے کتابیں ملتی تھیں۔ ان کی کتابیں ایک بار چوری ہو گئیں، کتاب فروش کے ہاں پہنچیں۔ اس نے ان کو اطلاع دی کہ ہمارے پاس کچھ کتابیں بکنے آئی ہیں آپ خریدیں گے؟ اس طرح وہ کتابیں پھر ان کے ہاں پہنچ گئیں' اگرچہ قیمتاً پہنچیں''۔

خدا بخش لائبریری کی دوسری بڑی خصوصیت مغل عہد کی پینٹنگز ہیں اور خصوصاً فارسی کی وہ قلمی کتابیں ہیں جن میں مصوّروں نے اپنے شاہکار بنائے ہیں۔

پٹنہ کے اس کتب خانے کی ایک اور خصوصیت اردو کے پرانے رسالے اور جریدے ہیں۔ ان کا جتنا بڑا ذخیرہ یہاں ہے دوسری جگہ شاید ہی ملے۔ خدا بخش لائبریری میں گزرے وقتوں کے تقریباً ایک ہزار مختلف اردو رسالوں کے کئی لاکھ شمارے محفوظ ہیں۔ مگر یہ ایسا بیکراں سمندر تھا کہ اس میں اگر آپ کسی خاص عنوان کی تلاش کرتے تو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوتا۔ لہٰذا لائبریری نے ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین

کے فہرست وار کارڈ بنانے شروع کیے ہیں اور اب تک دو لاکھ سے زیادہ اشارتی کارڈ تیار کر لیے ہیں اور ابھی تو بہت کام ہونا باقی ہے۔

ان لاکھوں کارڈوں کی تیاری میں خدا بخش لائبریری نے ایک دلچسپ اور کامیاب تجربہ کیا۔ یعنی اس کام میں طالب علموں کو بھی شریک کر لیا اور انہیں پانچ پیسے فی کارڈ کے حساب سے معاوضے کی پیش کش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم دن میں تین گھنٹے کام کر کے پانچ سے سات روپے تک کما لیتا تھا جس سے اس کا اپنا خرچ اور تعلیم کا خرچ نکل آتا تھا۔ اس تجربے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سیکڑوں طالب علموں میں چار پانچ سال کے اس کام کے دوران کتب خانے کا ذوق پیدا ہوا اور اب وہ باقاعدگی سے لائبریری کو استعمال کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خدا بخش لائبریری کی کچھ اور خصوصیات عابد رضا بیدار صاحب نے بیان کیں:

''ہم دوسری جگہوں سے اہم مخطوطات کے مائیکرو فلم حاصل کر رہے ہیں۔ کتب خانوں سے بھی اور ایسی جگہوں سے بھی جہاں برباد ہونے کے خطرے زیادہ ہیں مثلاً خانقاہوں وغیرہ میں۔ ایک آدھ جگہ ایسی بھی ہے جہاں اصل مخطوطے تلف ہو چکے ہیں' صرف ان کے عکس ہمارے پاس محفوظ ہیں۔

ایک شعبہ ہم نے ابھی حال ہی میں کیسٹ اور ٹیپ کا قائم کیا ہے جو اہم لوگ ہیں ان کی آوازیں صدا بندی کے بعد یہاں محفوظ کر لی جاتی ہیں۔ ایک اور چیز جو شروع کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مصنفوں سے ان کے مسودے لے لیے جائیں جو چھپنے کے بعد عموماً پھینک دیئے جاتے ہیں۔ وہ بھی آئندہ ریسرچ کا موضوع بن سکیں گے''۔

ایک اور شعبہ جو اب شروع ہو رہا ہے وہ ''معاصر اسلام'' یا CONTEMPORARY ISLAM کہلائے گا۔ مستقبل کا مورخ جب آج کے اسلام کی تاریخ لکھے گا تو وہ اس دور کی دستاویزوں کو خدا بخش لائبریری میں اپنا منتظر پائے گا۔ اس نئے شعبے میں عالم اسلام کی وہ تمام دستاویزیں جمع ہوں گی۔ جن کا تعلق دین سے ہے۔

دستاویزوں کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی سن لیجیے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی اردو دستاویزوں کا بڑا ذخیرہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ تحریک آزادی کے دور میں قلم کے محاذ پر جتنی جنگ اردو زبان میں لڑی گئی اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے اس وقت کے بڑے بڑے راہنما اردو میں لکھتے تھے چنانچہ خدا بخش لائبریری کے شیلف تیج بہادر سپرو' موتی لال نہرو اور لاجپت رائے جیسے صف اول کے راہنماؤں کی اردو تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہی حال مسلم راہنماؤں کی تحریروں کا ہے۔ بیدار صاحب نے اچھی بات کہی کہ ان تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی ساری دولت صرف افسانے یا شعر نہیں تھے بلکہ غیر معمولی سنجیدہ

موضوعات پر بھی لوگ دل جما کر لکھتے تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے کہ جب چکبست کا رسالہ صبح امید، پیارے لال شاکر کا العصر، نوبت رائے کا ادیب اور دیا نرائن نگم کا رسالہ زمانہ شائع ہوا کرتے تھے۔ خدا بخش لائبریری اپنے جرنل میں ان رسالوں کا انتخاب شائع کر رہی ہے جس میں مثال کے طور پر منشی پریم چند کی بہت سی ایسی کہانیاں موجود ہیں جو ان کے مجموعوں میں نہیں آئیں۔ سائنس پر بھی بہت سے مضامین ہیں جبکہ اردو والے بھول گئے کہ سائنس میں کبھی ایسا لٹریچر بھی پیدا ہوا تھا۔

خدا بخش لائبریری ایک اور بڑا کام یہ کر رہی ہے کہ نادر اور قابل ذکر قلمی نسخوں کو جدید کتابوں کی شکل میں چھاپ رہی ہے تاکہ علم کی اس بند سیپ سے نکل کر یہ موتی عام لوگوں کے گھروں کو بھی منور کر سکیں۔

ایسے ہی ایک مخطوطے کا ذکر عابد رضا بیدار صاحب نے کیا۔

''یہاں دیوان حافظ کا ایک نسخہ ہے۔ ہمایوں کو جب ایران میں پناہ لینا پڑی تو وہ وہاں سے ایک نسخہ لایا، وہ نسخہ پھر دارا شکوہ تک چلتا رہا۔ دارا نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں ایک نسخہ چلا آ رہا ہے جس سے ہمارے باپ دادا فال نکالا کرتے تھے۔ اس کے حاشیوں پر فال کا اندراج موجود ہے۔ مثلاً ہمایوں اور جہانگیر کی نکالی ہوئی فال۔ اور مجھے شبہ ہے کہ ایک جگہ شاہ جہان کی نکالی ہوئی فال کا اندراج موجود ہے۔ وہ ہم جوں کا توں آفسٹ پر چھاپ رہے ہیں تاکہ ان کا اصل خط عوام کے سامنے آ جائے''۔

معبد، مغلوں کے آخری عہد کا بہت بڑا دانشور تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے دبستان مذاہب لکھی تھی جس کا بعد میں سارے مغرب نے School of Religion کے نام سے مطالعہ کیا۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ معبد شاعر بھی تھا اور صاحب دیوان تھا۔ اس کے دیوان کا صرف ایک نسخہ تھا جو خدا بخش لائبریری میں نکل آیا۔ اس دیوان کی روشنی میں وہ اور بڑا دانشور نظر آتا ہے۔ یہ دیوان بھی چھاپا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بیدار صاحب نے بتایا:

''ہم نے عہد شاہ عالم کی ایک محاورات کی لغت چھاپی ہے جنہیں آپ ہندی یا اردو دونوں محاورات کہہ سکتے ہیں، اس عہد میں ایسی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ اس سے قبل کی ایک لغت چھاپ رہے ہیں جو اورنگ زیب کے پوتے کے لیے لکھی گئی۔ اورنگزیب نے اپنے پوتے کے لیے اتالیق مقرر کیا تھا۔ اس نے علوم ہندیہ پر ایک انسائیکلو پیڈیا لکھی اس میں سے ہم نے لغت کا حصہ نکال لیا ہے جو ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں چھاپا جا رہا ہے کیونکہ وہ ہندی کی بھی ایسی ہی لغت ہے جیسے اردو کی۔ ایسے ہی ایک منصوبہ ہے تاریخ خاندان تیموریہ چھاپنے کا جو مغل مصوری کا بہترین نمونہ کہا جاتا ہے اور اس کے لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ مصوری کا تاج محل ہے''۔

علوم مشرقی کے اس کتب خانے نے جو شاندار روایات قائم کی ہیں ان کا اسے صلہ بھی خوب ملا اور نہ جانے کتنے بزرگ وصیت کر گئے کہ ان کی کتابوں کے ذخیرے خدا بخش لائبریری کو دے دیئے جائیں یا پھر ان کے پسماندگان نے ان کے ذخیرے اس کتب خانے کو پہنچا دیئے اور ظاہر ہے کہ اس کام کا ثواب کہاں کہاں تک پہنچا ہو گا۔ آرہ کے ڈاکٹر رشید الدین احمد مرحوم' پٹنہ کے ڈاکٹر اختر اورینوی مرحوم اور سابق وزیر تعلیم سر فخر الدین مرحوم کی کتابوں کے ذخیرے اس کتب خانے کو مل گئے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنی چھ سات ہزار تحقیقی کتابیں اس لائبریری کو دے دیں۔ کھجوہ میں دیوان ناصر علی صاحب کا ذخیرہ تھا جسے سخت نقصان پہنچا۔ مگر جو کتابیں اور مخطوطے بچ گئے وہ خدا بخش لائبریری نے حاصل کر لیے' ان میں دیوان ہمایوں کا نسخہ بھی شامل ہے۔ حکیم علیم الدین بلخی صاحب نے اپنے والد کی کتابیں اس کتب خانے کو دے دیں جن میں مکتوبات صدی جیسی قیمتی کتاب شامل ہے جس پر مظفر شمس بلخی کی اپنی تحریر میں حاشیوں پر Notes لکھے گئے ہیں۔

ایک اور عظیم الشان کتب خانہ جو خدا بخش لائبریری میں منتقل ہوا اس کا احوال بھوپال میں اردو کے محقق اور استاد عبدالقوی دسنوی صاحب نے سنایا:

''پٹنہ سے تیس میل دور ایک گاؤں دسنہ ہے جہاں کے علامہ سلیمان ندوی ہیں۔ وہ میرا گاؤں ہے۔ وہاں ایک بڑا عظیم کتب خانہ تھا۔ الاصلاح لائبریری! اس میں بہت سے قلمی نسخے تھے۔ 1947ء میں جب بہت سے لوگ وہاں سے چلے گئے اور ویرانی بڑھنے لگی تو ہم سب کو احساس ہوا کہ اس لائبریری کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گونر بہار تھے ان سے ہم لوگوں نے رجوع کیا۔ ان تک پہنچے اور ان سے کہا کہ کسی طرح اس کتب خانے کو بچائیے کہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں تو ذاکر صاحب نے بہت دلچسپی لی اور سارے کتب خانے کا بہت اچھا حصہ خدا بخش لائبریری منتقل کر دیا۔ یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ پہلا گاؤں دسنہ ہے جس نے اتنی بڑی قربانی دی' صرف اس لیے کہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے یہ مفید طور سے استعمال ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ لوگ تحقیق کر سکیں''۔

تو یہ ہے ایک جیتے جاگتے پھلتے پھولتے کتب خانے کا احوال۔ اس کی موجودہ عمارت اب بڑھا کر دوگنی کی جا رہی ہے۔ اس میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہوں گے جن میں قلمی کتابیں محفوظ رہیں گی۔ میں جس روز وہاں پہنچا' بہت بڑے عملے کو مصروف پایا' کہیں تحقیق ہو رہی تھی' کہیں اشارتی کارڈ بن رہے تھے۔ کہیں زیروکس کاپیاں اور مائیکرو فلمیں بنائی جا رہی تھیں اور کہیں خوش نویس بیٹھے پرانی دستاویزوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔ ایک شعبے میں جلد بندی ہو رہی تھی' ایک گوشے میں ناقص کاغذوں کو موسم کے اثرات اور کیڑے مکوڑوں سے بچانے کے لیے کیمیاوی

عمل جاری تھا۔ خلیج کے علاقے سے ایک بزرگ تشریف لائے تھے جوز کوۃ پر اتھارٹی ہیں، وہ قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کتب خانہ قارئین سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف زندگی کے آثار اور ہر سمت چہل پہل تھی۔

یہ تو تھی زمین کی صورت حال، آسمانوں تک میری نگاہ تو نہیں پہنچی مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کہیں خدا بخش کی روح بے حد مسرور ہوگی۔

خدا کے ہاں ایسے ہی لوگوں کی بخشش ہوتی ہے، مجھے یقین ہے!!

چھ ہزار سنگ میل

میں جن دنوں راجستھان پہنچا' سرکاری ملازموں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ صوبائی حکومت کے کام بند پڑے تھے اور سرکاری اجلاس' کانفرنسیں' نمائشیں اور دوسری مصروفیات معطل تھیں کیونکہ ملازمان سرکار ڈیوٹی پر آنے اور تعاون کرنے سے صاف انکار کر رہے تھے۔

اتفاق سے ان ہی دنوں ٹونک میں علوم شرقیہ کے ایک تحقیقی ادارے نے تصوف کے موضوع پر ایک کل ہند مذاکرے کا اہتمام کیا تھا۔ ملک بھر سے علماء اور اساتذہ ٹونک پہنچ رہے تھے مگر انہیں خبر نہ تھی کہ جس اجلاس کے لیے وہ مہینوں مطالعہ اور تحقیق کر کے آئے ہیں اس کا منعقد ہونا اب ممکن نہیں۔

اجلاس کے منتظمین سر پکڑے بیٹھے تھے کیونکہ سارا سرکاری عملہ ہڑتالیوں کے کیمپ میں جا چکا تھا اور ٹریڈ یونین کے راہنماؤں نے اعلان کر رکھا تھا کہ حکومت کی پوری مشینری اب جام رہے گی' کہ اچانک ہڑتالیوں کے لیڈر آن پہنچے اور اجلاس کے منتظمین سے کہا کہ آپ کا مذاکرہ ہماری لگائی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہے۔ آپ کا ادارہ خالص علمی ادارہ ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ ہماری ہڑتال کی وجہ سے علم کے اس ستھرے دامن پر کوئی داغ آئے۔

اگلے ہی لمحے سارا ہڑتالی عملہ کام پر واپس آ گیا۔ تصوف کے حوالے سے خوب خوب مباحثے ہوئے۔ مقالے پڑھے گئے اور علم کا علم سے لین دین ہوا۔ پورے راجستھان کا سرکاری پہیہ جام تھا مگر ٹونک کے ''ادارۂ تحقیق عربی و فارسی'' میں کام حسب معمول جاری تھا۔

مجھے کسی نے غلط تاریخ بتا دی' میں جس روز ٹونک پہنچا مذاکرہ اس سے ایک دن پہلے ختم ہو چکا تھا۔ دریاں اٹھائی جا رہی تھیں' کرسیاں تلے اوپر چن دی گئی تھیں اور مہمان جا چکے تھے۔ میں سمجھا کہ میرا آنا بیکار گیا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ قسمت مجھے ہندوستان کے ایسے گوشے میں لے آئی ہے کہ جہاں سارے جہان کا علم جمع ہے۔

ٹونک ایک چھوٹا سا غریب سا دور دراز شہر ہے جہاں ریل گاڑی بھی نہیں جاتی۔ میں ایک کار میں بیٹھ کر جے پور سے ٹونک پہنچا تھا۔ اس روز شہر میں بس وہی ایک کار نظر آئی۔ پرانی آبادی سے گزر کر' سیدھی لکیر جیسے ایک کشادہ بازار میں دو رویہ رنگریزوں کو چنریاں رنگتے اور لکڑی کے ٹھپوں سے گل بوٹے چھاپتے دیکھتا ہوا میں ایک فصیل کے قریب پہنچا۔ ہماری کار ایک شاہانہ در میں داخل ہوئی اور ویسی ہی ایک شاہانہ عمارت کے سامنے ٹھہر گئی۔ اس پر لکھا تھا ''عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ''۔

میں سارے ہندوستان میں یہی بات سنتا آ رہا تھا کہ عربی فارسی کا ذوق اب ختم ہوا۔ ان زبانوں کو سمجھنے والے بھی ختم ہو رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ برصغیر کا بیشتر تاریخی ریکارڈ یا تو فارسی میں ہے یا عربی میں۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ تاریخ کے اس ورثے سے اب کسی کو دلچسپی نہیں۔ ایسی حوصلہ شکن باتیں سننے کے بعد راجستھان کے ویرانوں کے بیچ عربی اور فارسی کا چشمہ ابلتا دیکھا تو وہی راحت محسوس ہوئی جو طویل مسافت کے بعد کسی نخلستان میں پہنچ کر ہوتی ہے۔

میں تو تصوف کے سیمینار میں آیا تھا لیکن اس روز خود کو چھ ہزار ایسی کتابوں کے درمیان پایا جنہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے کوئی علم کی شاہراہ کے چھ ہزار سنگ میل اکھاڑ کر یہاں نذر باغ کی چبوترے والی کوٹھی میں لے آیا ہو۔

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کی طرح یہ بھی بنیادی طور پر قلمی کتابوں کا ذخیرہ ہے اور کتابیں بھی ایسی کہ جو شہنشاہوں' شہزادوں اور شہزادیوں کے کتب خانوں میں رہ چکی ہیں۔ کوئی کتاب ہرات سے پہنچی ہے' اس پر جامی کی تحریر موجود ہے۔ کوئی کتاب لٹے ہوئے بغداد سے آئی ہے اس پر دجلہ کے چھینٹے موجود ہیں۔ کسی پر شاہ جہاں کے دستخط ہیں' کسی پر اس کے بیٹے دارا شکوہ کی تحریریں ہیں۔ کہیں بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں نے چند کلمات لکھے ہیں تو کہیں شاہ ولی اللہؒ کی تحریر آنکھوں کے راستے روح میں اتر جاتی ہے۔

اس دور میں ایسے کتب خانے بہت کم ہوں گے جو بیک وقت علم کی آماجگاہ بھی ہوں اور زیارت گاہ بھی۔

راجستھان میں بائیس ریاستیں تھیں جن میں ٹونک واحد مسلم ریاست تھی 1857ء میں دلی اور لکھنؤ اجڑے تو کتنے ہی خاندان برباد ہوئے۔ اہل علم پناہ کی تلاش میں ٹونک پہنچے۔ روہیلے سردار امیر خان کی یہ ریاست دیکھتے دیکھتے علم و حکمت کا گہوارہ بن گئی۔ درس و تدریس کا سلسلہ چلا۔ جا بجا مدرسے کھلے' ہر گھر میں کتب خانے قائم ہوئے' تصنیف و تالیف کا زور ہوا اور وسطی ایشیا' ایران' افغانستان' مصر اور خود ہندوستان سے کتابیں کھنچ کھنچ کر ٹونک پہنچنے لگیں۔

سوا سو سال ہونے کو آ رہے ہیں جب نواب محمد علی خان اس ریاست کی مسند پر بیٹھے اور اس کتب خانے

کی بنیاد ڈالی جس کا یہ تذکرہ ہے۔ انگریزوں نے انہیں معزول کر کے بنارس بھیجا تو وہ اپنا کتب خانہ ہمراہ لے گئے اور خطا اور سزا سب کو بھول بھال کر وہ ایک عظیم الشان لائبریری بنانے میں مصروف ہو گئے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو فرش پر چُنی جانے والی کتابیں چھتوں کو چھو رہی تھیں۔

نواب محمد علی کے صاحبزادے اس شاندار خزانے کو منتقل کر کے ٹونک لے آئے اور جب تک ریاست خوش حال رہی کتب خانے میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج اس میں تیس علوم پر تقریباً پندرہ ہزار قلمی کتابیں موجود ہیں جو چھ ہزار جلدوں میں بندھی ہوئی ہیں۔ ان علوم میں تفسیر' حدیث' فقہ' سیرت' فلسفہ' ادبیات' فلکیات' نجوم' طب' ریاضی' تاریخ اور تنقید پر دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔

لیکن عربی فارسی مخطوطوں کے اس ذخیرے کو یوں بچا بچا کر رکھنے اور فروغ دینے کے اس کارنامے میں کون کارفرما ہے؟ وہ ہے راجستھان کی حکومت اور صاحبزادہ شوکت علی خان کی شخصیت۔

ٹونک کی دکانوں کے اوپر ایک کمرے میں بند یہ سعیدیہ لائبریری ان ہی کی کوششوں سے نذر باغ کے شاہی محل کی عمارت میں منتقل ہوئی اور ان ہی کی جدوجہد سے حکومت راجستھان کا ڈائریکٹریٹ قرار پائی جس میں وہ خود ڈائریکٹر ہیں۔ آیئے ان کی داستان انہی کی زبانی سنیں۔

"1961ء میں جب میں نے اس کتب خانے کا چارج لیا اس وقت نہ جانے کیوں میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ چونکہ ٹونک علمی گہوارہ رہا ہے' اگر تمام راجستھان میں بکھرے ہوئے مخطوطوں کو ٹونک میں لے آیا جائے اور سرکاری کتب خانے میں جو مخطوطے کسمپرسی کی حالت میں ہیں ان کو یہاں منتقل کر دیا جائے تو یہ راجستھان کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ مجھے فخر بھی ہے کہ اور احساس تشکر بھی کہ میرے اس ادارے کو کامیاب بنانے میں یہاں کے علماء' فضلاء اور مشائخ نے میرا ساتھ دیا۔ 1973ء میں حکومت راجستھان نے فیصلہ کیا کہ عربی فارسی کے بکھرے ہوئے مخطوطے ٹونک میں جمع کر دیئے جائیں۔ چنانچہ کئی مقامات مثلاً بھرت پور' جھالا واڑ اور ادوے پور کے کتب خانوں میں جا کر میں خود وہاں کے جواہر پاروں کو اپنے اس دامن میں سمیٹ لایا"۔

صاحبزادہ شوکت علی خان کی اس داستان کے بعد آیئے اب اس عظیم الشان کتب خانے کی چند قابل ذکر کتابوں پر نگاہ ڈالیں۔

یہاں تیس ورق کا ایک قرآن مجید قابل دید ہے۔ اس میں ہر ورق پر ایک ایک پارہ باریک قلم سے لیکن اس خوبی سے لکھا گیا ہے کہ اس کے روشن حروف دور سے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ پھر اس قرآن کے الفاظ اس طرح بٹھائے گئے ہیں کہ پارے کی ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے۔ ہر صفحے پر سونے کا کام ہے' مینا کاری کی گئی ہے اور دلکش بیلوں سے حاشیے بنائے گئے ہیں۔ یہ قرآن مجید شاہ جہاں کے زمانے میں عبدالباقی

نے لکھ کر بادشاہ کو پیش کیا تھا اور شاہ جہان نے خوش ہو کر عبدالباقی کو نہ صرف یاقوت رقم کا خطاب دیا بلکہ انہیں سکوں میں تلوا کر وہ سارے سکے عبدالباقی کو دے دیئے تھے۔

ٹونک میں قرآن مجید کا ایک اور نسخہ اورنگ زیب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو ادھورا رہ گیا ہے اور کسی کو علم نہیں کہ بادشاہ اسے مکمل کیوں نہ کر سکا۔

تفسیر کی کتاب ''زادالمسیر'' قابل ذکر ہے۔ خیال ہے کہ یہ کتاب خلفائے عباسیہ کے کتب خانوں میں رہ چکی ہے۔ 1208ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا اور ہاں مامون رشید کے کتب خانے پر حملہ کر کے اس کی دس لاکھ کتابیں دریا میں پھینک دی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو کی فوجوں نے ان ہی کتابوں کے اوپر چل کر دجلہ پار کیا تھا اور کتابوں کی سیاہی گھلنے سے دجلہ کا پانی سات دن تک سیاہ رہا تھا۔ زادالمسیر کے اس نسخے پر تاتاریوں کے حملے کا سن بھی درج ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب پانی میں سے نکالی گئی ہے۔ کیا عجب کہ یہ نسخہ بغداد کے بیت الحکمت کی بچی کھچی نشانی ہو۔ ٹونک میں اس طرح کی دو کتابیں محفوظ ہیں۔

اسی طرح تفسیر جلالین کا ایک نسخہ ہے جس پر مولانا جامیؒ کی اپنی تحریریں جگہ جگہ موجود ہیں۔ پھر زیب التفسیر ہے جو اورنگ زیب کی بیٹی کے لیے کشمیر میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ فیضی کی تفسیر وساطع الالہام ہے اس پوری تفسیر اور اس کے مقدمے میں کوئی بھی نقطے والا حرف استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر ''الفوز الکبیر'' سے کون واقف نہیں۔ ٹونک میں اس کا جو نسخہ ہے وہ شاہ صاحب کے ایک شاگرد عبدالہادی نے نقل کیا تھا مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس پر خود شاہ ولی اللہ کے قلم کی تحریر موجود ہے۔

تصوف پر ایک قابل ذکر کتاب مولانا جامیؒ کی ''نقد النصوص'' ہے۔ جس کے پہلے ہی ورق پر دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ کتاب کے بعض حاشیے خود مولانا کی تحریر ہیں۔ بعد میں کسی نے دارا شکوہ کے دستخط مٹانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ نام اب بھی صاف پڑھا جاتا ہے۔

ایک اور نسخہ مسعودی کی تاریخ ''مروج الذہب'' کا ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے ایک رتن عبدالرحیم خان خاناں کے کتب خانے میں رہ چکا ہے اور اس پر ان کی تحریر موجود ہے۔

ٹونک کے کتب خانے کی کچھ اور نادر کتابوں کے بارے میں صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب نے بتایا:

''یہاں کا ایک اور مخطوطہ تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ یہ دنیا کا واحد منفرد نسخہ ہے جو نسب الانساب تاریخ راجستھان کے نام سے ہے۔ دوسرا قلعہ رنتھمبور کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔ اسی طرح ''زیب التواریخ'' کا نسخہ ہے۔ جس کو میرے محب ومکرم منظور الحسن صاحب برکاتی نے

ایڈٹ کر دیا ہے اور جس پر حکومت ہند سے ایوارڈ ملا ہے۔ زیب التواریخ کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں بھی ہے اس کے علاوہ یہ کتاب کہیں نہیں ملتی۔ اسی طریقے سے طبقات شاہ جہانی ہے۔ سی۔ اے اسٹوری نے دنیا میں اس کے صرف چھ نسخوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں موجود ہے جو غیر مطبوعہ ہے۔ اب تک کہیں اس پر کام نہیں ہوا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اسی طرح ہمارے ہاں ابن ندیم کا نسخہ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے بغداد سے اسکالرز کی پارٹی ٹونک آئی تھی اور اس کی مائیکرو فلم بنا کر لے گئی۔ اسی طرح ہمارے ہاں ''احراز السیاستہ'' کا ایک نسخہ ہے۔ یہ ایران کی تاریخ' ثقافت اور علم و ادب پر ایک نادر مخطوطہ ہے جو خود ایران کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں''۔

ٹونک کے اس کتب خانے میں ایک اور خزانہ محفوظ ہے جس کی اہمیت کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا۔ یہاں ریاست ٹونک کی سرکار کے بیس ہزار کاغذات' دستاویزیں' فائلیں اور بستے اور ان سے بھی بڑھ کر ٹونک کی شرعی عدالتوں کے تیس ہزار فیصلے اور مقدموں کی دوسری دستاویزیں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ ریاست ٹونک کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں تمام مقدموں کے فیصلے شرع کے مطابق ہوا کرتے تھے اور شرعی عدالت کے فیصلے کے آگے نواب اور رئیس وقت کے فیصلے مسترد کر دیئے جاتے تھے۔ یہ ریکارڈ ایک بہت بڑا اسلامی ثقافتی ورثہ ہے اور یقین ہے کہ یہ پچاس ہزار بستے اور فائلیں ہندوستان کے اس خطے کی تاریخ کا ایک ایک باب ایسی تفصیل سے سنائیں گی کہ دنیا سنا کرے گی۔

یہ 4 دسمبر 1978ء کی بات ہے جب حکومت راجستھان نے اس کتب خانے کو سرکاری ادارہ قرار دیا تھا۔ اس کا آغاز پچاس ہزار روپے کے چھوٹے سے بجٹ سے ہوا تھا اور اب کُل ملا کر چھ لاکھ روپے کا بجٹ ہے۔ چنانچہ اب یہاں تحقیق ہو رہی ہے' کتابیں شائع ہو رہی ہیں' نمائشیں اور توسیعی خطابت ہو رہے ہیں۔ مزید عمارتیں بنیں گی جن کے لیے سولہ لاکھ روپے منظور کیے گئے ہیں لیکن اتنے بڑے کام کے لیے اس ادارے میں صرف دس افراد کا عملہ ہے جو بہت کم اور نا کافی ہے۔ خوش قسمتی سے اس ادارے کو مولانا سید منظور الحسن برکاتی اور مولوی حکیم محمد عمران خان صاحبان جیسے عالموں کی خدمات اور تعاون حاصل ہے اور یہ چھوٹا سا عملہ ملازموں سے زیادہ رضا کاروں کے انداز میں کام کر رہا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹونک کے شاہی محل کے اس علاقے میں ایک پورا کیمپس بنا دیا جائے جہاں کتابیں محفوظ کرنے کے لیے ایئر کنڈیشنڈ کمرے ہوں' جلسہ گاہیں اور آڈیٹوریم ہوں۔ اسکالروں کی رہائش کا بندوبست ہو' چھاپہ خانہ ہو اور ساتھ ہی خوشنویسی اور خطاطی کا مدرسہ ہو کیونکہ فن خطاطی کے جیسے نمونے اور شاہکار ٹونک میں محفوظ ہیں شاید ہی کہیں ہوں۔ یہاں خط نسخ اور خط تعلیق بھی ہے۔ پھر ان سے مل کر بننے والا خط نستعلیق

ہے۔ خط شفیعہ اور خط شکست تو رہے ایک طرف' یہاں خط گلزار' خط ماہی' خط طاؤس' خط ہلال' خط گوہر' خط خشت' خط غبار' خط الترہ' خط زلف عروس' خط منشور' خط طغرہ' خط ناخن' خط معکوس' خط توام' خط گنج و پیوند اور خط خورد بینی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

اور اب ایک آخری بات۔ راجستھان بلاشبہ ہندوستان کا واحد صوبہ ہے جو عربی اور فارسی کے تحفظ اور فروغ کے لیے اتنے جتن کر رہا ہے۔ شوکت علی خاں شہر کی دکانوں کے اوپر کسی کمرے میں بند کتب خانہ سعیدیہ کی یہ عربی فارسی کتابیں یقیناً شاہی محل میں لے آئے ہیں لیکن دکھ کی بات ہے کہ اردو کی نہ معلوم کتنی کتابیں اب بھی شہر کی دکانوں کے اوپر ایک کمرے میں پڑی ہیں۔ نہ ان کی اچھی طرح حفاظت ہو رہی ہے نہ باقاعدہ دیکھ بھال' انہیں بچانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹونک کو ابھی ایک اور شوکت علی خان کی ضرورت ہے۔

وہ میکینک صاحب

پرانی داستانوں میں ہم نے ایسے قصے بارہا پڑھے ہیں جن میں لوگ اندھیرے غاروں اور سرنگوں میں چلتے گئے، چلتے گئے اور اچانک ایک چمکتے، جگمگاتے محل میں نکلے جس کے طاقوں میں ہیروں کے نیلم، پکھراج اور زمرد کے اتنے ڈھیر لگے تھے کہ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بھی یہ ہیرے اور موتی فرش پر یوں گرنے لگتے تھے جیسے بہت بڑے نقارے پر بارش کی موٹی موٹی بوندوں کے ساتھ چھوٹے بڑے اولے بھی گرا کرتے ہوں۔

کچھ ایسا ہی ایک منظر ہم نے دکن کی سطح مرتفع پر آباد گنبدوں، میناروں، فصیلوں، محرابوں باغوں اور فواروں کے شہر حیدر آباد میں بھی دیکھا۔

باغ عامہ کے سامنے ایک گلی میں پہنچ کر ہم ایک ٹوٹی پھوٹی ادھوری اور پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ بالٹیوں کو بھرنے والی ٹونٹیوں سے ٹکراتے اور ربڑ کے پائپوں کو پھلانگتے، بوسیدہ اور پُر پیچ سیڑھیوں پر چڑھتے، نیچی چھتوں سے سر ٹکرا جانے کے خوف سے جھکے جھکے، ہم اس آدھی پکی آدھی کچی عمارت کی چھت پر پہنچے اور وہاں بعد میں تعمیر کیے گئے نسبتاً نئے اور کشادہ کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مچانوں اور طاقوں پر کتابیں ہی کتابیں چُنی ہوئی ہیں۔ رسالوں، دستاویزوں قلمی نسخوں، بھاری بھرکم جلدوں اور وزنی مطبوعات کے ڈھیر لگے ہیں اور ان کو چن چن کر سجانے والا ایک شخص سہما بیٹھا ہے کہ کہیں ہوا کا کوئی ذرا سا جھونکا انہیں اڑا نہ لے جائے۔

یہ اسی سہمے ہوئے شخص کی داستان ہے۔

محمد عبدالصمد خاں پیشے کے اعتبار سے موٹر مکینک تھے مگر ذوق کے اعتبار سے کتابوں کے شیدائی تھے۔ ہفتے بھر موٹروں کی مرمت کرتے تھے اور چھٹی والے دن نہ معلوم کہاں کہاں کی خاک چھان کر کتابیں جمع کیا کرتے تھے۔ آخر یہ ہوا کہ اس دوڑ میں نئے زمانے کی تیز رفتار کاریں پیچھے رہ گئیں اور پرانے زمانے کی بوجھل کتابیں آگے نکلے گئیں۔ عبدالصمد خاں نے اپنا موٹر گیراج بند کیا اور اپنے کتب خانے کو اردو ریسرچ سنٹر کا نام دے کر

اسے تحقیق اور مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے عام لوگوں کے لیے کھول دیا۔

صرف دس بارہ برسوں میں وہ سات ہزار کتابیں، بتیس ہزار رسالے، پانچ سو قلمی نسخے، دو سو سفرنامے، اڑھائی تین سو تذکرے، پچاس لغات اور ان گنت کتابچے جمع کر چکے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج سیکڑوں طالب علم اور اساتذہ محقق اور مدبران کے کتب خانے سے فیض اٹھا رہے ہیں، مگر یہ داستان کچھ اتنی خوشگوار بھی نہیں۔ میں عبدالصمد صاحب کے کتب خانے میں پہنچا اور اسے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو وہ مجھے ساتھ لیکر چلے۔ چلتے جاتے تھے اور کتابوں کی باتیں کرتے جاتے تھے، کہنے لگے:

''یہ دیکھیے خواتین کے رسالے ہیں جن کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ اس کے بعد یہ اردو میں طنز و مزاح کی کتابیں ہیں ان کی تعداد تقریباً اڑھائی سو ہے۔ اس سے آگے ڈرامے کی اور فن ڈراما کی کتابیں ہیں اور یہ نیچے قدیم داستانیں ہیں۔ ان کا بھی اتنا بڑا ذخیرہ شاید ہی کسی کے پاس ہو''۔

اس طرف مذہبی کتابیں ہیں، ادھر تاریخ ہے اور یہ شعراء کے تذکرے ہیں۔ ان کی بھی اتنی بڑی تعداد شاید ہی کہیں ملے۔ ان کی کل تعداد پونے تین سو ہے۔ ادھر یہ مختلف رسالے ہیں، ان کی جہاں جگہ ملی ہے وہیں رکھ دیئے گئے ہیں۔

اور یہ پوری الماری سیرت، سوانح اور خودنوشت سوانح کے لیے مخصوص ہے۔ اس طرف قدیم غزل گو شعراء کا کلام ہے اور ان کا انتخاب ہے اور ادھر نظمیں، مثنویاں منظوم داستانیں وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد یہ انیسویں صدی کی کتابیں ہیں ان میں زیادہ تر مسودے ہیں۔ مثلاً یہ چراغ علی صاحب کے اٹھائیس مسودے ہیں اسی طرح یہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کا کلام ہے جو کنگ کوٹھی سے استاد جلیل کے پاس جاتا تھا اخباروں میں شائع کرنے کے لیے۔ یہ اس کی پوری فائل ہے۔

یہ کشن پرشاد شاد کا کلام ہے۔ جس کی حیدر یار جنگ اور ضیاء یار جنگ نے اصلاح کی ہے۔ اسی طرح اس الماری میں بھی مسودے بھرے میں جو میں ابھی تک پوری طرح سے ٹھیک نہیں کر سکا۔

اب یہ رسالے ہیں۔ ان کے میں نے الگ الگ فائل بنا دیئے ہیں۔ مثلاً نگار ہے ''نگار'' کا میرے پاس مکمل سیٹ ہے یعنی 1922ء سے لے کر اب تک۔ اسی طرح اورنگ آباد کا مجلّہ اردو ہے جو بعد میں پاکستان سے بھی شائع ہوتا رہا۔ اس کے 1956ء تک مکمل فائل یہاں موجود ہیں۔

یہ غالبیات پر ساری کتابیں ہیں اور ادھر اقبال پر شائع ہونے والی کتابیں ہیں۔ رسالوں نے جو غالب نمبر شائع کیے ہیں ان کی تعداد 125 ہے۔ اقبال نمبر بھی اسی کے قریب ہیں۔ یہ خاص گوشہ ہے مصنفین کی دستخط شدہ کتابوں کا۔ ان پر بہت دلچسپ فقرے بھی لکھے ہیں۔ یہ تنقید، تحقیق اور حوالے کی کتابوں کا پورا گوشہ ہے، اوپر

رپورٹیں ہیں۔ یہ مختلف اردو اور تعلیمی انجمنوں کی رپورٹیں ہیں جیسے یہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی 1890ء سے لے کر 1904ء تک مکمل رپورٹیں ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ تحریک کی رپورٹیں اور خطبات یہاں جمع ہیں۔

ادھر سفرنامے ہیں، یہ کیٹلاگ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے سب ہی کتب خانوں کے تاجران کتب کے کیٹلاگ ہیں۔ میرے پاس جو پہلی فہرست کتب ہے وہ 1882ء کی ہے۔

اور یہ دیکھئے قلمی نسخے ہیں۔ وہ اوپر سب اردو کے ہیں نیچے فارسی کے ہیں اور سب سے نیچے عربی مسودے ہیں۔

ادھر یہ تینوں الماریاں رسائل کی ہیں اور یہ وہ کچرا ہے جو میں صاف نہیں کر سکا۔ رسائل کی تعداد بہت ہے۔ ہم نے ابھی تک 32 ہزار کی فہرست بنالی ہے۔ انیسویں صدی کے جتنے بھی اہم رسالے تھے ان کی ایک آدھ کاپی تو آپ کو یہاں ضرور مل جائے گی ان میں سے بعض تو بالکل گمنام ہیں۔

سرسید کے تہذیب الاخلاق کے پانچ سال کے فائل میرے پاس ہیں۔ مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ کا مکمل فائل ہے۔ ''زمانہ'' کے مکمل پرچے اب کسی کے پاس نہیں میرے پاس وہ تقریباً مکمل ہیں۔

میں نے صمد صاحب سے پوچھا کہ اپنی یہ لائبریری قائم کرنے کا خیال کب آیا آپ کو؟ میں نے سوچا تھا کہ وہ آٹھ دس سال کی بات کریں گے لیکن وہ کہنے لگے:

''میں جس زمانے میں جامعہ ملیہ دہلی کی جماعت دوئم اور سوئم میں پڑھتا تھا اس وقت جو کتابیں مجھے انعام ملتی تھیں یا جو میں خریدتا تھا وہ کتابیں اب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اور اس کے بعد ہر دور میں کتابیں جمع کرتا رہا۔ دو سال پیشتر لندن سے ڈیوڈ میتھیوز صاحب کے آنے کے بعد ہی یہ خیال ہوا کہ ہم اس کو ایک ریسرچ سنٹر میں تبدیل کریں تاکہ عام لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مگر اب افسوسناک بات یہ ہے کہ میں خود اس سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں شاید بہت جلد اس کو بند کر دوں''۔

ان کی یہ بات سن کر میں چونک پڑا اور پوچھا ''وہ کیوں؟''

کہنے لگے ''بھئی یہ تو میرے لیے بالکل ناقابل برداشت ہو گیا ہے مثلاً یہ مخطوطے اور قلمی نسخے ہیں ان کو میں اگر محفوظ کرنے کی کوشش کروں تو میرے تیس چالیس ہزار روپے خرچ ہو جائیں گے۔ میرے بجٹ کا مسئلہ بھی عجیب وغریب ہے۔ کتابیں میں اس طرح خریدتا ہوں کہ میں اگر کھانا کھانے جا رہا ہوں اور راستے میں کوئی کتاب فروخت ہو رہی ہے تو سوچتا ہوں کہ چلو بھئی آج رات کا کھانا نہ سہی، کل ناشتہ ہی کر لیں گے۔ یہ سوچ کر کتاب خرید لیتا ہوں۔ مگر اس طرح کتابیں تو میں نے بہت جمع کر لی ہیں لیکن ان کو رکھنا اور حفاظت سے رکھنا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے''۔

اس پر میں نے کہا کہ یہ تو بہت بڑا ذخیرہ ہے اس کے پیچھے بڑی محنت ہے اور لگن اور اشتیاق ہے جن کے بغیر کتب خانہ نہیں بنتا۔ اس کے بعد آپ اتنی آسانی سے اسے کیسے اپنے آپ سے جدا کر سکتے ہیں؟

اس پر صمد صاحب کہنے لگے "صاحب اب مشکل تو یہ ہے کہ یہاں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ اس ریسرچ سنٹر کی کمیٹی میں آپ جو نام دیکھیں گے وہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ دو سال کے عرصے میں کسی نے بھی آ کر یہ نہیں پوچھا کہ ادارہ کیسے چل رہا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ فوٹو کاپی کا ہے۔ صفحات کے عکس منگائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے تعلیمی اداروں سے اور پاکستان سے مواد کے لیے بہت خطوط آتے ہیں اور خدا کے فضل سے ہم نے اب تک سبھی کو حسب خواہش مواد بھجوایا"۔ میں نے پوچھا "بالکل راہ خدا ہیں؟"

ہنس کر کہنے لگے: "راہِ خدا کہیے یا ذوق کی تسکین کہیے لیکن اب تھک گیا ہوں"

اور آخر میں انہوں نے سارا بھید خود ہی کھول دیا۔ بولے:

"سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کو برداشت کر لیتا ہے، مجھے جو سب سے بڑی شکایت ہے وہ یہ کہ یہاں کا جو ادبی حلقہ ہے وہ مجھے موٹر مکینک سے اوپر ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب بات پائیں گے کہ وہ اساتذہ بھی جن کے لڑکے میرے پاس تحقیق کرتے ہیں اور پورا مواد حاصل کرتے ہیں وہ بھی کبھی میرا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ارے بھئی وہ مکینک صاحب، ان کو کیا پتہ۔ بس کتابیں جمع کر لی ہیں تھوڑی سی، یہ رویہ بڑا تکلیف دہ ہے"۔

تو یہ تھا عبدالصمد صاحب کا کتب خانہ جس کے متعلق کسی نے کیا اچھی بات کہی کہ کہنے کو یہ ادارہ ہے مگر اسے ایک فرد کے اضطراب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس نے اپنی تنہا روی اور سوز دروں سے ایک ادبی گھروندا تعمیر کیا ہے۔

کاش اس داستان کا انجام بخیر ہو اور ہم کہہ سکیں کہ عبدالصمد خاں اور ان کے کتب خانے نے باقی زندگی ہنسی خوشی گزار دی۔

کچھ بھی ہو، دل کو ایک دھڑکا سا ہے۔ اور یہی ہوا۔ کبھی سرکار نے اور کبھی غیر ملکی اداروں نے اس ذخیرے کو سنبھالنے میں ہاتھ بٹایا۔ آخر اسے اس عمارت سے منتقل کر کے کسی دوسری عمارت کے تہہ خانے میں رکھ دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک برس شدید بارشیں ہوئیں اور تہہ خانے میں پانی بھر گیا۔ جو کتابیں ڈوبیں وہ مٹ گئیں۔ باقی جو بچیں وہ ڈر ہے کہ بے قدری کی نذر ہو جائیں گی۔ مجھے یہ خبریں اپنے دوستوں سے ملی ہیں۔ خدا کرے غلط ہوں۔ (عابدی)

تاریخ چاہے کچھ کہے

''ان کا کہنا تھا کہ اپنی کتابوں کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتا ہوں۔ ان کے آخر وقت کا ایک واقعہ ہے۔ جب مرض الموت ان پر طاری ہوا وہ اس وقت اپنے گھر کا نقشہ بھول گئے تھے یعنی کہتے تھے کہ مجھے اب یاد نہیں آ رہا کہ میرے گھر میں کوٹھے کے اوپر کیا بنا ہوا ہے یا جس دالان میں مَیں لیٹا ہوا ہوں اس کی داہنی طرف کونسا حصہ ہے۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ جس الماری میں واجد علی شاہ کی کتابیں ہیں وہ کھول کر چار پانچ کتابیں لاؤ اور میں دیکھوں کہ آیا اب بھی ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتا ہوں یا نہیں؟ سب کو تو نہیں لیکن کچھ کتابوں کو انہوں نے پہچان لیا۔''

یہ تذکرہ لکھنؤ کے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کا۔ اور یہ مثال ہے ان گنے چُنے لوگوں کی جنہوں نے کتاب کو بھی ویسے ہی چاہا جیسے اولاد کو۔

یہاں، ہم لکھنؤ کے کتب خانوں اور دستاویزوں کے ذخیروں کی بات کر رہے ہیں۔

تاریخ چاہے کچھ بھی کہے، اس شہر کی روایت یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے اس وقت چھاپہ خانہ لگایا جب بہت سے ہندوستانیوں نے کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ ان سے اودھ چھٹا تو علم کا ذوق ساتھ لیے وہ کلکتہ پہنچے اور وہاں بھی سب سے پہلے وہی مطبع سلطانی قائم کیا اور مشین سے رات دن کتابیں نکلتی رہیں۔

مگر پھر جو حشر لکھنؤ کا ہوا وہی اس کے کتب خانوں کی درگت بنی۔ زوال آیا تو بنیادوں میں اتر گیا چنانچہ علم کی وہ شاندار عمارتیں کبھی کی ڈھے چکی ہیں۔

جو کچھ بچا ہے، اس کی دیواروں میں بھی شگاف ہیں۔

لکھنؤ کے کتب خانوں پر ایک نگاہ ڈالیں تو سب سے پہلے امیر الدولہ پبلک لائبریری کا نام آتا ہے جہاں اردو، فارسی اور عربی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے خصوصاً تاریخ کے موضوع پر یہ جگہ کسی خزانے سے کم نہیں۔

اس کے علاوہ لکھنؤ یونیورسٹی کا کتب خانہ ہے جو ٹیگور لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بھی چھپی ہوئی اور ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے لیکن ان کتب خانوں میں تحقیق کرنے والے اسکالروں کو بہت تشویش ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا انتظام اچھا نہیں، خصوصاً اردو کتابوں کی حالت خراب ہے۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کتب خانوں کا جو عملہ ہے اس میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اردو سے واقف ہی نہیں۔

تو اب صورت یہ ہے کہ محقق خود ہی جائیں اور سر گردانی کریں تو عجب نہیں کہ الماریوں اور بستوں کے اندر سے ایسے ایسے در بیش بہا نکلیں کہ دنیائے علم کی آنکھیں چکا چوندھ ہو جائیں۔ مثلاً لکھنؤ کی امیر الدولہ لائبریری کے بارے میں اردو کے مشہور محقق مشفق خواجہ نے بتایا:

''وہاں ابھی ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے مخطوطات پر کام کیا تو بڑی عجیب عجیب چیزیں وہاں سے نکل رہی ہیں۔ شعراء کے خود نوشتہ دواوین اور بعض تصانیف جو انہوں نے اپنے قلم سے لکھی تھیں وہاں دستیاب ہوئی ہیں۔ لکھنؤ میں ایک اور چیز بھی ہے جو تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اسے ابھی تک عام نہیں کیا گیا اور وہ ہے وثیقہ آفس کا ریکارڈ۔ وہاں پر لکھنؤ کے شاہی خاندان سے متعلق افراد کے بارے میں جتنی معلومات موجود ہیں وہ کسی دوسری جگہ نہیں، کاش وہ اس ریکارڈ کو شائع کر دیں''۔

لکھنؤ کے وثیقہ آفس کا ذکر نکل آیا تو شہر کے اسٹیٹ میوزیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس بارے میں اردو فارسی کے محقق اور استاد ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے بتایا:

''ایک اور اچھا مخزن کتابوں کا اور کتابوں سے زیادہ دستاویزوں کا، لکھنؤ کے اسٹیٹ میوزیم میں ہے۔ یہاں خرابی یہ ہے کہ یہاں مثلاً پورے پورے بستے ہیں اور فہرست میں صرف یہ لکھا ہے کہ منتشر تحریروں کا ایک بستہ۔ یا اگر بیاض ہے تو متفرق تحریروں کی بیاض۔ لیکن وہ متفرق تحریریں کیا ہیں؟ کس کی ہیں؟ کتنی اہم ہیں؟ اس کا اس میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور وہاں بھی وہی دقت ہے کہ وہاں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ فارسی نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں۔ وہ پرانی فارسی اور پرانی تحریر کو پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، تو اس وجہ سے اس کی کیٹلاگنگ نہیں ہو سکتی ہے''۔

لکھنؤ کا جو کتب خانہ خصوصیت سے قابل ذکر اور قابل تعریف ہے وہ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ ہے۔ جس میں اردو، فارسی اور عربی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ ایک تو خود اس ادارے نے علم کی راہوں میں کتابوں کے بے شمار چراغ روشن کیے ہیں، دوسرے یہ کہ نہ معلوم کتنے اہل علم حضرات نے اپنے پورے پورے ذخیرے ندوۃ العلماء کو تحفے کے طور پر دے دیئے۔ مثلاً مولانا عبدالحئی کا بے مثال کتب خانہ منتقل ہو کر ندوۃ العلماء میں چلا آیا۔ اس طرح یہ ذخیرہ مسلسل بڑھ رہا ہے اور اس کا انتظام بھی بہت اچھا ہے۔ اگر آپ کو کوئی کتاب درکار ہے تو فوراً ملے

گی،اچھی حالت میں ملے گی اوراپنی جگہ پر ملے گی۔

دینی مدرسوں نے شہر لکھنؤ کو بہت سے کتب خانے دیئے ہیں مثلاً کتب خانہ ناصریہ جو مولانا ناصر الملت کا قائم کیا ہوا ہے۔اسی طرح مدرستہ الواعظین، سلطان المدارس، مدرسہ ناظمیہ، مدرستہ فرقانیہ ان سب کے اپنے اپنے کتب خانے ہیں جو اگرچہ دینی کتابوں کے لیے مخصوص ہیں لیکن ان میں اور بھی بہت کچھ ہے مثلاً فارسی تذکرے،'نشتر عشق کا ایک بہت اہم مخطوطہ سلطان المدارس میں ہے مگر اس سے شاید ہی کوئی فائدہ اٹھاتا ہو۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے۔

اس کے بعد آیئے شہر لکھنؤ کے ذاتی کتب خانوں میں چلیں کبھی سیکڑوں ہوں گے مگر اب شمار کرنے کے لیے دو ہاتھوں کی انگلیاں بہت ہیں۔

سب سے پہلے ذاتی ذخیرہ ریاست محمود آباد کا ہے۔اس کتب خانے کی مطبوعہ کتابیں تو محمود آباد، ضلع سیتا پور میں ہیں لیکن تمام قلمی نسخے لکھنؤ کے محمود آباد ہاؤس میں محفوظ ہیں۔ چونکہ راجاؤں کا جمع کیا ہوا کتب خانہ ہے اس لیے اس میں بعض نہایت اہم مخطوطے ہیں۔اس کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بتایا:

''جتنے بھی کلکشن پرائیویٹ تحویل میں رہتے ہیں ان سے عوامی سطح پر استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔ برسوں ایسے کتب خانوں اور ذخیروں کے تالے بھی نہیں کھولے جاتے لیکن یہ واقعہ ہے کہ مہاراجا صاحب محمود آباد کی علم پروری، اردو دوستی اوران کی علم دوستی کی وجہ سے ہمارے دوست اکبر حیدری صاحب کو جو کشمیر میں پڑھاتے ہیں اور لکھنؤ آتے جاتے رہتے ہیں، مہاراجہ صاحب کی وساطت سے کئی بار موقع ملا ہے۔وہ کتب خانہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے لیکن اکبر حیدری صاحب نے وہاں سے دیوانِ میر لیا۔ انیس کے بہت سے نادر مراثی اور بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں دریافت کی ہیں''۔

لکھنؤ میں دوسرا بڑا ذخیرہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کا ہے۔ یہ ایک فرد واحد کی کوشش، لگن اور علم سے عشق کا نتیجہ ہے۔وہ 1922ء کے لگ بھگ لکھنؤ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تھے اور اسی وقت سے کتابیں اس طرح جمع کررہے تھے کہ خود اپنے بہت سے ضروری اخراجات ترک کردیئے تھے۔ان کے کتب خانے میں اردو اور فارسی کی بعض کتابیں نہایت نادر ہیں۔خاص طور پر مرثیوں کا ذخیرہ ان سے بہتر کسی کے پاس نہ تھا۔اسی طرح واجد علی شاہ کی جتنی تصانیف مسعود حسن رضوی ادیب کے ذخیرے میں موجود ہیں کہیں اور نہ ہوں گی۔ان کے شاندار ذخیرے کا قابل قدر حصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا ہے۔

جنہیں علم کی لگن ہو ان کا بڑا عالم، محقق، استاد یا راجا مہاراجا ہونا ضروری نہیں۔لکھنؤ اس معاملے میں بڑا خوش نصیب شہر ہے۔ مسعود حسن رضوی مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نے ایک دلچسپ

شخصیت کے بارے میں بتایا:

''محمد رشید صاحب سیکرٹریٹ میں ملازم ہیں۔ کوئی بڑے عہدے پر نہیں ہیں لیکن ان کے شوق کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی کتاب ان کو نظر آ جائے جو برائے فروخت نہیں ہے تو وہ پوری کتاب نقل کر لیں گے۔ خود میرے والد مرحوم کے ذخیرے کی بعض کتابیں جو تین تین سو صفحے کی تھیں وہ انہوں نے عاریتاً لیں اور تین تین چار چار راتیں جاگ جاگ کر خود اور گھر والوں کو ملا کر پوری پوری کتاب نقل کی ہے۔ یا کسی رسالے میں کوئی اچھا مضمون نظر آیا اور وہ رسالہ ان کی دسترس میں ہے تو وہ پورا مضمون نقل کر لیا۔ اس کے علاوہ کتابیں خریدتے بھی ہیں۔ جب تک اس ذخیرے کو آنکھ سے دیکھا نہ جائے یقین نہیں آتا کہ ان کے پاس اتنی اہم چیزیں ہیں۔ دوسرے ان کے ذخیرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ذخیرہ ہے حالانکہ ذاتی ذخیروں میں سب سے بڑی مشکل یہی ہوتی ہے کہ لوگ کسی کو آنے نہیں دیتے لیکن رشید صاحب کا یہ حال ہے کہ آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو' آپ ان سے کہیے۔ نہایت خندہ پیشانی سے وہ آپ کو بلائیں گے۔ آپ کی خاطر تواضع کریں گے۔ جتنی کتابیں آپ کو چاہئیں وہ آپ دیکھیے اور اگر بہت قیمتی کتاب نہیں ہوتی تو وہ آپ کو دے بھی دیں گے کہ اپنے گھر پر لے جا کر کام کیجیے۔ اس کے علاوہ مثلاً باہر سے آپ ان کو خط لکھیں کسی چیز کے بارے میں تو اگر بیس پچیس صفحے تک کا معاملہ ہے تو وہ اپنے ہاتھ سے نقل کر کے آپ کو بھیج دیں گے میں تو ان کو چھوٹا برٹش میوزیم کہتا ہوں۔ جس طرح ان معاملات میں برٹش میوزیم بہت مستعد ہے اس طرح ہمارے رشید صاحب بھی ہیں۔''

اسی طرح لکھنؤ کے اسلم محمود صاحب ہیں جو وزارت قانون میں اوقاف کے شعبے میں ملازم ہیں ان کو بھی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے اور اس مد میں بڑی رقم صرف کرتے ہیں۔ ان کے احباب بتاتے ہیں کہ جب کبھی سرکاری دوروں پر جاتے ہیں تو الاؤنس کی ساری رقم کتابوں کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو یورپ میں چھپی ہیں اور ہندوستان میں ان کی پہلی کاپی اسلم محمود صاحب کے پاس آئی ہے۔ پاکستان میں چھپنے والی تمام اہم کتابیں ہندوستان میں اور کسی کے پاس ہوں یا نہ ہوں' اسلم محمود صاحب کے پاس یقیناً ہوں گی۔

ایک اور صاحب کے بارے میں نیر مسعود رضوی صاحب نے بتایا:

''محمد اسحٰق صدیقی صاحب ہیں۔ رشید صاحب اور اسلم صاحب کو صرف کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے' خود لکھتے نہیں ہیں۔ اگرچہ میں بہت اصرار کرتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی مستفید کیجیے اپنے مطالعہ سے' لیکن وقت نہیں ملتا' کچھ اس طرف ان لوگوں کی طبیعت نہیں آتی۔ اسحٰق صدیقی صاحب لکھتے بھی ہیں۔ علمی موضوعات' سائنسی موضوعات' مذاہب کا تقابلی مطالعہ' اس طرح کے مضامین برابر لکھتے ہیں کئی کتابیں بھی ان کی چھپ چکی ہیں اور ایک

کتاب پر یونیسکو کا انعام بھی مل چکا ہے۔ لیکن وہ بھی محدود وسائل کے آدمی ہیں البتہ جہاں تک ہوسکتا ہے جتنی گنجائش نکل سکتی ہے وہ سب کتابوں کی خریداری پر صرف کر دیتے ہیں۔ دفتی کے ڈبے لالا کر جمع کریں گے' پھر اس میں کتابیں سجائیں گے۔ ان کو ایک اور بہت دلچسپ شوق اخباروں کے تراشے جمع کرنے کا ہے اور بڑی ہی خوش ترتیبی کے ساتھ ہزاروں تراشے جمع کیے ہوئے ہیں۔ آپ جس موضوع پر چاہیں ان سے اخباروں کے پچاس ساٹھ تراشے حاصل کر سکتے ہیں اور وہ بھی اسی طرح کمر بستہ ہیں کہ جب آپ کو کوئی ضرورت ہو وہ حتی الامکان آپ کی مدد کریں گے۔''

اسکے بعد نیر مسعود رضوی صاحب نے کہا کہ ان کے نزدیک یہ ذاتی ذخیرے والے حضرات زیادہ قابل قدر ہیں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ذخیروں کی باقاعدہ فہرست سازی ہونی چاہیے کیونکہ اس میں دقت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص خود کتابیں جمع کرتا ہے اس کو ہر کتاب کا پورا احوال معلوم ہوتا ہے لیکن بعد والوں کے لیے بڑی پریشانی ہو جاتی ہے۔ نیر مسعود رضوی صاحب کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ ان کے والد پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے میں پندرہ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں۔ خود پروفیسر صاحب کو ہر کتاب کا علم تھا چنانچہ فہرست کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ نیر مسعود صاحب کے بقول ''ابا کو اگر کوئی کتاب نکلوانا ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ فلاں کمرے میں فلاں الماری ہے' اس کے تیسرے خانے میں داہنے ہاتھ سے پانچویں کتاب ہے' اتنی موٹی ہے' سرخ رنگ کی جلد ہے' کتھی رنگ کے چمڑے کی پشتی ہے۔ ان کے والد محترم کے بارے میں یہاں تک کا احوال تو آپ نے مجھ سے سنا' باقی نیر مسعود رضوی صاحب کی زبانی:

''ان کا کہنا تھا کہ اپنی کتابوں کو اس طرح پہچانتا ہوں جس طرح اپنے بچوں کو پہچانتا ہوں۔ ان کے آخر وقت کا ایک واقعہ ہے۔ جب مرض الموت ان پر طاری ہوا وہ اس وقت اپنے گھر کا نقشہ بھول گئے تھے یعنی کہتے تھے کہ مجھے اب یاد نہیں آ رہا کہ میرے گھر میں کوٹھے کے اوپر کیا بنا ہوا ہے یا جس دالان میں مَیں لیٹا ہوا ہوں اس کی داہنی طرف کونسا حصہ ہے۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ جس الماری میں واجد علی شاہ کی کتابیں ہیں وہ کھول کر چار پانچ کتابیں لاؤ اور میں دیکھوں کہ آیا اب بھی ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتا ہوں یا نہیں؟

اور سب کو تو نہیں لیکن کچھ کتابوں کو انہوں نے پہچان لیا۔ تو یہ جو دقت ہے کہ انہوں نے تو پہچان لیا لیکن میں نہیں پہچان سکتا ہوں۔ اب اگر آپ مجھ سے واجد علی شاہ کی کوئی کتاب مانگیں گے تو میں بیس کتابیں سرکاؤں گا تب وہ ملے گی۔ اور ان ہزاروں کتابوں میں ظاہر ہے کہ کچھ اندازہ تو ضرور ہے کہ کونسی کتاب کہاں ملے گی لیکن جیسے وہ اپنے وقت میں' اپنی زندگی میں' ایک منٹ کے اندر کتاب نکال لیتے تھے میں اتنی جلدی نہیں نکال سکتا۔ تو اب اس فکر میں ہوں کہ اس کی باقاعدہ کیٹلاگنگ ہو' لیکن اس میں وہی کہ اپنے ذاتی' دوسرے کام یا مصروفیتیں وغیرہ ہیں

ان کی وجہ سے ہونہیں پا رہا ہے۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے اور اس میں کوئی قدم کسی قسم کا اٹھانا چاہیے تا کہ ذاتی ذخیروں کی فہرست سازی بہت قاعدے سے ہو جائے۔ اس لیے کہ بہت اہم کتابیں ذاتی ذخیروں میں موجود ہیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو ہے"۔

علم اونچا ہوا ہے

میں کتاب کے موٹے موٹے ورق پلٹ رہا تھا۔ ایک ہزار سال پرانی عربی کو پڑھنے کو کوشش کر رہا تھا اور اپنی ناکامی پر خود مسکرا رہا تھا۔ اچانک ایک ورق کے بیچوں بیچ بڑا سا گول سوراخ نظر آیا۔ صفحے کے وسط میں گول سوراخ کا کیا کام؟ اور سوراخ بھی اتنا پرانا کہ کاتب لکھتے لکھتے جب اس جگہ پہنچا تو سوراخ کو پھلانگ کر نکل گیا اور آگے لکھنا شروع کر دیا۔

کسی نے مجھے بتایا: اس جگہ ہرن کی ناف تھی۔

412ھ میں امام مالکؒ کی یہ فقہ ہرن کی کھال پر لکھی گئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانے میں یہی سب سے قدیم کتاب تھی۔

کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا' گویا پیدا ہی نہیں ہوا اور میں بڑے ادب سے اس میں یہ اضافہ کر دوں کہ جس نے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کا کتب خانہ نہیں دیکھا گویا اَن پڑھ رہا۔

لاہور کی اور علم و حکمت کی باتیں ساتھ ساتھ چلیں تو شاید کبھی ختم نہ ہوں۔ کیسا گہوارہ رہا ہے تعلیم اور دانش کا اور کیسی درسگاہ بنا ہے ادب کی اور شاعری کی۔

ابھی کچھ روز ہوئے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اپنے زمانے کے لاہور کی اور اس وقت کے اہل علم اور اہل ادب کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی زبان پر اتنے بہت سے نام آئے کہ تسبیح چھوٹی پڑ گئی۔ کہنے لگے:

''دوسری عالمگیر جنگ ستمبر 1939ء میں شروع ہوئی اس سے پہلے جو سات آٹھ سال کا عرصہ گزرا ہے وہ اردو ادب کی ترقی کے لحاظ سے لاہور کا سب سے روشن اور بھرپور دور تھا۔ پھر وہ دور نہیں آیا''۔

لاہور کے اورینٹل کالج میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال' پروفیسر محمد شفیع' حافظ محمود شیرانی' گورنمنٹ کالج میں پطرس بخاری۔ اور پھر خود اقبال' ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں' ہندوؤں میں لاجپت رائے اور ہندو شعراء کی تعداد

بہت زیادہ تھی۔ تلوک چند محروم' نیلا رام وفا' نانک چند ناز' اودے سنگھ شائق' کرپال سنگھ بیدار' سوہن لال ساحر۔ اردو نثر لکھنے والوں میں کرشن چندر وغیرہ ابھر رہے تھے۔ اُپندر ناتھ اشک' کنہیا لال کپور' یہ سب اردو لکھتے تھے۔ سیاست کی بات اور ہے لیکن اس وقت نہ ہندی کا چرچا تھا نہ گورمکھی کا چرچا تھا' اردو چلتی تھی۔

ایسے لوگوں کے شہر میں علم خوب خوب پھلا پھولا۔ کتب خانوں کی الماریاں دیکھتے دیکھتے بھرنے لگیں اور حقیقت یہ ہے کہ لائبریریاں اُبل پڑیں۔ اس وقت لاہور میں تین بڑے کتب خانے ہیں۔ پنجاب پبلک لائبریری جسے قائم ہوئے سو برس ہو رہے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری 1972ء میں جس کی عمر کے سو سال پورے ہوئے اور سردار دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری جو امرتسر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک باشندے کی ایسی شاندار یادگار ہے کہ جس سے اس کا نام بھی زندہ ہے اور علم کو پھیلانے کی اس کی تمنا بھی۔

اور اب ایک چوتھا مینار بلند ہو رہا ہے۔ لاہور کے باغ جناح میں قائداعظم لائبریری قائم ہو رہی ہے۔ یہ جدید کتب خانہ ہوگا جو نئے دور کے تقاضے پورے کرے گا۔

مگر اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اہل نظر جو نئے کتب خانے تعمیر کر رہے ہیں' ضرور کریں مگر ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ پرانے کتب خانوں کا کیا ہوگا۔ کتابوں کے قدیم ذخیروں کو اندھیرے کمروں اور سیلے ہوئے تہہ خانوں سے دن کی روشنی میں کون نکالے گا اور کیونکر؟ کیا اس تاریخی خزانے کو موسم کے اثرات سے محفوظ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں منتقل کرنا زیادہ اہم نہیں؟

پنجاب پبلک لائبریری کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے ایک چھوٹے سے پاکٹ کیلکولیٹر کی ضرورت تھی۔ پورے دو سال تک خط و کتابت کی گئی تب کہیں 1981ء کے آخر میں ایک جیبی کیلکولیٹر نصیب ہوا اب اگر اسی پر حساب لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ اسے حاصل کرنے کی کوشش میں کام کے جتنے گھنٹے صرف ہوئے اتنے گھنٹوں کی اجرت میں ایک چھکڑا ابھر کر کیلکولیٹر فراہم کیے جاسکتے تھے۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخری بیس پچیس برسوں میں انگریزوں نے برصغیر کے دو بازوؤں میں دو بڑے کتب خانے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ایک کتب خانہ کلکتہ میں قائم ہوا جو امپیریل لائبریری کہلایا اور دوسرا کتب خانہ لاہور میں شاہ جہاں کے گورنر وزیر علی خان کی تعمیر کی ہوئی عالیشان بارہ دری میں قائم ہوا۔

کلکتہ کی لائبریری اب ہندوستان کی قومی لائبریری ہے اور ملک میں چھپنے والی ہر کتاب کی ایک جلد وہاں پہنچنا لازمی ہے۔ اس کے برعکس لاہور کی بارہ دری پر تاریکی' سلین' مچھروں اور چمگادڑوں کا تسلط ہے چنانچہ کتب خانے کو نکال کر بہتر عمارتوں میں بسا دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ 1981ء میں کسی کو خیال آیا کہ کتابوں کو شمار کیا جائے۔ رجسٹر میں سوا دو لاکھ کتابوں کا اندراج تھا مگر الماریوں میں رکھی ہوئی کتابیں گنی گئیں تو وہ 47 ہزار کم تھیں۔ وقت کے ہاتھوں اردو کی پندرہ ہزار اور انگریزی کی گیارہ ہزار کتابیں ضائع ہو چکی تھیں۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے ہنگاموں کے دوران جو خزانہ ہاتھ سے جاتا رہا اس پر تو اب صبر کر لینا ہی بہتر ہوگا لیکن ممتاز حسین صاحب نے اپنی بیٹی رفعت سلطانہ کی یاد میں ٹرسٹ قائم کر کے لائبریری کو آٹھ ہزار سے بھی زیادہ کتابیں دی تھیں ان میں سے دیکھتے دیکھتے تقریباً چھ ہزار لاپتہ ہو گئیں۔ یہ ابھی حال ہی کی بات ہے۔

لوگ اول تو مطالعے کے لیے آتے نہیں اگر آتے ہیں اور کتابیں گھر لے جاتے ہیں تو پھر انہیں واپس نہیں لوٹاتے۔ صرف دس برسوں میں پونے دو ہزار کتابیں یوں جاتی رہیں۔ ایک نامور صحافی اور ادیب ہٹلر کی سوانح اپنے گھر لے گئے جو دو جلدوں میں تھی۔ انہوں نے پہلی جلد پورے دس سال بعد لوٹائی اور دوسری سے بالکل ہی انکاری ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود پنجاب پبلک لائبریری کی فہرستوں پر نگاہ دوڑائی جائے تو انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کی بے مثال مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ صرف اسلامیات کے موضوع پر چھ ہزار کتابیں ہیں۔ مشرقی علوم کی جن کتابوں کا فہرست میں اندراج نہیں ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔

کتب خانے کا وہ شعبہ جو بیت القرآن کہلاتا ہے اس میں قرآن اور تفسیر کے تقریباً تین ہزار ایسے نسخے جمع ہیں کہ جو دیکھے وہ دیکھتا ہی رہ جائے۔ اس کے علاوہ وہاں سنسکرت، گورمکھی اور ہندی کتابوں کا کافی بڑا ذخیرہ ہے۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی تقریباً اٹھارہ سو کتابیں ہیں جن میں اردو فارسی اور عربی کے علاوہ پنجابی، ہندی، کشمیری، ترکی، پشتو، سنسکرت اور گورمکھی مخطوطے شامل ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری چونکہ قدیم ہے اس لیے اس میں پرانے اخباروں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے مگر اس پر بھی بڑا سانحہ گزرا ہے۔ مثلاً اخبار زمیندار میں نے بہت ڈھونڈا اور کہیں نہ پایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ کبھی موجود تھا اور بڑی آن بان سے تھا۔

ایک اور دولت جو اس خزانے میں موجود ہے وہ لاہور کے تاریخی پیسہ اخبار کی فائلیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبھی یہاں پیسہ اخبار کا ایک ایک شمارہ محفوظ تھا۔ اب پورے پورے برس کی فائلیں لاپتہ ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری کی بنیادیں بہت شاندار ہیں۔ ان بنیادوں پر ویسی ہی شاندار عمارت کھڑی کر لی جاتی تو باغ جناح میں نئے کتب خانے کے قیام سے کہیں بڑا کارنامہ ہوتا۔

بات شروع ہوئی تھی پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے جہاں اس وقت تین لاکھ کتابیں ہیں، انگریزی کو

چھوڑ کر دوسری زبانوں میں وہاں اسی ہزار چھپی ہوئی کتابیں ہیں اور ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں کا حال یہ ہے کہ عربی، فارسی، اردو، پنجابی، پشتو وغیرہ کی دس ہزار اور دیوناگری رسم الخط میں آٹھ ہزار مخطوطے ہیں۔ کئی کتابیں تاڑ کے پتوں پر لکھی گئی ہیں اور ہرن کی کھال پر لکھی ہوئی 412ھ کی فقہ امام مالک کا احوال آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہ کتب خانہ یقیناً خوش نصیب ہے کہ اس کے لیے یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں بالکل نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔

لاہور کا تیسرا بڑا کتب خانہ وہ ہے جس کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی آج بھی سب سے پہلے ایک خوش شکل، وجیہہ اور شاندار شخص کے سنگ مرمر کے مجسمے سے ملاقات ہوتی ہے جو خود تو صحیح سلامت ہے صرف آنکھوں کی پتلیاں غائب ہیں۔

یہ سردار دیال سنگھ ہیں جن کی بڑی تمنا تھی کہ لاہور میں ایک شاندار کالج اور ایک کتب خانہ قائم کریں۔ یہ بھی شاید نیک نیتی کا صلہ ہے کہ تاریخ کے دھاروں کے رخ بدلے گئے مگر دیال سنگھ کا کالج اور کتب خانہ بھی زندہ ہے اور خود ان کا نام بھی۔

اس وقت کی شاندار سڑک نسبت روڈ پر یہ کتب خانہ سردار صاحب کی وفات کے پورے تیس سال بعد قائم ہوا تھا مگر برصغیر تقسیم ہوا تو اس کے تمام ٹرسٹی جو غیر مسلم تھے اسے بند کر کے ہندوستان چلے گئے اور یہ شاندار کتب خانہ پورے پندرہ سال بند پڑا رہا۔ بلکہ اس دوران ہندوستان سے آئے ہوئے بے گھر پناہ گزینوں نے اس میں رہائش اختیار کر لی اور اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ کتب خانے کے اندر روزانہ دو وقت چولہا جلانے کے لیے ایندھن کہاں سے آتا ہوگا۔

کہتے ہیں کہ پندرہ سال بعد جب دیال سنگھ لائبریری دوبارہ کھولی گئی تو اس کی کتابیں الماریوں میں کم اور نیچے فرش پر زیادہ تھیں اور ان کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ لیکن اب خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ مرکزی حکومت کی مذہبی اور اقلیتی امور کی وزارت کی نگرانی میں ہے چنانچہ کتب خانے میں زندگی کی لہر دوڑی ہے۔ یہاں مطالعہ کے لیے آنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی، پھر کسی کو خیال آیا تو اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابوں کا بہت بڑا شعبہ کھول دیا چنانچہ اب یہ کتب خانہ طالب علموں سے بھرا رہتا ہے۔

دیال سنگھ لائبریری میں کتابوں کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ کر سوا لاکھ ہو گئی ہے۔ ایک ہزار کے قریب قلمی نسخے ہیں جن کی تفصیلی فہرست چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

دیال سنگھ لائبریری پرانی اور نایاب کتابیں دوبارہ چھاپ رہی ہے۔ وہاں حیدر آباد کے مشہور جریدۂ اسلامک کلچر کے قدیم شماروں کی نئی اشاعت شروع ہو گئی ہے جو تیس جلدوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور اسلامی ثقافت پر پورا انسائیکلوپیڈیا ہوں گے۔

لائبریری میں شعبہ تحقیق موجود ہے جو اسلامی موضوعات پر ریسرچ کر رہا ہے اور اس نے ''اسلام کا قانون شہادت'' کے عنوان سے نئی کتاب شائع کی ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں لائبریری کے فن کی تربیت شروع کی گئی ہے جس میں انڈر گریجویٹ نوجوان چھ ماہ کا کورس مکمل کر کے سرٹیفکیٹ پاتے ہیں۔ اس قسم کے اب تک سولہ سے زیادہ کورس ہو چکے ہیں۔

کتب خانے کی شان یہی ہے کہ وہ زندہ ہو، جیتا جاگتا ہو، متحرک ہو اور فعال ہو۔ وہ کسی نکڑ پر بنی ہوئی عمارت نہ ہو کہ صرف ضرورت مند چل کر وہاں آئیں بلکہ وہ خود چل کر جائے اور تاریک ذہنوں میں علم کی لو اونچی کرے۔ شکر ہے کہ لاہور میں علم کا یہ علم اونچا ہوا ہے۔

چور دلاور ہو گئے

ہم حیدر آباد کی کچی اور تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے اس علاقے میں جا پہنچے جہاں ایک پرانا قبرستان تھا۔ ہر طرف بہت سے چھوٹے بڑے مقبرے تھے' کچھ ڈھے گئے تھے اور کچھ مقبروں کی پیٹھ قدامت کے بوجھ تلے جھک رہی تھی۔ بالآخر ہم ایک چھوٹے سے سالم اور ثابت مقبرے میں داخل ہوئے۔ درمیان میں کسی دکنی شہزادی کی قبر تھی جس پر سبز ریشمی چادر پڑی تھی اور اطراف میں دیواروں کے ساتھ ساتھ پرانی کتابیں چنی تھیں۔ یہ سید محمد عبدالرزاق عرشی صاحب کا کتب خانہ تھا۔

مقبرہ بھی قدیم ہے' کتابیں بھی پرانی ہیں اور خود عرشی صاحب بھی ضعیف ہیں۔ ان سے گفتگو ہوئی تو عرشی صاحب کی ذات گرامی اور شخصیت اس کتب خانے کی سب سے دلچسپ کتاب ثابت ہوئی۔ عبدالرزاق عرشی صاحب کو کتابوں سے والہانہ عشق تھا چنانچہ عمر بھر کتابیں جمع کرتے رہے' پڑھتے رہے' لکھتے رہے اور کتابوں کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کی مدد کرتے رہے۔ انہوں نے دکن کی سرزمین پر تقریباً تین چوتھائی صدی گزاری ہے۔ انہوں نے زمانے کے کتنے ہی سیلاب آتے اور جاتے دیکھے ہیں' گھر بنتے اور اجڑتے دیکھے ہیں۔ کتب خانوں کی الماریوں میں بجتی ہوئی کتابیں دیکھی ہیں۔ پھر ان ہی کتابوں کو بازاروں میں اونے پونے فروخت ہوتے دیکھا ہے۔

عرشی صاحب کتابوں اور کتب خانوں کی داستانیں سنا رہے تھے' میں شہزادی کی قبر پر کہنی ٹیکے بیٹھا تھا اور بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ بتا رہے تھے کہ دکن میں کسی زمانے میں کتابوں کے ذخیروں کی کیا آن بان تھی۔

''ہر گھر میں ذخیرہ ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر امراء اور رؤسا ہوتے تھے چاہے وہ علم کی صلاحیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں لیکن بحیثیت امیر ہونے کے ان کے لیے تین چیزیں لازمی تھیں۔ ایک اسلحہ خانہ' دوسرا

کتب خانہ اور تیسرا جواہر خانہ"۔

کہنے لگے کہ کتنے ہی امیر اور نواب تو ایسے تھے کہ ان کے منشی کتابیں پڑھ کر انہیں بتا دیا کرتے تھے کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ اس کے بعد امراء اور رؤسا محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھ کر ان کتابوں کی باتیں کچھ یوں کرتے تھے جیسے خود ان کے گھر میں تصنیف کی گئی ہوں۔

مگر خیر! وہ زمانہ بھی گیا اور وہ طور طریقے بھی رخصت ہوئے۔ میں نے عبدالرزاق عرشی صاحب سے پوچھا کہ اب اس نئے دور میں حیدر آباد میں کتنے کتب خانے ہیں؟ انہوں نے مخصوص دکنی لہجے میں:

"حیدر آباد میں بیسیوں کتب خانے ہیں اور سب سے بڑا کتب خانہ تو اسٹیٹ لائبریری ہے۔ اس کو نواب عماد الملک، محسن الملک اور چراغ علی، یہ لوگ مل کر غالباً تیرہ سو ہجری میں قائم کیے۔ اس کی نظامت کے لیے مولانا علی حیدر صاحب طباطبائی کو وہاں مہتمم کی خدمت پر فائز کیا گیا۔ عماد الملک محکمہ تعلیم سے خریداری کتب کے لیے پانچ ہزار روپے کی گرانٹ اس زمانے میں دیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ جب ہمارا دور آیا اور کتب خانہ آصفیہ جب نئے پل کے پاس بنا تو نواب بہادر یار جنگ نے، چونکہ صدر کتب خانہ تھے، اعلیٰ حضرت سے کہہ کر 57 ہزار روپے تک اس کا گرانٹ منظور کرائے جس میں پچاس ہزار روپے صرف اردو، عربی، فارسی کتب کے لیے اور 25 ہزار روپے انگریزی کتب کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ کتابوں کی وہ خریداری برابر جاری رہی۔ جس قدر بھی حیدر آباد کے نادر کتب خانے تھے وہ نواب بہادر یار جنگ کے توسط سے کتب خانہ آصفیہ کے لیے خریدے جاتے تھے۔"

تو یہ شان تھی کتب خانہ آصفیہ کی۔ 1891ء میں یہ آصف جاہی دور کا یادگار مینار بن کر ابھرا، حکومت آصفیہ کا عوامی کتب خانہ قرار پایا۔ نواب عماد الملک، مولوی چراغ علی اور مولوی محب حسین جیسے ذی علم حضرات کے ذاتی کتب خانے اٹھ کر اس عظیم الشان لائبریری میں آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس میں دو لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں جن میں سولہ ہزار سے زیادہ قلمی نسخے تھے اور قلمی نسخے بھی ایسے کہ ان میں قطب شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی دور کے ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف بھری پڑی تھی۔ غالب اور میر کی تحریریں بھی ملتی تھیں اور عربی، فارسی اور اردو کا کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس کی کتابیں کتب خانہ آصفیہ کی الماریوں میں موتی کی طرح جھلملاتی نہ ہوں۔

آج بھی اس کتب خانے کی شاندار عمارت کے گنبد اور محرابیں سامنے بہتے ہوئے دریا میں اپنا عکس دیکھا کرتے ہیں۔ وہ نہیں بدلے البتہ ان کا نام بدلا گیا۔ آصف جاہی دور کی یہ یادگار اب آندھرا پردیش کی اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کہلاتی ہے۔

میں وہاں گیا تو ذہن کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ یقیناً بہت بڑا کتب خانہ تھا مگر نئے حالات نے اسے ویسا نہ رکھا جیسا میں نے سوچا تھا۔ آندھرا پردیش اب پانچ زبانوں کا سنگم ہے اور چونکہ یہ ریاست کی مرکزی لائبریری

ہے اس لیے اس میں پانچوں کا بسیرا ہے۔ میری نگاہیں اردو، فارسی اور عربی کتابیں تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے کتب خانے کے عملے سے کہا کہ کچھ کتابیں لا کر دکھا دیجیے۔ انہوں نے کہا کہ کتابیں باہر لانے کی ضرورت نہیں۔ نئے رواجوں کے مطابق آپ خود کتابوں کی الماریوں کے پاس جا سکتے ہیں اور جو کتاب چاہیں نکال کر دیکھ سکتے ہیں۔

اور پھر میری درخواست پر انہوں نے مجھے اس بڑے کمرے میں پہنچا دیا جہاں لوہے کی قدیم الماریوں میں اردو، فارسی اور عربی کی کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ کہیں دور ریلوے اسٹیشنوں کے غسلخانے جیسا مدھم سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور کتابیں کچھ اس طرح سو رہی تھیں کہ میں ان کے سرہانے بولا تو اس بات کا بہت خیال رکھا کہ آہستہ بولوں۔

میں نے کتب خانے کے ایک نگران جناب عبدالقادر صاحب سے پوچھا کہ یہ کسمپرسی کا عالم کیوں ہے، ایک یتیمی سی کیوں نظر آتی ہے، تو کہنے لگے۔

''یہاں عربی، فارسی اور اردو کی بہت پرانی اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ بعض تو دو دو سو سال پرانی ہیں لیکن یہاں عربی، فارسی کا کوئی قابل آدمی نہیں ہے کہ اس شعبے کی نگہداشت کرے۔ حکومت چاہتی ہے کہ کوئی تقرر ہو لیکن عربی جاننے والے لوگ آجکل عرب ملکوں کو آسانی سے چلے جا رہے ہیں جہاں زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں، یہاں سرکاری تنخواہیں کم ہیں اس واسطے اس کا صحیح انتظام نہیں ہو سکا''۔

یہ تو ہوا چھپی ہوئی کتابوں کا احوال، وہ جو ہاتھ سے لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں تھیں جن کی وجہ سے کتب خانہ آصفیہ مشہور تھا وہ کیا ہوئیں؟ پتہ چلا کہ وہ اسٹیٹ آرکائیوز میں منتقل کر دی گئی ہیں۔

مگر کیوں؟

کسی نے کہا کہ اچھا ہی ہوا۔ بہت ہی نادر اور بیش قیمت مخطوطے تھے۔ یہاں ان کی حفاظت اور دیکھ بھال ممکن نہ تھی لہٰذا انہیں اب اسٹیٹ آرکائیوز کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا ہے جہاں وہ تحقیق کرنے والوں کو دستیاب ہیں۔

تب پتہ چلا کہ کتب خانہ آصفیہ عُرف اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کی کتابوں پر سب سے بڑا ظلم دیمک، کیڑوں، خاک، دھول، اندھیرے اور سلین نے نہیں بلکہ ہم نے، آپ نے، پڑھنے والوں نے، محققوں نے اور طالب علموں نے کیا۔ غضب یہ ہوا کہ الماریاں پڑھنے والوں کے لیے کھول دی گئیں۔ قارئین کو کتابوں تک رسائی کی اجازت دے دی گئی۔

پہلے تو لوگ کاغذ قلم لے کر آتے تھے اور نوٹس بنا کر گھر لے جاتے تھے۔ اب وہ بلیڈ اور قینچیاں لے کر

آنے لگے اور پرانی پرانی نایاب کتابوں کے تمام مطلوبہ صفحے کاٹ کاٹ کر لے جانے لگے بعض لوگ اپنے ظرف کے مطابق مطلوبہ صفحے نہیں بلکہ پوری پوری کتابیں لے گئے۔ اس پر ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی بات یاد آ گئی۔

''ایک اور لائبریری ہے جو اس وقت' میں کہوں گا کہ بہت ہی گوشہ گمنامی میں چلی گئی ہے' حیدرآباد میں ہے اور بہت ہی اہمیت کی لائبریری ہے' وہ ہے آصفیہ لائبریری اور اس کے ذخیرے کے بارے میں آئے دن خبریں آتی ہیں کہ وہ خورد برد ہو رہا ہے''۔

ہم نے تصدیق کے لیے کتب خانے کے نگران عبدالقادر صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ کتابوں کے ورق غائب ہو جاتے ہیں اور چور اب اتنے دلاور ہو گئے ہیں کہ پوری پوری کتابیں آستینوں میں چھپا کر اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں؟ انہوں نے کہا:

''یہ مرض تو عام ہے۔ آپ کو ہر لائبریری میں یہ شکایت ملے گی۔ لیکن اصل بیماری یہ نیا نظام اوپن ایکسس سسٹم ہے جس میں ہر ریڈر جا کر شیلف سے اپنی کتاب خود نکال سکتا ہے۔ ہمارے لوگ اتنے تعلیم یافتہ نہیں ہیں کہ کتابوں کی اہمیت کو محسوس کریں چنانچہ یہ مسئلہ ہر لائبریری میں ہے۔ یہاں بھی کافی چوریاں ہوتی ہیں اور کتابیں لاپتہ ہوتی ہیں ہزار کوشش کی جائے لیکن ہر قاری کے پیچھے ایک آدمی نہیں لگایا جا سکتا اور ہر ایک کو چور تو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ معاملہ ہمارے پاس بھی بہت تشویشناک ہے اور اس پر کیسے قابو پایا جائے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔''

آندھرا پردیش کی اس مرکزی لائبریری میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں مثلاً کتابوں کو کیڑوں مکوڑوں سے بچانے' موسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے اور ان کی جلدیں باندھنے کا معقول انتظام ہے لیکن ایک بڑی خوبی ایسی ہے کہ جس کے بہت جلد ختم ہو جانے کا خطرہ ہے۔

اس قدیم کتب خانے کے لیے پہلے دن' یعنی 1891ء سے اب تک اگر کوئی کاغذ بھی خریدا گیا ہے تو وہ بھی ابھی تک رکھا ہوا ہے۔ کتنی ہی کتابوں' رسالوں اور اخباروں کے کاغذ اب اتنے خستہ ہو گئے ہیں کہ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتے ہیں مگر لائبریری نے انہیں ابھی تک پھینکا نہیں ہے۔ ادھر اب یہ عمارت تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ نئی نئی کتابیں اور جریدے چلے آ رہے ہیں اور گنجائش نکالنے کے لیے پرانے ذخیروں کو تا حال سرکایا نہیں گیا ہے مگر یہ سلسلہ ہمیشہ نہیں چلے گا۔ وہ وقت شاید دور نہیں جب بعض پرانی کتابوں خصوصاً اخباروں' رسالوں اور جریدوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا جیسا کہ عبدالقادر صاحب نے ہمیں بتایا۔

''اٹھارہ سو اکیانوے سے اب تک جو کچھ بھی اس لائبریری نے خریدا تھا اس کا ایک کاغذ بھی فروخت نہیں کیا گیا ہے لیکن اب جگہ کی قلت کی وجہ سے ایک تجویز ہے کہ یہ مسئلہ کسی کمیٹی کے حوالے کیا جائے جو طے کرے

کہ کس تاریخ تک کا مواد محفوظ کیا جائے اور کس تاریخ سے پہلے کا مواد ٹھکانے لگایا جائے۔ اس کا ابھی تصفیہ نہیں ہوا ہے اور جو بھی اخبار، رسالے اور کتابیں یہاں آئی ہیں ابھی تک نکالی نہیں گئی ہیں''۔

یہ وقت بہت کڑا ہے کوئی اٹھے اور اخباروں، رسالوں اور جریدوں کے اس پرانے ذخیرے کو اپنی تحویل میں لے کر بچالے ورنہ نئے دور کی تاریخ کے نہ معلوم کیسے کیسے گوشے ہمیشہ کے لیے تاریکی میں یا پھر سامنے بہتی ہوئی موسیٰ ندی میں ڈوب جائیں گے۔

اسٹیٹ سنٹرل لائبریری کے سولہ ہزار سے زیادہ قلمی نسخوں کی بات ہو رہی تھی جو اب اسٹیٹ آرکائیوز میں منتقل کر دیئے گئے ہیں چنانچہ ہم بھی اپنی گفتگو وہیں منتقل کرتے ہیں۔ یہ آصف جاہی دور کا دفتر دیوانی و مال و ملکی و مناصب و مواہیر سرکاری عالی تھا جس میں دکن کے تاریخی ریکارڈ کی حفاظت کی جاتی تھی۔ آرکائیوز کے پہلے ناظم مولوی سید خورشید علی صاحب کی کوششوں سے وہاں تاریخی کتابوں کے لیے ایک کتب خانہ بھی قائم ہوا تھا اور ایسی ایسی کتابیں جمع کی گئی تھیں جن میں ٹیپو سلطان کے زمانے کی تاریخ ''فتح المجاہدین'' کلیات علی عادل شاہ اور نورس نامہ جیسے نام آتے ہیں۔ اس ادارے میں جو دستاویزیں محفوظ ہیں ان کا احوال ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب نے سنایا جو اسٹیٹ آرکائیوز سے وابستہ رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا:

''آندھرا پردیش کے آرکائیوز میں دو کروڑ کاغذ تو صرف مغلوں کے ہیں اور ان کے علاوہ بہمنیوں کے، قطب شاہوں، بریشاہوں اور انگریزوں کے بہت سے کاغذ ہیں۔ قدیم ترین کاغذ اس دور کے ہیں جب تیمور زندہ تھا اور فیروز شاہ بہمنی کا فرمان 1460ء کا ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ سرکاری ادارے میں محفوظ قدیم ترین کاغذ ہے''۔

کتب خانہ آصفیہ کا ذخیرہ آ جانے سے اسٹیٹ آرکائیوز کی لائبریری بہت بڑی دولت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مخطوطے یہاں محفوظ رہیں گے لیکن دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کتابیں پڑھنے والوں کو باآسانی مل جایا کریں اور دوسرے یہ کہ پڑھنے والے ان کا ادب اور احترام اسی طرح کریں جس طرح سعادت مند بچے اپنے بزرگوں کی تکریم کرتے ہیں۔

ناخلف اولادوں نے اگر یہاں بھی قینچی اور بلیڈ کا استعمال کیا تو ہماری تہذیب کا دامن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تار تار ہو جائے گا۔

دروازہ خاور بند ہے

اس روز ہم جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے کی سیر کر رہے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور کتب خانہ اتنا بڑا ہے کہ اسے دیکھنے اور اس کے رموز سمجھنے کے لیے سارا دن درکار تھا۔ ریفرنس اسسٹنٹ فاطمی صاحب ہمیں اپنے کتب خانے کا ایک ایک شعبہ دکھا رہے تھے میں نے ان سے درخواست کی کہ ہمیں جلد فارغ کر دیں کیونکہ یہاں سے ہمیں دائرۃ المعارف بھی جانا ہے۔

دائرۃ المعارف' حیدر آباد دکن کا وہ شاندار ادارہ ہے جو بہت عرصے سے عربی علوم پر نہ صرف تحقیق کر رہا ہے بلکہ اس دور میں بھی' جب برصغیر سے عربی کا علم اٹھتا جا رہا ہے' یہ دائرۃ المعارف اپنی تحقیق کی بنا پر آج تک نئی نئی کتابیں شائع کر رہا ہے۔

میں نے جو کہا کہ دائرۃ المعارف دیکھنا چاہتا ہوں' فاطمی صاحب بولے کہ آئیے' میں آپ کو دائرۃ المعارف دکھائے دیتا ہوں۔ مجھے ہمراہ لے کر وہ کتب خانے کے پچھلے حصے کی جانب چلے۔ میں سمجھا کہ کسی کھڑکی سے مجھے دائرۃ المعارف کی عمارت دکھا دیں گے' مگر سب سے آخری الماری کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک خانے میں قرینے سے چنی ہوئی تقریباً پچاس کتابیں دکھائیں جو بہت عمدہ حالت میں رکھی تھیں جیسے پڑھنے والوں نے ان کے ورق ہاتھوں سے نہیں بلکہ پلکوں سے پلٹے ہوں۔

کہنے لگے: یہ ہے دائرۃ المعارف کی مطبوعات کا پورا سیٹ جو حیدر آباد دکن کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے کے سب سے بڑے کتب خانے میں رکھا ہے لیکن آج تک ان کتابوں کو پڑھنے ایک شخص بھی نہیں آیا۔ نہ کسی نے یہ کتابیں دیکھنے کو مانگیں اور نہ گھر لے جانے کو جاری کرائیں۔ یہ ہے دائرۃ المعارف!

ہندوستان کے کتب خانوں کا المیہ یہ بھی ہے۔ عربی' فارسی کا علم اب بس تھوڑے دنوں کا مہمان ہے۔ اوپر سے غضب یہ کہ تاریخی کتب خانے عربی اور خاص طور پر فارسی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب پڑھنے

والے نہیں رہیں گے تو پھر یہ کتابیں کیوں رہیں گی؟

جامعہ عثمانیہ میں بڑی روشن، کشادہ، جیتی جاگتی لائبریری ہے جس میں اب پونے چار لاکھ کتابیں ہیں۔ وہاں اردو، فارسی اور عربی کی چھپی ہوئی تین ہزار اور قلمی دو ہزار کتابیں موجود ہیں لیکن وقت کی دوڑ میں یہ ذخیرہ اور یہ زبانیں اب دوسری زبانوں سے پیچھے رہی جاتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں یہ کتابیں تو ہیں مگر ان کے ہونے سے کبھی وہ جو اک رعنائی خیال تھی وہ اب کہاں؟ جیسا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا۔

''عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا کردار، اورینٹل اسٹڈیز اور علوم اسلامیہ کے معاملے میں یا اردو تحقیق کے معاملے میں اب وہ نہیں رہا جو مولوی عبدالحق کے زمانے میں ہوا کرتا تھا یا جس زمانے میں وہاں دارالترجمہ تھا جس میں وحید الدین سلیم تھے اور کسی زمانے میں علی بلگرامی تھے اور دوسرے حضرات تھے جنہوں نے کتنا مہتم بالشان کام کیا۔ ظاہر ہے کہ اب وہاں اردو کا ایک معمولی سا شعبہ ہے اور وہاں کتابوں کے ذخائر سے جتنا استفادہ ہو سکتا ہے، شاید نہیں ہو رہا ہے۔''

اور اب تذکرہ اس عظیم الشان ذخیرے کا جو سالار جنگ میوزیم لائبریری کہلاتا ہے اور حیدرآباد دکن کی موسیٰ ندی کے کنارے محرابوں اور گنبدوں سے آراستہ ایک عمارت میں ہر اس شخص کے لیے کھلا ہے جسے علم کی جستجو ہے۔ یہ کتابیں حیدرآباد کے اس گھرانے نے جمع کی تھیں جس کے ہونہار فرزند ریاست کے وزرائے اعظم مقرر ہوا کرتے تھے۔ سالار جنگ خانوادے نے سوا تین سو سال پہلے یہ قیمتی کتابیں جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ سالار جنگ اول میر تراب علی خاں نے اسے باضابطہ کتب خانے کی شکل دی، ان کے بیٹے میر لائق علی خاں نے اس میں دنیا کی نایاب کتابیں شامل کیں اور پھر ان کے پوتے میر یوسف علی خان، سالار جنگ سوئم نے اسے اتنی ترقی دی کہ لوگ انہیں کو اس کتب خانے کا بانی کہتے ہیں۔

میر یوسف علی خاں صرف 23 برس کی عمر میں ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم بنائے گئے مگر اس کام میں ان کا جی نہ لگا صرف تین سال بعد وہ وزارت عظمیٰ چھوڑ کر اپنی دلچسپی کے میدان میں جا پہنچے۔ انہیں دنیا کے مختلف علاقوں میں سفر کرنے اور نایاب کتابیں، نادر چیزیں، جواہر اور تاریخی یادگاریں جمع کرنے کا شوق تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے اپنے محل کو عجائب گھر بنا ڈالا اور ان کا یہ میوزیم اور ان کا یہ کتب خانہ آج بھی ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔

کتب خانہ سالار جنگ میں ہاتھ سے لکھی ہوئی عربی، فارسی، اردو اور ترکی کتابوں کی تعداد 9 ہزار سے زیادہ ہے۔ یہاں صرف قرآن مجید کے تقریباً چار سو نسخے ایسے ہیں کہ ان کی زیارت سے دل نہیں بھرتا۔ مغلوں سے پہلے کے، چودھویں صدی کے، خط گلزار میں لکھے ہوئے ایسے ایسے قرآن ہیں جن کے اوراق پر معلوم ہوتا ہے

گلزار کھلے ہیں۔ ایک قرآن صرف پندرہ صفحوں پر مشتمل ہے اور اگرچہ باریک خط ہے مگر اتنا روشن ہے کہ باآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ کے ذخیرے کی ایک اور دولت اس کے مصور نسخے ہیں جن میں گزرے وقتوں کی مصوری کے شاہکار ہیں' مثلاً ایک کتاب کے بارے میں جس پر کتب خانے کو بجا طور پر ناز ہے وہاں کے مہتمم نے بتایا:

''مجالس العشاق صوفیاء کا تذکرہ ہے۔ سلطان عذیر مرزا کا لکھا ہوا ہے مگر بابر نے تزک بابری میں لکھا ہے کہ کمال الدین حسین کا ہے جو علی شیر نوائی کے ہمعصر ہیں اس میں پورے صوفیوں کی تصاویر کے ساتھ ان کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو ہم اصفہان اسکول سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ مگر شیرازی کی اس پر بہت چھاپ ہے ویسے تو صوفیا کے کافی تذکرے ہیں اور مصور بھی ہیں لیکن مجالس العشاق سب سے اچھا ہے۔ اس کا ایک اور نسخہ بھی ملتا ہے مگر اس میں بیس پچیس تصاویر ہیں جبکہ اس نسخے میں اکہتر ہیں۔ کتاب خلقتِ آدم سے شروع ہوتی ہے اور انبیاء کے تذکروں سے ہوتے ہوئے صوفیاء تک پہنچتی ہے''۔

اسی طرح محمد قلی قطب شاہ کا دیوان ہے جس کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ملتا ہے جو کتب خانہ سالارِ جنگ میں محفوظ ہے۔ یہ دیوان سولہویں صدی کے آخر میں خود محمد قلی قطب شاہ کے دور میں لکھا گیا تھا۔ اس میں دس تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں۔ اتفاق سے اسی جلد میں عبداللہ قطب شاہ کا دیوان بھی بندھا ہے۔ پھر خمسۂ نظامی ہے جو جہانگیر کے دور میں لکھی گئی۔ اس میں پانچ مثنویاں ہیں اور تصویریں بھی ہیں۔ اس قسم کے پانچ یادگار اور تاریخی مخطوطوں پر ایک جامع کتاب چھاپی جارہی ہے جو کتب خانے کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بند ان نادر کتابوں اور تصویروں کو عام لوگوں کے گھروں تک پہنچادے گی۔

اس کے علاوہ ایک اور تاریخی کتاب عشیرۃ الاسلام چھپ رہی ہے۔ اس کتاب میں تمام اسلامی احکام جمع کیے گئے ہیں۔ یہ محمد بن ابی بکر سمرقندی کی تصنیف ہے جن کی وفات ۵۷۳ ھ میں ہوئی تھی۔ دکن میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے' خیال ہے کہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

حیدرآباد کا ایک کتب خانہ دل کو بہت دکھاتا ہے۔ یہ نایاب کتابوں کا ایک ایسا چشمہ ہے جو خزاں کے پتوں تلے چھپ گیا ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ علم کی پیاس بجھانے والے اب بھی پتوں کو سرکا کر دو چار گھونٹ پی لیا کرتے ہیں۔ کتب خانہ سعیدیہ ہے جو مدراس کے عظیم علمی گھرانے کے ایک فرزند مفتی مولوی محمد سعید خاں کی یادگار تھا۔ کتب خانہ سعیدیہ میں چار ہزار سے زیادہ نایاب قلمی کتابیں ہیں' اسلامی تاریخ اور دکنی تمدن پر بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ٹیپو سلطان اور لارڈ کلائیو کے ذاتی خط اور کئی شاہی فرمان محفوظ ہیں۔ بس اس کا المیہ یہ ہے کہ اتنے بڑے خزانے کی دیکھ بھال کرنا اب مشکل ہوگیا ہے۔ چنانچہ کتب خانہ سعیدیہ زیادہ تر بند رہتا ہے اگر اس کو دن کی روشنی

اور تازہ ہوا نصیب نہ ہوئی تو یہ بے مثال دولت بھی وہیں پہنچ کر دم لے گی جہاں مفتی سعید مرحوم چین کی نیند سو رہے ہیں۔

خدا انہیں جنت اور ان کی کتابوں کو نئی زندگی عطا کرے۔

حیدر آباد میں کتابوں کا ایک اور ذخیرہ جو اردو اور خصوصاً دکنی ادب کی تاریخ میں جگہ پائے گا اور وہ ہے ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ۔ اس کتب خانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف کتابیں ہی نہیں بلکہ ادب نوازوں اور علم دوستوں کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔

مخطوطات میں حضرت خواجہ بندہ نواز کا چکی نامہ اور شیخ اشرف کی نوسر ہار یہاں موجود ہے۔ برصغیر میں جب اردو کی نئی نئی طباعت شروع ہوئی اس وقت کی کتابیں ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہیں۔ پرانے اخباروں کے فائل ہیں۔ 1814ء میں ہنری مارٹن اور مرزا فطرت نے انجیل کا جو اردو ترجمہ کیا تھا وہ یہاں محفوظ ہے۔ مگر ان کتابوں میں، اس خون اور اس پسینے میں اب کچھ آنسو بھی شامل ہوا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا:

''اسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم و مغفور نے قائم کیا تھا، خدا انہیں جنت نصیب کرے کیونکہ انہوں نے کوئی چار پانچ ہزار اردو، فارسی اور عربی مخطوطے اور اردو فارسی قدیم تذکرے اور دکنی ادبیات کے تمام پرانے دواوین، کلیات اور نثر کی داستانیں اور ایسی ہی کتابیں جمع کی تھیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کے لیے انہوں نے ذاتی گرہ سے زمین خریدی، ادارہ بنایا، اسے چلایا لیکن ان کی بے وقت موت سے اب اس ادارے میں وہ کام نہیں ہو رہا جو کسی زمانے میں اس سے توقع کی جاتی تھی۔ چار پانچ جلدوں میں تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات اردو چھپا ہوا ہے اور اس میں سب سے بڑا ذخیرہ قطب شاہی اور عادل شاہی زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ہے۔ ان کے علاوہ شاہی فرامین اور اس عہد کی تاریخی دستاویزات اور سرکاری، قانونی، عدالتی اور ریاست کے کاغذ وہاں محفوظ ہیں اور چونکہ اب وہاں نگرانی کا ٹھیک انتظام نہیں، اس سے استفادہ بھی کم ہوتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع نہیں اس لیے تشویش ہوتی ہے۔ ظاہر ہے جب مہتمم ہی نہیں اور مالی حالت اچھی نہیں تو بہت سی چیزیں گم ہو رہی ہیں اور بہت سے ذخیرے کو دیمک کھا رہی ہے تو نتیجہ اس کا کیا نکل سکتا ہے، اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں''۔

حیدر آباد دکن میں کتابوں کا ایک خزانہ ایسا ہے جو اگر دنیا کے سامنے آ گیا تو دور حاضر کی آنکھیں چکا چوندھ ہو جائیں گی اور وہ ہے نظام دکن، میر عثمان علی خان مرحوم کے خاندان کا کتب خانہ۔ یہ کتب خانہ آصف جاہ اول سے ورثے میں چلا آتا ہے اور اب نظام کی کنگ کوٹھی میں بند ہے۔

کسی کو خبر نہیں کہ اس میں کیسے کیسے جواہر پارے بند ہیں۔ میر عثمان علی خان مرحوم کے بارے میں سب

جانتے ہیں کہ جس کتب خانے میں جاتے تھے وہاں کی بہترین کتابیں ''عاریتاً'' لے آتے تھے اور پھران کتابوں کو واپس جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔

ان کے کتب خانے میں کیا کیا نہیں چھپا ہوگا۔ مگر وہ چونکہ بند ہے اس لیے قیاس آرائیوں اور افواہ طرازیوں کے دروازے کھلے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ بتاتا ہے مگر ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ خدا کرے وہ سب جھوٹ ہو۔

ہم سوچتے ہیں کہ جس روز کنگ کوٹھی کا کتب خانہ کھلے گا' اس روز دروازۂ خاور کھلے گا۔ ہم کتنے نادان ہیں، کیسی کیسی باتوں سے اپنا جی بہلاتے ہیں۔

کتابوں سے بھرے گھر

ہوا یہ کہ میں نے کراچی میں مرزا ظفرالحسن کو خط لکھا اور پوچھا کہ آپ ابن انشاء لائبریری کھول رہے تھے' اس کا کیا بنا؟

جواب آیا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔

مطلب یہ کہ بہت دوڑ دھوپ کی' بڑی درخواستیں دیں' کچھ اور کھول رہے ہوتے تو کبھی کا کھل گیا ہوتا مگر چونکہ لائبریری کھولنا چاہتے تھے' ارباب اختیار کے ایک کان سے دوسرے تک ایک سوراخ کھل گیا۔

ابن انشاء جیسے شخص کا نام وابستہ ہوا بھی تو نارتھ ناظم آباد کی ایک چھوٹی سی سڑک سے اور سننے میں آتا ہے کہ لوگ اس کا نام مٹا ڈالنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کراچی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کتابوں کی کتنی بڑی دولت پورے برصغیر سے سمٹ کر وہاں پہنچی ہے اور کسی کو خبر نہیں کہ کون سے خستہ حال مکان میں کیسے کیسے نادر نسخے آج تک اپنے محسنوں کے منتظر ہیں لیکن شاید اب اس شہر کے نصیب میں کوئی دوسرا امتیاز حسن نہیں۔ جس طرح دہلی کے حصے میں حکیم عبدالحمید آئے' یہ بٹوارہ کراچی کو کوئی ایسی شخصیت نہ دے سکا کہ کتابیں جس کا دم بھریں۔ کچھ ایسی ہی بات ایک روز مشفق خواجہ نے کہی۔

''پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے جو لوگ آئے وہ اپنے ساتھ مخطوطات بھی لے کر آئے اور یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ حکومت پاکستان نے نیشنل میوزیم کے لیے ان مخطوطات کی خریداری کی اور ممتاز حسن مرحوم خاص طور پر اس سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تو اس وقت نیشنل میوزیم میں تقریباً نو ہزار مخطوطات ہیں اور جن میں سے بہت سے مخطوطات منحصر بہ فرد ہیں' یعنی ان کا کوئی دوسرا نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ اسی طرح مولوی عبدالحق جب آئے تو وہ انجمن ترقی اردو کی لائبریری کے مخطوطات کا ایک حصہ اپنے

ساتھ لیتے آئے اور وہ بھی بہت نادر ذخیرہ ہے، خصوصاً دکنیات سے متعلق کتابیں اس میں بہت ہیں۔ یہ چیزیں اب بھی نیشنل میوزیم میں ہیں''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کراچی کا نیشنل میوزیم کتابوں کی بہت بڑی دولت سے مالا مال ہے۔ وہاں ابو بکر محمد کی التصرف فی االتصوف محفوظ ہے جو 473ھ میں لکھی گئی تھی۔ اذکار امام نووی کا فارسی ترجمہ ہے جس پر شہنشاہ اکبر کی والدہ حمیدہ بیگم کی مہر موجود ہے۔ تیرھویں صدی کی کلیات ناسخ ہے۔ عطار کی منطق الطیر ہے جو اکبر شاہی کتب خانے سے چل کر کراچی کے قومی عجائب گھر میں پہنچی ہے۔

یہ تو خیر وہ کتابیں ہیں جو شوکیس میں سجی ہیں لیکن اصل ذخیرہ اندر کہیں ہے۔ میں اسے دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ میں نیشنل میوزیم پہنچا اور یہ نو ہزار مخطوطے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جواب ملا کر لائبریرین صاحب دستیاب نہیں اس لیے داخلہ بھی ممکن نہیں۔ ان کتابوں کی حالت جاننے والے بعض علم دوستوں نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ یہی جواب ملے گا۔

اچھا تو اب کیا صورتحال ہے؟ کیا اس 1980ء کی دہائی میں بھی پرانی کتابیں اسی طرح خریدی جا رہی ہیں؟ مشفق خواجہ نے کہا:

''ہمارے ہاں مخطوطات کی خریداری کے سلسلے میں کوئی دلچسپی کسی کو نہیں ہے جتنا بھی کام ہوا ہے ایک فرد کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے، اور وہ تھے مرحوم ممتاز حسن۔ وہ مر گئے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا''۔

کراچی میں قدیم اور نادر کتابوں کے ذخیرے کتنے لوگوں کے پاس ہیں انہیں شمار کرنا مشکل اور ان کی فہرست بنانا ناممکن ہے، مگر جن کو ہم جانتے ہیں ان کی گفتگو ذرا دیر بعد ہوگی۔ پہلے آئیے بحر عرب کے ساحل سے ضلع دادو کے پہاڑوں تک پھیلے ہوئے اس شہر کے بڑے کتب خانوں کی بات کریں۔

کراچی میں کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر محمود حسین لائبریری میں ہے وہاں موجود کتابوں کی تعداد اب اڑھائی لاکھ ہوا چاہتی ہے۔ پھر لیاقت میموریل لائبریری ہے جہاں یوں تو ایک لاکھ لیکن مشرقی علوم کی تیس ہزار کتابیں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ خاص اور کتب خانہ عام میں ایسا ذخیرہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی، پھر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا اپنا کتب خانہ ہے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اپنی لائبریری ہے جو بہت گراں قدر ہے۔ اس کے علاوہ اہل علم حضرات نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور نیشنل بینک میں کتب خانوں کے پودے لگائے تھے جو اب تناور درخت بن چکے ہیں۔ خالق دینا ہال کی لائبریری بہت قدیم تھی، تھیوسوفیکل ہال کا ذخیرہ بھی بہت پرانا تھا شاید اب بھی ہوگا۔ سنٹرل سیکرٹریٹ کی لائبریری، صدر میں نہایت عمدہ اور موزوں مقام پر اتنی ہی نفیس عمارت میں ہوا کرتی تھی نہ معلوم کس کے جی میں کیا آئی اسے اٹھا کر شہید ملت

روڈ کے بازار کی بالائی منزل میں بٹھادیا۔اب وہاں کوئی تماشائی تک نہیں آتا۔باغ جناح کی لیاقت ہال لائبریری جو1852ء کی فریئر ہال لائبریری کی ورثے دار ہے' کہتے ہیں کہ اب خوب نکھر رہی ہے۔

دو تازہ کتب خانوں نے کراچی میں علم کے چراغ جلائے ہیں۔اس دور میں بھی جب بڑے بڑے نئے کتب خانے کھولنے کے لیے آدمی یا تو صاحب ثروت ہو یا سر پھرا ہو' کراچی کو دو نئے کتب خانے کھلنے کا شرف ملا ہے۔

ان میں سے ایک غالب لائبریری ہے جس کو اب چشم بد دور بارہواں برس لگا ہے۔اس کی نچلی منزل میں اگرچہ بینک ہے مگر اس کی بنیادوں میں مرزا ظفر الحسن کا گاڑھا پسینہ ہے۔غالب لائبریری میں ادبی موضوعات پر پندرہ ہزار کتابیں جمع کی جا چکی ہیں جن میں سے ایک ہزار سے زیادہ کتابیں نادر' نایاب اور کمیاب ہیں۔اسی طرح رسالوں کی تعداد پچاس ہزار ہے جن میں سے بعض ستر اسی سال پرانے ہیں۔رسالوں کے خاص نمبر جمع کرنے میں غالب لائبریری کو ملکہ حاصل ہے چنانچہ غزل نمبر' ناول نمبر' آپ بیتی نمبر وغیرہ اتنے بہت سے ہیں کہ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اس معاملے میں یہ بہت نمبری لائبریری ہے۔

غالب لائبریری کے دو شعبے بہت دلچسپ ہیں۔ایک میں ممتاز ادیبوں کے خطوط محفوظ کیے جا رہے ہیں اور دوسرے میں ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ڈرامے جمع ہو رہے ہیں جو اتنے بہت سے ہیں کہ مستقبل کا محقق تنگ آ جائے گا تحقیق کرتے کرتے۔

کراچی کا دوسرا نیا کتب خانہ ہمدرد لائبریری ہے جو ناظم آباد میں ہمدرد فاؤنڈیشن کی عمارت کے وسیع ہال میں قائم کی گئی ہے اور لائبریری کے جدید اصول پر ترتیب دی گئی ہے۔کسی نے گلہ کیا کہ وہاں ہر قسم کی کتابیں بھر لی گئی ہیں لیکن یوں نہیں ہے۔اگرچہ حوالے کے لیے ہر موضوع کی نمائندگی ہے لیکن ہمدرد لائبریری اسلامیات' طب' سائنس' عمرانیات' ادب اور نادر کتابوں کی خریداری کا سلسلہ جاری ہے۔

ہمدرد لائبریری میں ایک شعبہ ایسا ہے جس میں قرآن مجید کے ترجمے' جو دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہوتے رہے ہیں' جمع کیے جا رہے ہیں۔پٹنہ کی خدابخش لائبریری کی طرح ہمدرد لائبریری ایک اور دلچسپ کام یہ کر رہی ہے کہ مصنفوں کی کتابوں کے اصل مسودے اپنے ہاں محفوظ کر رہی ہے جو تحقیق میں بہت کام آئیں گے۔

اور اب ہم آتے ہیں کراچی کے ذاتی کتب خانوں کی طرف۔یہاں سے میری گفتگو میں افتخار عارف بھی شریک ہیں جنہوں نے علم کی جستجو میں سیکڑوں دروازے جھانکے ہیں۔انہوں نے کہا:

''ادبی کتابوں کا جو ذخیرہ میری نظر سے گزرا ہے کہ جہاں جا کر انسان کا جی چاہتا ہے کہ بیٹھا رہے' وہ مشفق خواجہ صاحب کا ذخیرہ ہے۔وہ نہایت حلیم الطبع ہیں اور ہمارے بزرگ' دوست اور کرم فرما بھی ہیں۔مشفق

خواجہ صاحب کے پاس بے انتہا اچھا اور منتخب ذخیرہ ہے۔ کیونکہ وہ خود محقق ہیں اور ورثہ دار ہیں ایک بڑے محقق کے' ان کا کتب خانہ دیکھنے کے قابل ہے' یگانہ کی بہت سی چیزیں ان کے پاس جمع ہیں''۔

کراچی میں کتابوں کا جو ذخیرہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے وہ برصغیر کے سرکردہ عالم اور محقق سید محمد بیدری صاحب کے نام نامی سے منسوب ہے۔ اس کا بڑا حصہ وہ اپنے ہمراہ ہندوستان سے لے آئے تھے۔ اردو کے استاد پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے بھی نادر کتابوں کا بڑا ذخیرہ کیا اور کتنی ہی کتابیں انہوں نے اپنے ہاتھ سے نقل کیں۔

افتخار عارف نے کہا:

''خالد اسحٰق صاحب کا نام ہمارے بہت مشہور قانون دانوں میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اسلامی کتاب ایسی نہیں جو دنیا میں کہیں چھپی ہو اور وہ ان کے پاس موجود نہ ہو خاص طور پر حدیث' تاریخ اور فقہ پر جتنا اچھا انتخاب خالد اسحاق صاحب کے ہاں ملے گا وہ ذرا کم کم دیکھنے میں آئے گا''۔

سندھ کے بہت بڑے عالم دین حضرت مولانا دین محمد وفائی صاحب کا عظیم الشان کتب خانہ تھا وہ اب ان کے ورثا کے پاس ہے۔ علی نواز وفائی صاحب کے پاس بھی اچھا ذخیرہ ہے۔ جی الانہ صاحب بہت ابتدائی دنوں میں جب قلمی نسخوں کی قدر نہ تھی سندھ کے دور دراز علاقوں میں جا کر مخطوطے خریدتے تھے۔ الانہ صاحب کا ذاتی کتب خانہ بہت مؤقر اور معتبر ہے۔ پیر حسام الدین راشدی مرحوم کا کتب خانہ یوں شاندار تھا کہ کتابوں کا بڑا ورثہ تو خاندان میں چلتا ہوا ان تک پہنچا' اور خود انہوں نے بھی بے شمار کتابیں جمع کیں۔ اسی طرح پیر علی محمد راشدی صاحب کا کتب خانہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کریم بخش خالد صاحب بھی شاندار کتابوں کے ذخیرے کے مالک ہیں۔

افتخار عارف نے کہا:

''مجھے حضرت علامہ رشید ترابی اعلیٰ مقامہ' کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ نہایت عمدہ' بہت منتخب اسلامی تاریخ کا کتب خانہ تھا۔ پھر فلسفے پر کتابیں الگ۔ ان کو ادبیات سے بھی بہت شغف تھا' اس کی الگ کتابیں۔ ان کے پاس بڑا عمدہ انتخاب تھا۔

اسی نوعیت کی کتابیں حضرت مولانا مصطفیٰ جوہر صاحب کے کتب خانے میں ہیں۔ حضرت مولانا مہدی پویا صاحب' مولانا یوسف بنوری صاحب' مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا شمار اکابرین میں ہوتا ہے۔ ان سب کے ذاتی ذخیرے تھے۔ عربی ادب کے دور حاضر کے سب سے بڑے علماء میں ہمارے علامہ عبدالعزیز میمنی صاحب سرفہرست ہیں۔ ان کا بہت عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ اسی طرح علامہ خلیل

عرب بھی بڑے بھاری کتب خانے کے مالک تھے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ذاتی ذخیرہ ایسا ہے کہ محقق اس میں نہ جائے تو تحقیق کے کتنے ہی گوشے تاریک رہ جائیں۔

افتخار عارف نے کہا:

''پھر ایک اور سلسلہ ہے جیسے ہمارے حکیم نصیرالدین صاحب اور محمود احمد برکاتی صاحب۔ یہ دو بزرگ ایسے ہیں جن کے ہاں نہ صرف طب پر بلکہ فلسفے پر بھی بہت سی کتابیں مل جائیں گی خاص طور پر بیدل پر جتنا ذخیرہ آپ کو مولانا حسن مثنیٰ ندوی صاحب اور حکیم نصیرالدین صاحب کے ہاں ملے گا وہ میں نہیں سمجھتا کہ برصغیر میں کسی فردواحد کے پاس ملے گا۔

اسی طرح حکیم محمد سعید صاحب کے پاس بے مثال ذخیرہ تھا۔ شان الحق حقی صاحب اور حفیظ ہوشیار پوری صاحب کے پاس بھی اچھے کتب خانے ہیں مگر بہت ہی نادر اور عظیم ذخیرہ جمیل جالبی صاحب کے پاس ہے جو اپنی تاریخ ادب اردو کے لیے متواتر تحقیق کر رہے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ صوفیائے کرام پر ان کی زبردست ریسرچ ہے اور اسی مناسبت سے ان کا ذاتی کتب خانہ قابل منزلت ہے۔

حیدرآباد دکن سے جو کتابیں پاکستان منتقل ہوئیں' شہر میں ان کے بہت سے ذخیرے ہوں گے لیکن ایک نہایت اچھا ذخیرہ خواجہ حمیدالدین شاہد صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے نارتھ ناظم آباد میں ایوان اردو قائم کر کے اپنی علم پروری اور اردو نوازی کا ایوان آباد کر رکھا ہے۔ ایوان اردو کے کتب خانے میں کتنے ہی فارسی' عربی اور اردو مخطوطے آراستہ ہیں لیکن دکنی مخطوطوں اور مطبوعات کا نہایت نادر ذخیرہ ہے۔ وہاں دکنی مطبوعات کی تعداد پندرہ سو سے زیادہ ہے' رسائل تقریباً 1400 ہیں اور دوسری مطبوعات پانچ ہزار سے کم نہیں۔

کتابیں جمع کرنے والوں کی فہرست یوں تو بہت طویل بنے گی لیکن ان میں عبدالرؤف عروج' مسلم ضیائی اور عمر مہاجر صاحب کے پاس اچھے ذخیرے ہیں۔ ملیح آباد کے ڈاکٹر فضل عظیم صاحب کے پاس مخطوطوں کا خاصا بڑا مجموعہ ہے جو انہوں نے بہت حفاظت اور احتیاط سے رکھا ہے۔

کتابوں کا سودا جس کے سر میں سما جائے پھر اسے چین سے بیٹھے کبھی نہیں دیکھا۔ کراچی کے کتب خانوں کی گفتگو ہم ایسی ہی ایک شخصیت کے ذکر پر ختم کرتے ہیں ان کا احوال افتخار عارف نے کچھ یوں کہہ سنایا۔

''میرے ایک دوست ہیں مدبر رضوی۔ وہ پاکستان ٹیلی ویژن' کراچی کے اسکرپٹ ایڈیٹر ہیں لیکن ان کا

اصل جوہر یہ ہے کہ دنیا زمانے کی نایاب کتابیں جمع کرتے ہیں۔ مجھے ان کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بس جتنی جگہ پر وہ بیٹھ جاتے ہیں یا لیٹ جاتے ہیں اتنی جگہ تو خالی ہے بقیہ میں کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ کتابوں کو وہ تکیے کے طور پر بھی اور بستر کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں اور کیا عجب کہ بیساکھیوں کے طور پر بھی استعمال کرتے ہوں۔''

جہاں نگاہ نہیں جاتی

کتابوں کی تلاش اب ہمیں ایک ایسے خطے میں لیے چلتی ہے جہاں عام لوگوں کی نگاہ بھی نہیں جاتی۔

بہاولپور کے بارے میں سنا کرتے ہیں کہ ریاست کے زمانے میں اس کا نقشہ بالکل عراق جیسا تھا۔ وہاں عراق سے لاکر کھجور اگائی گئی تھی یہاں تک کہ ریاست کا دارالخلافہ بغداد الجدید کہلایا جانے لگا۔ اس قدیم بغداد اور اس جدید بغداد میں یکسانیت صرف نقشے اور کھجوروں ہی کی نہیں تھی بلکہ ایک دولت اور بھی تھی جس پر اس بغداد کو بھی ناز تھا اور اس بغداد کو بھی۔ اور وہ تھی علم کے جواہر پاروں کی دولت' ایسی ایسی کتابوں کی دولت جن کا دنیا میں صرف ایک نسخہ تھا اور وہ بھی اسی بہاولپور کی سرزمین پر۔

اوچ شریف کا نام ہم نے پہلے پہل مزاروں' گدیوں اور خانقاہوں کے باعث سنا تھا' پھر تاریخ میں بارہا اس کا ذکر آیا کس طرح دارا شکوہ بھاگتا ہوا اوچ پہنچا تھا اور کس طرح اورنگزیب کی فوجیں اس کی بو سونگھتی سونگھتی وہاں پہنچی تھیں۔ پھر کسی نے بتایا کہ شہر اوچ کو تاریخ میں فضیلت یوں بھی حاصل ہے کہ خاندان بنی ہاشم کے کتنے ہی افراد حجاز' عراق اور ایران چھوڑ کر اوچ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ گیارہویں امام حضرت حسن عسکری بخارا چھوڑ کر ہندوستان تشریف لائے اور اوچ میں قیام فرمایا۔ مگر کتابیں ایسی روایتوں سے بھری پڑی ہیں جن کی نہ کہیں سند ملتی ہے اور نہ کہیں تصدیق ہوتی ہے۔

اس باب میں ہم اس سرزمین میں چھپے ہوئے کتب خانوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ان میں نئے' پرانے سرکاری و نیم سرکاری' ذاتی و نجی ہر قسم کے کتب خانے شامل ہیں۔

بہاولپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے استاد جناب اسلم ادیب ان دنوں برطانیہ میں تحقیق اور مطالعہ کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں دعوت دی کہ بہاولپور کے تاریخی اور علمی پس منظر کے حوالے سے وہاں کی کتابوں کے بارے میں اور کتب خانوں کے متعلق بتائیں۔ باقی احوال انہی کی زبانی ہے۔

بہاولپور کے کتب خانوں کی اہمیت خود بہاولپور کے تاریخی اور ادبی پس منظر سے بنتی ہے۔ وہاں ادب اور تحقیق کی قدیم روایت موجود ہے۔ ریاست ہونے کی وجہ سے اہل علم کو حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی اور دوسرے یہ کہ خواجہ فریدؒ کی سرزمین ہونے کی وجہ سے اس میں ادب کی کونپلیں پھوٹتی رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جب علم وادب پروان چڑھا تو وہاں ایک کتب خانہ بھی پھلا پھولا جس کا پنجاب کے چند بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے اور وہ ہے بہاولپور کی سنٹرل لائبریری۔ اس کی تو بہرحال سرکاری نوعیت ہے لیکن نجی اور خاندانی کتب خانوں میں جو سرفہرست آتا ہے وہ ہے اوچ شریف میں گیلانی خاندان کی لائبریری۔ اس کے علاوہ کچھ اور نجی کتب خانے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

سنٹرل لائبریری جون 1947ء میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت وہ اپنے ذخیرۂ کتب کی وجہ سے بڑی منفرد ہوگئی ہے۔ اس میں اسّی ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں جن کے مختلف موضوعات ہیں یعنی فلسفہ' ادب وتاریخ' سیاست اور مغربی اور مشرقی علوم۔

یہ لائبریری اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس کا ایک گشتی شعبہ بھی ہے جو قارئین کو خود ان کے علاقے میں پہنچ کر کتابیں فراہم کرتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے کچھ پرانے رسائل کی تلاش تھی دوسرے مقامات پر ناکامی کے بعد بہاولپور کی سنٹرل لائبریری پہنچا تو دیکھا 1947ء سے لے کر اب تک کی فائلیں موجود تھیں جن میں صرف رسالے ہی نہیں بلکہ اخبارات بھی شامل ہیں۔

سنٹرل لائبریری میں قلمی نسخے بھی ہیں جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے بعض چوتھی صدی ہجری میں لکھے گئے تھے۔ وہاں کئی ہندو شعراء کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دیوان موجود ہیں۔ مشکوۃ شریف کا ایک نادر قلمی نسخہ وہاں رکھا ہے۔ بالخصوص تصوف پر لکھے جانے والے رسالوں کے کئی قلمی نسخے وہاں ملتے ہیں۔

قدیم ذخیروں میں اوچ گیلانی کا کتب خانہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں ہمیں قدیم ترین اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس کتب خانے میں قرآن' تفسیر' حدیث' فقہ' تصوف' فلسفہ' شعر وادب' تذکرہ نگاری اور مصوری کا نہایت بیش قیمت خزانہ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ موضوعات ایسے بھی ہیں جو عام کتب خانوں میں نہیں ملتے مثلاً موسیقی' سپاہ گری' شکاریات' روحانی عملیات' نجوم' آثار قدیمہ' حتیٰ کہ گھوڑوں کی مختلف اقسام پر بھی کافی تعداد میں کتابیں وہاں ملتی ہیں۔

اوچ شریف کے اس ذخیرے کی جو کتابیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان میں خط کوفی میں قرآن پاک کے کچھ اجزاء ہیں جو ہرن کی کھال پر لکھے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ بات تحقیق طلب ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ اوچ شریف میں موجود قدیم

ترین مخطوطہ ہے۔

اس کے علاوہ تیسری صدی ہجری اور آٹھویں صدی ہجری کے درمیان لکھی جانے والی مذہب، تصوف اور ادب کے موضوع پر مثنویاں اور رسائل ایسے ہیں جن کے نسخے کہیں اور نہیں ملتے۔ بالخصوص حضرت عبدالقادر جیلانی کے حالات زندگی اور فضائل پر کئی اہم کتابیں موجود ہیں جن کے مصنفوں اور کاتبوں کے ناموں کا علم نہیں۔

اسی طرح وہاں شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت یادداشتوں کا قلمی نسخہ' اقبال نامہ' جہانگیری بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہاں پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کا سفرنامہ مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔ علی قلی خاں کا تذکرہ ریاض الشعراء بھی قابل ذکر ہے جس میں تقریباً ہزار شعراء کا احوال درج ہے۔

قدیم یونانی طب کے موضوع پر اوچ شریف میں کئی قلمی نسخے ملتے ہیں جو اہمیت کے اعتبار سے کسی طرح کم نہیں۔ ایک اور قابل ذکر مخطوطہ ایک ہندو شاعر سائیں ولی رام کا ہے جس نے ایک مثنوی لکھی ہے جو اسلامی تصوف کے چھ مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

اوچ شریف میں قلمی تصویروں کا ذخیرہ بھی ہے جو تحقیق طلب ہے۔ اس میں مختلف اہم شخصیات کے پورٹریٹ شامل ہیں اور کتنے ہی بادشاہوں' شہزادوں' بزرگان دین اور شعراء کی تصویریں ملتی ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان کا مصور کون ہے۔ بیشتر تصویروں کی یہ صورت حال ہے۔

لیکن اوچ شریف کا یہ ذخیرہ اطمینان بخش حالت میں نہیں ہے۔ اسے بھاری سرپرستی' امداد اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ جو کتابیں بچ رہی ہیں انہیں محفوظ کر لیا جائے۔ اس کتب خانے کا ایک کیٹلاگ تیار ہوا تھا جو ابھی تک دستیاب ہے۔ اس کے دیکھنے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اوچ شریف کے ذخیرے کی کتنی ہی کتابیں صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔

بہاولپور میں تیسرا بڑا اور قابل ذکر کتب خانہ' مبارک اردو کتب خانہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتب خانہ محمد آباد' شجر پور کے علاقے میں ہے اور یہ 1926ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری کے مشورے سے قائم ہوا تھا۔ اس میں بہت سی نادر اور کمیاب کتابیں محفوظ ہیں۔ اسی طرح شہر فقیر والی کے مدرسہ عربیہ قاسم العلوم کے کتب خانے میں بہت اچھا ذخیرۂ کتب ہے۔

ایک اور کتب خانہ' جو مذہب اور تصوف کے لیے مخصوص ہے' حضرت شیخ الجامعہ لائبریری کہلاتا ہے۔ یہ کتب خانہ شیخ الجامعہ حضرت مولانا غلام محمد گھوٹوی مرحوم کی سرپرستی میں شروع ہوا اس میں مذہب' تصوف' تفسیر اور تاریخ کی قدیم کتب اور رسائل ملتے ہیں۔

بہاولپور کی سرزمین مقامی بولی یعنی سرائیکی کے ادب سے مالا مال ہے۔ وہاں کی ایک نامور سماجی شخصیت

ہیں سیٹھ عبدالرحمٰن' ان کا ایک کتب خانہ ہے جس میں تقریباً نو ہزار کتب پائی جاتی ہیں جن کا ایک تہائی حصہ سرائیکی ادب پر مشتمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرائیکی ادب جتنا بھی تخلیق ہوا ہے انہوں نے وہاں اکٹھا کر لیا ہے کیونکہ سرائیکی ادب سے انہیں خصوصی ذوق اور لگاؤ ہے۔

بہاولپور کی ایک اور ادب نواز شخصیت ہیں طاہر محمود کریجہ۔ سیدانی شریف میں ان کا کتب خانہ ہے جس میں تقریباً گیارہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ان کے موضوعات میں ادب' تاریخ مذہب اور سائنس ہیں۔

اس خطے کی اہم ادبی اور علمی شخصیتوں میں شہاب دہلوی شامل ہیں۔ مجلہ الزبیر کے ایڈیٹر ہیں اور برصغیر کے کتب خانوں پر خصوصی نمبر شائع کر چکے ہیں' جو اس موضوع پر ملنے والی گنی چنی دستاویزات میں اہم اضافہ ہے۔ ان کے پاس کتب کا ایک وافر ذخیرہ موجود ہے جس میں کئی مخطوطے قابل ذکر ہیں' مثلاً ایک فارسی دیوان ہے جس کے مصنف اور دور کا تعین ہونا باقی ہے۔ اسی طرح ایک قدیم قلمی نسخہ سنسکرت میں ہے جس میں بادشاہوں کے عشق کی داستانیں ہیں اور جا بجا فارسی اشعار بھی ملتے ہیں۔ اس کی تفصیلات بھی تحقیق طلب ہیں۔

اک تیر مرے سینے پہ

کتابوں کا یہ سفراب ہمیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے دو خطوں میں لیے چلتا ہے۔ ایک وہ خطہ جہاں گھر گھر اردو، فارسی اور عربی کا چرچا تھا مگر وہاں کتابوں کے کتنے ہی بڑے بڑے خزانے وقت کے ہاتھوں لوٹے گئے اور وہ ہے بہار۔

اور دوسرا وہ خطہ جہاں عربی فارسی کا خاتمہ ہوا اور اردو برائے نام ہے مگر جہاں ان زبانوں کی کتابیں اب بھی یوں رکھی جاتی ہیں جیسے کوئی سعادت مند اولاد اپنے بزرگوں کے چھوڑے ہوئے اثاثے کو آنکھوں سے لگا کر رکھتی ہے اور وہ ہے مغربی بنگال۔

ان سرزمینوں کی یہ گفتگو ہم نہیں کر رہے، بلکہ ان ہی علاقوں کی معتبر شخصیتیں ہیں جن سے کہیں بے بسائے گھر اجڑنے کی داستانیں سنیں گے اور کہیں وقت کے ہاتھوں مٹتے ہوئے نقوش کو بچانے کے جذبے اور احساس کی کہانیاں سنیں گے۔ بنگالی زبان کے سمندر میں اردو جزیروں کا احوال کلکتہ کے جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ سنا رہے ہیں اور بہار کے مرحوم کتب خانوں کا ذکر برصغیر کے نہایت معتبر اور محترم تاریخ دان پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کر رہے ہیں۔

عسکری صاحب اس روز پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کے برآمدے میں ملے تو بیٹھے وہی کتابیں پڑھ رہے تھے جن کی رفاقت میں انہوں نے ایک عمر گزاری ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو بڑے بڑے کتب خانوں کی زیارت نصیب ہوئی ہوگی، ذرا ان کا حال تو کہیے۔ وہ دیر تک میرے چہرے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی طول کھینچنے لگی۔ یہ سکوت توڑنے کے لیے میں کچھ کہنے کو تھا کہ اتنی دیر میں کتنی ہی نئی پرانی یادیں ایک قطار سی باندھ کر ان کے ہونٹوں پر آ گئیں اور وہ دیر تک ان کتب خانوں کی باتیں کرتے رہے جو کبھی تھے۔

کہنے لگے کہ میرے گاؤں کا نام کھجوہ ہے۔ پرانے زمانے میں وہ کوس اور جھاؤ کا جنگل تھا۔ سترھویں

صدی میں اورنگزیب نے وہ زمین ہماری ایک معظمہ بی بی بڑی کو بخش دی۔ ایک صدی بعد اسی ویرانے میں دیوان ناصر علی کا کتب خانہ قائم ہوا۔ جو بائی کھجوہ کے پوتے تھے۔ ان کی کتابوں پر 1312ھ یا 1799ء کی مہریں ہیں۔ دیوان ناصر علی کے ایک ملازم نے جو چریا کوٹ کے ایک بزرگ تھے ان کتابوں کی فہرست تیار کی تھی۔ اس کو ہم نے دیکھا ہے۔ کچھ ورق پھٹے ہوئے تھے۔ اس کتب خانے میں ایک ہزار تیس کتابیں تھیں سب کی سب قلمی۔ اور بہت سی تصویریں تھیں اور بہت سے خطاطی کے نمونے تھے۔ اور اس میں بعض بعض چیزیں نادر الوجود تھیں جیسے دیوان ہمایوں کسی جگہ نہیں تھا اور بہت سی کتابیں عصری تھیں مثلاً عبدالرحمٰن چشتی کی کتاب ''مراۃ الاسرار'' اس پر حاشیہ خود مصنف کا تھا۔ اسی طرح سے بہت سی کتابیں تھیں ان کی لیکن ناقدروں نے اس کا خاتمہ کر ڈالا۔

خوش قسمتی سے دیوان ناصر علی کی کچھ کتابیں تباہ ہونے سے بچ گئیں اور وہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری نے دس ہزار روپے دے کر حاصل کر لیں۔

عسکری صاحب نے کہا کہ دیوان ناصر علی کے بڑے بیٹے کا کتابوں کا ایک ذاتی ذخیرہ تھا جس کو ہم نے دیکھا تھا۔ اس میں خط کوفی میں قرآن مجید کے کئی نسخے تھے' اب نہیں رہے۔ ایک صاحب اور تھے جو داروغہ اکبر علی خان کہلاتے تھے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ الگ تھا۔ ایک ذرا سے کھجوہ میں اتنا سب کچھ ہو سکتا ہے تو دوسرے علاقوں میں بھی کیا کیا نہ ہوگا۔

پٹنہ شہر کے بارے میں کہنے لگے: ''یہاں پر سلیمانیہ مدرسہ تھا۔ بہت بڑا ہال تھا۔ ہم نے خود دیکھا۔ بڑی بڑی الماریاں تھیں' ہر ایک الماری ایک خاص موضوع کے لیے مخصوص تھی' کسی میں تاریخ' کسی میں تفسیر' کسی میں قرآن کے مطلا و مذہب نسخے' کسی میں لغات۔ مگر سب برباد ہو گیا' کچھ نہیں رہا''۔

میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں کیا ہماری کتابوں اور نوادر پر زوال آ رہا ہے؟

کہنے لگے: ''زوال کیا؟ ختم ہونے کے قریب ہیں۔ آپ سمجھئے کہ پٹنہ سٹی میں رائے سلطان بہادر کائستھ تھے ان کے پاس مخطوطات' تصاویر اور آئیوری پینٹنگز کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہ تو مر گئے' وارث ان کا نابالغ تھا۔ لکھنؤ سے ان کے ماما آئے جن کو کوئی خاص قسم کی ٹوپی پہننے کا شوق تھا وہ دھوبی کو ایک ٹوپی دھلنے کو دیتے تھے تو اس کی دھلوائی میں ایک تصویر دے دیتے تھے۔ اس طریقے سے چیزیں برباد ہوئیں' ان کے وکیل کی سفارش پر ہمیں ان کی کتابیں دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم گئے تو دیکھا کہ کتابوں کی الماری باورچی خانے کے نزدیک رکھی ہے۔ اس میں سے کچھ چیزیں بچا کر لائے۔ ایک ماتھر خاندان کا سنیے۔ راجا پیارے لال' شاہ عالم کے بیٹے اکبر ثانی کے مشیر تھے بڑے قابل تھے عربی فارسی کے عالم تھے۔ شاہ عالم سے انگریزوں نے وہ وعدے پورے نہیں کیے۔ اس پر راجا

پیارے لال نے بادشاہ کے سارے کاغذات درست کیے اور اتنا کام کیا کہ آنکھ خراب ہوگئی۔ انگریزوں نے دیکھا کہ یہ بڑا خطرناک آدمی ہے چنانچہ ریذیڈنٹ نے دباؤ ڈال کر انہیں پٹنہ بھجوا دیا۔ اور ایک بڑی جائیداد ان کو دی گئی۔ راجا پیارے لال نے یہاں آ کر دبستان شاعری قائم کیا۔ ان کا کتب خانہ بڑا عظیم الشان تھا ہم نے دیکھا۔ اس کے خاندان والوں نے ہمیں بلایا تھا کہ جو کچھ بچی کھچی کتابیں ہیں انہیں ذرا سا ٹھیک کر دو۔ فہرست میں چھ ہزار کتابوں کا اندراج تھا مگر وہاں کچھ باقیات وصالحات تھیں اب وہ ناپید ہیں، ختم ہوگئیں۔

ایک دوسرا ماتھر خاندان تھا۔ ہم وہاں گئے ان کو تردد تھا دکھانے میں، خیر بصد دقت دکھایا، پھر پتہ نہیں کیا ہوا ایک اور صاحب کائستھ تھے۔ ہم ان کے ہاں گئے تو دیکھا کہ ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہفت اقلیم وغیرہ بہت سی کتابیں تھیں۔ ہم نے کہا کہ آپ رکھ کر کیا کیجیے گا ہم کو دے دیجیے۔ چاہیں تو قیمت لے لیجیے۔ بگڑ گئے کہ آپ ہم کو کیا سمجھتے ہیں۔ آپ کو دکھلا دیا تو آپ سمجھتے ہیں کہ ہم غریب ہو گئے ہیں؟

یہ کیفیت ہے۔ کتابیں برباد ہو جائیں لیکن دیں گے نہیں۔''

یہ تو ہوئی پروفیسر حسن عسکری صاحب کی بات چیت جس کی خاطر میں پٹنہ تک پہنچا۔ بدقسمتی سے مغربی بنگال میرے سفر میں شامل نہ تھا۔ سوچتا تھا کہ بنگال میں فی زمانہ عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا کیا کام؟ لیکن شاید میری چھٹی حس مجھے ستائے جا رہی تھی اور میری قسمت میرا ہاتھ بٹانے کی ٹھانے ہوئی تھی کہ دوران سفر شانتی رنجن بھٹا چاریہ صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ بنگالی ہیں لیکن اردو کی دھن میں مگن ہیں۔ میں نے درخواست کی کہ کچھ بتا دیجیے کیونکہ بنگال کے بغیر کتابوں اور کتب خانوں کی گفتگو ادھوری رہی جاتی ہے۔

فوراً میری گفتگو پوری کرنے پر کمربستہ ہو گئے اور بتانے لگے کہ کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ کلکتے میں ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں ہے۔ وہاں عربی، فارسی اور اردو کے سیکڑوں قلمی نسخے ہیں اور یہی حال دوسری مشرقی زبانوں کا ہے مثلاً پشتو میں خوشحال خاں خٹک کی تصانیف وہاں موجود ہیں۔

ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری جو پہلے امپیریل لائبریری تھی اور آزادی کے بعد نیشنل لائبریری ہوگئی وہیں کلکتہ میں ہے۔ میں نے شانتی رنجن بھٹا چاریہ صاحب سے پوچھا کہ وہاں بھی مشرقی علوم کی کتابیں ہیں یا نہیں؟

انہوں نے کہا: ''وہاں بہت سے سیکشن ہیں جن میں خاص کر بوہار سیکشن قابل ذکر ہے۔ یہاں وہ کتابیں جو نواب بوہار نے بطور عطیہ دی تھیں۔ ان میں عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے مخطوطے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قابل ذکر سیکشن امام باڑہ ہُگلی سیکشن کہلاتا ہے۔ یہ کتابیں پہلے امام باڑہ ہُگلی میں تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے زمانے میں یہ کتابیں نیشنل لائبریری میں منتقل کر کے محفوظ کی گئیں۔ اب یہ کتابیں امام باڑے کے بانی حاجی محمد محسن

مرحوم کی یادگار ہیں''۔

بنگال کا ذکر مرشد آباد کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ وہاں کے نوابوں کا کتب خانہ علم کی دولت کا شاندار نمونہ ہے۔

بھٹا چاریہ صاحب نے بتایا ''مرشد آباد کے ہزار دواری محل میں یہ کتب خانہ قائم ہے۔ لیکن اب چند برسوں سے ٹرسٹ کی حالت کچھ ٹھیک نہیں چنانچہ یہ کتب خانہ فی الحال بند ہے۔ بہت جلد کچھ انتظامات ہو جائیں گے کیونکہ حکومت اس سے کافی دلچسپی رکھتی ہے اور کچھ ایسے انتظامات کیے جا رہے ہیں تا کہ یہ لائبریری حکومت کے تحت لے لی جائے کیونکہ اس میں ہزاروں کی تعداد میں عربی' فارسی اور اردو کے مخطوطات بھی ہیں۔ آرٹ کے بے شمار نمونے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم دور میں مرشد آباد بھی ایک علمی مرکز رہا ہے اور وہاں فارسی اور اردو کے بہت سے شعراء رہے ہیں۔ ان کے بھی بیشتر مخطوطے وہیں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ کلکتہ کے باہر اتر پاڑا پبلک لائبریری ہے جو پہلے وہاں کے جاگیردار راج کشن راؤ کی اپنی لائبریری تھی۔ کسی زمانے میں وہاں اسکالروں کے قیام کا انتظام بھی تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ برصغیر کی سب سے قدیم رہائشی لائبریری ہے۔ اب اس کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں بھی عربی' فارسی اور اردو مخطوطات کا بڑا ذخیرہ ہے۔ گو اس علاقے میں اب ان زبانوں کے پڑھنے والے نہیں رہے لہٰذا وہاں کوئی فہرست کتب بھی نہیں ہے۔ جو لوگ جاتے ہیں انہیں وہ کتابیں خود ہی نکال کر دیکھنی ہوتی ہیں۔ بہر حال یہ غنیمت ہے کہ کچھ قدیم تصانیف وہاں محفوظ رہ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور کتب خانے قابل ذکر ہیں مثلاً نہار گھرانے کا کتب خانہ۔ یہ خاندان پہلے مرشد آباد میں تھا لیکن بعد میں کلکتہ میں بس گیا۔ یہ بہت بڑا کتب خانہ ہے اور اس میں بھی چند قدیم فارسی اور اردو مخطوطے موجود ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کلکتہ یونیورسٹی کی لائبریری بھی بہت بڑی ہے اور مسلم انسٹیٹیوٹ کا کتب خانہ بھی قابل ذکر ہے۔

تو یہ ہے کلکتہ کا وہ ذکر جو ایک تیر مرے سینے پر مارتا ہے۔ اب آپ اپنے سینے کی کہیئے!

وہ جو راہ میں رہ گئے

کتابوں کی دنیا کے سفر میں اگر آپ یہاں تک آ گئے ہیں تو سمجھئے کہ میری طرح آپ کو بھی نہایت محترم کتب خانوں کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ہم نے ہمالیہ سے لے کر بحر ہند کے ساحلوں تک شہروں، قصبوں اور بستیوں میں قرینے سے آراستہ کتابیں بھی دیکھ لی ہیں اور تاریک کوٹھریوں میں سسکتے وہ پریشان ورق بھی دیکھے ہیں جنہیں اب شاید دن کا اجالا دیکھنا نصیب نہ ہو۔

مگر ہمیں اعتراف ہے کہ کتب خانوں کا یہ جائزہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ کتنی ہی تحقیق کریں اور کتنی ہی جستجو، نگاہ ہر جگہ نہیں پہنچ سکے گی، بھول چوک ہوگی ضرور اور کچھ محترم نام اور مقام یقیناً چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ ہم ہر اس فرد اور ہر اس کتاب سے معافی کے خواستگار ہیں کہ جس کا ذکر آنا چاہیے تھا مگر نہ آ سکا۔

ہوا یہ کہ وارفتگی کے عالم میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہم آگے نکل گئے تو بہت سی آوازوں نے ہمیں للکارا۔ فلاں کتب خانہ رہا جاتا ہے، فلاں ذخیرے کو بھولے جاتے ہو، فلاں لائبریری کی بھی تو کہو، فلاں شخصیت تو رہ ہی گئی۔

ایسی آوازوں پر کس کی مجال کہ کان نہ دھرے۔ تو یہاں ہم اور آگے بڑھنے سے پہلے چند قدم لوٹ رہے ہیں کہ جو شگوفے راہ میں رہ گئے انہیں بھی اپنے دامن میں سمیٹتے چلیں۔

گوپی چند نارنگ نے کہا:

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کا ذکر بہت ضروری ہے۔ وہاں تین یا چار کلکشن بہت ہی زبردست اہمیت کے ہیں۔ سبحان اللہ کلکشن، حبیب کلکشن، سید سلیمان ندوی کلکشن اور ابھی حال ہی میں وہاں لایا جانے والا مسعود حسن رضوی کلکشن۔ بے مثال کتابوں اور مخطوطات کے یہ ذخیرے اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہیں"۔

رئیس اعظم گورکھپور' مولوی سبحان اللہ خان کے کلکشن میں خط کوفی میں قرآن مجید کے وہ چند اوراق ہیں جن کے بارے میں کافی وثوق سے کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے قلم کی تحریر ہیں۔

کراچی سے سید احسن صاحب نے لکھا ہے:

''مجھے پچاس پچپن سال پہلے کا واقعہ یاد آ گیا جبکہ گورکھپور کے مشہور بزرگ مولوی سبحان اللہ خان نے اپنا بیش قیمت اور بے بہا کتب خانہ بلا معاوضہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو تفویض کر دیا تھا۔ ان دنوں اس کتب خانے کی مالیت ایک لاکھ روپے سے زائد بتائی جاتی تھی۔ اس کتب خانے کو گورکھپور سے علی گڑھ تک لانے کے لیے والد مرحوم مولانا احسن مارہروی کو مامور کیا گیا تھا۔ ان دنوں کمسنی کے باوجود مجھے اب تک ان کتابوں کی علی گڑھ میں آمد کا سماں اچھی طرح یاد ہے۔ لوہے کے بڑے بڑے صندوق تھے جن میں یہ نایاب کتابیں محفوظ کی گئی تھیں۔ یہ واقعہ 25-1924ء کا ہے۔ مولانا احسن مارہروی کا انتقال اگست 1940ء میں ہوا۔ ہم لوگوں نے ان کی جمع کی ہوئی' اردو ادب سے متعلق تقریباً چار پانچ ہزار کتابیں مسلم یونیورسٹی کے سپرد کر دی تھیں۔ والد مرحوم کی کتابیں بحمداللہ وہاں ابھی تک محفوظ ہیں۔

مشفق خواجہ نے کہا:

''بنارس یونیورسٹی کو نہ بھول جائیے گا وہاں کا اردو فارسی کا ذخیرہ بھی خاصا اہم ہے۔ خمخانہ جاوید کے مصنف لالہ سری رام کی وصیت کے مطابق ان کا کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا جس سے اس کی اہمیت بڑھ گئی۔

نواب صاحب بہاولپور کے ذاتی کتب خانے کے بارے میں صحیح طور پر بتانا مشکل ہے کیونکہ ہر ممکن کوشش کے باوجود میں اسے دیکھ نہ سکا لیکن اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم ہے کہ اردو کی ہر کتاب کا ایک نسخہ وہاں ضرور محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا کہ وہاں خطوط کا ایک بڑا مجموعہ ہے جن میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے وہ خط بھی شامل ہیں جو انہوں نے نواب صاحب کو لکھے تھے۔

سکندر علی وجد نے بھی ایک داستان الم کہہ سنائی' نظام دکن کے ذخیرۂ کتب کی بات کر رہے تھے۔

''پولیس ایکشن کے بعد میں بڑے شوق سے کنگ کوٹھی گیا۔ وہاں میرے ایک دوست تھے' انہوں نے کہا کہ آپ کو کتابوں کا شوق ہے تو کنگ کوٹھی میں کتابیں بھی ہیں دیکھ لیجیے۔ میں دیکھنے گیا تو حیران رہ گیا کہ ایسی بے مثال کتابیں' کھلے برآمدوں میں الماریوں میں رکھی ہیں۔ قریب سے دیکھا تو ہر کتاب مٹی کا تودہ بن چکی تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لیکن اگر انگلی لگائیں تو اندر دھنس جاتی ہے۔ تو میں نے تمام کتابوں کا یہ حشر دیکھا۔ وہاں ایک کتاب سلامت نہیں تھی''۔

گوپی چند نارنگ نے یاد دلایا ''ایک ذخیرہ اور ہے اور بڑا ہی دلچسپ ہے وہ ہے مہاراجہ پٹیالہ کا کتب خانہ جو آج بھی پٹیالہ میں موجود ہے البتہ اس کی کچھ کتابیں پنجاب یونیورسٹی میں چلی گئی ہیں۔ علوم شرقیہ کے محقق وہاں اکثر جاتے رہتے ہیں بلکہ آبرو کا نسخہ اور ناجی کا نسخہ اسی ذخیرے سے ملا ہے جسے بعض لوگوں نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے بتایا۔ ''مدراس میں کتب خانہ محمدیہ بڑا قدیم کتب خانہ ہے۔ یہ عادل شاہوں کے دور کا ہے۔ اس کتب خانے میں اسلامیات اور تاریخ پر عربی اور فارسی کا نہایت نادر ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی خطوط ٹیپو کے اور اس سے پہلے عادل شاہوں کے اور احمد نگر کے نظام شاہوں کے اتنے زیادہ ہیں کہ ان جیسا ذخیرہ کہیں اور نہیں ملتا''۔

اعظم گڑھ تحقیق اور تدریس کا مرکز ہے وہاں دارالمصنفین جیسا ادارہ ہے اور معارف جیسا جریدہ شائع ہوتا ہے۔ علوم اسلامیہ کے جید عالم اعظم گڑھ سے وابستہ رہے ہیں اور اسی مناسبت سے وہاں نہایت عظیم الشان کتب خانے قائم ہیں جن میں تفسیر، حدیث، سیرت، مغازی، تاریخ اور فقہ جیسے علوم پر دنیا بھر کی مطبوعات جمع ہیں اور ہر روز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ادبیات کا بھی وہاں نادر ذخیرہ ہے اور مختلف علوم کے نایاب مخطوطے جمع ہیں۔

مبارک پور۔ اعظم گڑھ سے قاضی حسان احمد صاحب نے لکھا: ''اس دور افتادہ علاقے میں بھی ایک حیرت انگیز کتب خانہ موجود ہے جس کے مالک مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ہیں۔ چونکہ مولانا کا خاص موضوع تحقیق عرب و ہند کے تعلقات اور اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ہے اس لیے ان کے ذاتی کتب خانہ میں اس موضوع پر نادر اور بنیادی ماخذ کا درجہ رکھنے والی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کتب خانہ قاضی میں تاریخ، رجال، حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت، سوانح، ملفوظات، ذکر و دعا، فلسفہ، منطق اور علم الکلام پر تین ہزار عربی، فارسی اور اردو کتابیں جمع ہیں''۔

رائچور، کرناٹک سے اردو کے استاد سید امین الدین صاحب نے بھی ایسے ہی ایک کتب خانے کا احوال لکھ بھیجا:

''حیدر آباد دکن کے جنوب میں شہر رائچور ہے۔ اس شہر میں حضرت علامہ مولانا سید چندا حسینی علیہ الرحمۃ کی شخصیت علم و فضل میں آفتاب کی طرح روشن ہے۔ آپ کو علم دینی اور کتب کی فراہمی سے بڑی نسبت تھی۔ آپ نے عمر کے اٹھارہویں سال ہی سے کتابیں جمع کر کے اپنی آخری عمر تک ایک عظیم کتب خانہ قائم کر دیا۔ جس میں استنبول، قاہرہ اور پاک و ہند کی مطبوعہ عربی اور فارسی کتابوں کے علاوہ مخطوطات کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے''۔

گوپی چند نارنگ نے بتایا:

''کچھ نجی کتب خانوں پر بڑی افتاد پڑی ہے' مثلاً دہلی کی نذیریہ لائبریری جسے' آپ کو معلوم ہے' دہلی کے تاریخی خاندانوں نے قائم کیا تھا۔ اس کی دو تین جگہیں بدلی گئیں' آخر وہ پرانی گلیوں میں پہنچ گئی۔ اس کے بعد جن ورثا کے ہاتھ میں وہ لائبریری آئی وہ ان نوادر کی اہمیت نہیں جانتے تھے' مخطوطات کی قدر و قیمت کا ان کو پتہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک ایک کر کے وہاں سے مخطوطات غائب ہونا شروع ہوئے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ ذخیرہ کہاں گیا۔ اردو معاشرے کا اتنا بڑا سرمایہ یوں برباد ہوا۔ اب حال میں سنا ہے کہ حکیم عبدالحمید صاحب کی کوششوں سے اس کا کچھ حصہ اسلامک انسٹیٹیوٹ تغلق آباد میں چلا گیا ہے۔ یہ انسٹیٹیوٹ خود حکیم صاحب نے قائم کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے ذہن و تخیل کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تحقیقات کے لیے ایک ادارہ وہاں قائم کیا ہے جو بڑا ہی زبردست کتب خانہ ہے۔ اس کے ڈائریکٹر سید اوصاف علی کی کوششوں سے نجی کتب خانوں کی بہت سی کتابیں اب تغلق آباد میں محفوظ ہو رہی ہیں''۔

ظہران' سعودی عرب سے ایک بزرگ محمد حامد اللہ صاحب نے تحریر فرمایا:

''ہندوستان میں ہمارے بزرگوں کا بھی ایک مشترکہ کتب خانہ تھا۔ الحمد للہ کہ ہمارے اعزا نے یہ کتب خانہ ہمدرد ٹرسٹ کے حکیم عبدالحمید صاحب کو دے کر محفوظ کرا دیا۔ اس کے صرف ایک عربی مخطوطے کا حال والد مرحوم سے سنا تھا کہ جب دادا مرحوم حج پر گئے تھے تو کتاب کو تول کر اور ہم وزن سونا دے کر اسے لائے تھے۔ اس کا نام شذور الذہب ہے۔ یہ صرف ایک کتاب کا حال تھا''۔

مشفق خواجہ نے ایک اور شاندار ذخیرے کے بارے میں بتایا:

''پاکستان میں ایک ذخیرہ اور بھی ہے جو حالیہ زمانے میں وجود میں آیا ہے۔ وہ ہے ادارۂ تحقیقات فارسی' ایران و پاکستان۔ یہ حکومت ایران کا ادارہ ہے جس کا صدر دفتر اور لائبریری راولپنڈی میں ہے۔ انہوں نے مخطوطات کی خاصی بڑی تعداد جمع کی ہے اور ان کی فہرستیں بھی چھاپی ہیں۔ مخطوطے خریدنے پر انہوں نے کافی رقم صرف کی مثلاً بہت سے مخطوطات مسجدوں میں پڑے رہتے ہیں یا بعض گھرانوں میں عربی مخطوطے ہیں' لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ لازماً کوئی مقدس کتاب ہوگی خواہ وہ تاریخ ہو یا کوئی دوسرا موضوع' وہ مسجدوں میں ڈال جاتے ہیں۔ تو اس ادارے کے وجود میں آنے کے بعد بعض لوگوں نے ایسی ہی کتابیں جمع کر کے ان کے ہاتھ بیچنا شروع کیں۔ ادھر یہ ہوا کہ افغانستان کی طرف سے بھی بعض لوگ کتابیں لے کر آتے تھے وہ کتابیں بھی ادارے والوں نے خریدیں' اس طرح وہاں بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے''۔

احمد آباد' گجرات سے ریٹائرڈ چیف جج عابد علی واقف صاحب نے لکھا:

''آپ نے بہت سے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے لیکن شاید آپ کو علم نہ ہوگا سورت کے جامعہ سیفیہ میں

جو ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین صاحب کے زیر اہتمام ہے ایک بڑا کتب خانہ بھی ہے۔ جس میں خاص طور سے عربی کے بہت سے پرانے نسخے ہیں' وہاں خلافت بنو فاطمہ کے زمانے کی کتابیں بھی ہیں جن کا تعلق گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے مصر اور شمالی افریقہ سے ہے۔ ان نایاب نسخوں میں خصوصاً سید قاضی النعمان اور ویسے ہی دیگر علماء کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں ہیں۔ سورت کی اس لائبریری کا کچھ حصہ بمبئی میں ہے"۔

گوپی چند نارنگ نے کہا:

"بمبئی آج بھی اور پچھلی صدی سے علوم شرقیہ کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ وہاں انجمن حمایت اسلام کے اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کا کتب خانہ ہے۔ اسے میرے کرم فرما اور بزرگ نجیب اشرف ندوی صاحب نے قائم کیا تھا جو بڑے معرکے کے آدمی تھے اور انہوں نے اردو کی بڑی بے لوث خدمت کی۔ اسی کتب خانے میں عبدالرزاق قریشی صاحب نے نوائے آزادی جیسی کتاب ایڈٹ کی اور اسی کتب خانے کی مدد سے گجری کی لغت ایڈٹ کی"۔

بمبئی کی جامع مسجد عربی فارسی اور اردو کی آٹھ ہزار کتابوں کا ایک شاندار ذخیرہ احتیاط سے لیے بیٹھی ہے' مگر بہت کم محقق اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جامع مسجد بمبئی کے اس کتب خانے میں عربی کے سوا چھ سو فارسی کے پونے پانچ سو اور اردو کے ڈیڑھ سو مخطوطے محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ چھپی ہوئی کتابوں' اخباروں اور رسالوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ یہاں تفسیر حدیث' سیرت' تصوف اور تاریخ کے علاوہ ادبیات پر بہت نایاب کتابیں مل جاتی ہیں۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اس قدیم کتب خانے کے ریکارڈ کے مطابق اب تک وہاں سے صرف اکیس کتابیں گم ہوئی ہیں۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ بہت کم لوگ ان کتابوں سے استفادہ کرنے وہاں جاتے ہیں۔ میں نے مہمانوں کی جس کتاب پر دستخط کیے اس پر مجھ سے پہلے والے مہمان نے پانچ سال قبل دستخط کیے تھے۔

بمبئی کی ایک دلچسپ شخصیت کے بارے میں مشفق خواجہ نے یاد دلایا۔ "وہاں سب سے اہم آدمی جو ہے وہ کالی داس گپتا رضا صاحب ہیں۔ وہ شاعر' ادیب اور محقق ہیں۔ متعدد کتابیں ان کی چھپ چکی ہیں۔ وہ صاحب نظر ہیں۔ ان کی لائبریری بہت شاندار ہے۔ پیشے کے اعتبار سے تو ساہوکار ہیں لیکن ذوق وشوق کے اعتبار سے قابل قدر شخصیت ہیں۔ ان کے پاس آپ کو بہت کچھ ملے گا خاص طور پر شاہ رفیع الدین کے ترجمہ قرآن کا ایک بڑا نادر مخطوطہ ان کے پاس ہے"۔

اس پر گورنمنٹ کالج' ملتان کے استاد لطیف الزماں صاحب نے لکھا:

"مجھے آپ سے ایک شکایت ہے کہ کالی داس گپتا رضا صاحب کا تعارف آپ نے اس طرح نہیں کرایا جیسا اسے ہونا چاہیے۔ دنیا میں سب سے بڑا غالبیات کا کلکشن انہی کے پاس ہے۔ ہر موضوع پر نادر و نایاب کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ شخصی لائبریری ہند و پاک میں شاید ہی ایسی کوئی اور ہو"۔

خود لطیف الزماں صاحب کے بارے میں اسلم ادیب نے بتایا:

''وہ انگریزی کے استاد ہیں لیکن اردو ادب سے ان کی جو محبت ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہر اچھی کتاب کو لینے کے لیے وہ خوراک یا لباس کی خریداری ٹال جاتے ہیں۔ آپ اگر ان کے گھر میں جائیں تو ان کے کمروں کی دیواریں نظر نہیں آئیں گی بلکہ ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔ خصوصاً غالبیات کا حصہ دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کسی شاعر سے محبت کرنے کا ہنر شاید لطیف الزماں صاحب کو ہی آتا ہے''۔

اور آخر میں وہ کتب خانہ جو اولیت میں کسی سے کم نہیں اور وہ ہے پاکستان کے صوبہ سندھ میں شکار پور کے قریب گڑھی یاسین کا کتب خانہ جو آغا بدرالدین درانی مرحوم کی یادگار ہے۔ اس میں سارے ہی مشرقی علوم پر ہزاروں کتابیں جمع ہیں جن کے مطالعے کے بغیر تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی چونکہ دور دراز علاقہ ہے اس لیے اس کی عمارت میں علماء اور محققوں کے قیام اور کھانے پینے کا بندوبست بھی ہے اور کتابیں جدید طریقے پر ترتیب دے کر جمائی گئی ہیں۔

باقیات وصالحات کی یہ بات شاید کبھی اور کہیں ختم نہ ہو۔ دور دراز علاقوں میں موجود کتابوں کا حال کون تکمیل کو پہنچا سکتا ہے؟ دعا ہی کی جا سکتی ہے کہ اس بیابان میں کوئی آبلہ پا آئے جو خار کو موتی کی لڑی کر دکھلائے۔

باپ دادا کی ہڈیاں

وقت گزرتا ہے تو قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

کتابیں بھی گزرے وقتوں کی نشانیاں ہیں لیکن کہیں تو یہ نقش پا چراغ بن کر جگمگا رہے ہیں اور کہیں مٹ گئے ہیں، بجھ گئے ہیں اور اب وہاں اندھیروں کا بسیرا ہے۔

کتابوں کے اس سفر میں اب ہم جن راستوں پر چلیں گے وہ ہمیں خلیج بنگال کے کناروں سے کیرالہ کے ساحلوں تک اور مہاراشٹر کے میدانوں سے راجستھان کے ریگستانوں تک لے جائیں گے۔ راہ میں ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں کی بستیاں بھی پڑیں گی۔

اور آج ہم دیکھیں گے کہ کہاں کہاں کیسی کیسی کتابیں، دستاویزیں، ریکارڈ اور فرمان دیکھے گئے اور جن میں سے زیادہ تر کے بارے میں اب شاید خدا ہی جانتا ہوگا کہ وہ رہے یا خاک میں ملے۔

میں حیدرآباد دکن میں تھا، اردو ریسرچ سنٹر کے محمد عبدالصمد خاں صاحب نے مجھے ایک صاحب کے بارے میں بتایا۔ کہنے لگے:

''وہ قاضی صاحب کہلاتے ہیں اور خاندانی قاضی ہیں۔ اورنگ آباد سے تقریباً دو اڑھائی سو میل دور ایک گاؤں ہے جہاں ان کے باپ دادا وغیرہ قاضی تھے۔ خود بہت معمولی مدرس ہیں۔ شاید ڈیڑھ دو سو روپے تنخواہ ملتی ہوگی۔ بیچارے بہت ہی برے حالوں میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے پاس ایک خاندانی کتب خانہ ہے اس کو آپ لے جایئے۔ اس پر میں نے پوچھا کہ آپ کا اندازہ کیا ہے اس میں کتنی کتابیں ہوں گی۔ تو ان کا اندازہ تھا کہ سولہ سو کے قریب کتابیں ہیں جن میں تین چار سو کے درمیان ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کوئی بھی مخطوطہ چار سو برس سے کم کا نہیں ہے اور اسی طرح چھپی ہوئی کتابیں بھی بہت اہم ہیں۔ میں نے ان سے قیمت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ یہ میں آپ کو تحفتاً دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں ان کو سنبھال نہیں سکتا۔ میں نے ان

سے کہا میں آپ کو ساڑھے تین ہزار روپے نذرانہ پیش کرنا چاہوں گا۔ بہت خوش ہوئے کیونکہ ساڑھے تین ہزار ان کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ مجھے اورنگ آباد سے ایک بس کے ذریعے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور جانا ہے وہاں سے کشتی میں گوداوی پار کرنا ہے' پھر بس پکڑ کر ساٹھ میل جانا ہے' پھر تقریباً تیس پینتیس میل پیدل چلنا ہے۔ تو اب اندازہ لگائیے کہ اس کتب خانے کو وہاں سے منتقل کرنا کتنا مشکل کام تھا' لہٰذا میں نے اسے چھوڑ دیا۔''

پاکستان کے ممتاز دانشور اور افسانہ نگار جناب قدرت اللہ شہاب کو ایک مرتبہ خلیج بنگال کے ساحل پر اڑلیسہ کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ قدیم کتابیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ شہاب صاحب نے بتایا:

''میں ایک بہت ہی دور دراز علاقے میں گیا تھا اور اس گاؤں میں قدیم کتابیں تھیں۔ میں سن چوالیس میں گیا تھا اور مجھ سے پہلے علاقے کا سرکاری افسر 1901ء میں وہاں گیا تھا۔ وہاں پر عجیب وغریب پرانی کتابیں اور مخطوطات نظر آئے۔ کچھ ہندی میں تھے۔ چونکہ مجھے ہندی بھی آتی تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ بہت نایاب کتابیں ہیں۔ کچھ اردو کی اور کچھ عربی کی کتابیں بھی تھیں۔ وہ گاؤں سمندر کے کنارے تھا اور پرانے زمانے میں عرب ملاح اور تاجر وہاں آتے جاتے رہتے تھے' عین ممکن ہے کہ یہ کتابیں وہی چھوڑ گئے ہوں''۔

حیدر آباد دکن کے کتابوں کے ایک تاجر علیم الدین صاحب اب ضعیف ہو گئے ہیں اور بہت زمانے دیکھ چکے ہیں۔ جان جوکھوں میں ڈال کر کتابوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ مجھے بتا رہے تھے کہ شہنشاہ اکبر کے فرامین کی خبر پا کر وہ راجستھان کے ریگستانوں میں جا پہنچے۔ کہنے لگے:

''میں جے پور گیا ہوا تھا جب کبھی جے پور جاتا ہوں عموماً یادگار سرائے میں ٹھہرتا ہوں۔ ایک روز میں قلعہ دیکھنے کے لیے نکلا جو شہر سے دور ہے۔ قلعے کی سیر کے بعد پہاڑی سے نیچے اترا' وہیں قریب میں ایک مسجد ہے۔ اس مسجد میں اکبر کے زمانے کا ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ میں اس کی عبارت کی نقل کر رہا تھا کہ مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک شخص مجھے دیکھ کر رکا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں تو میں نے کہا کہ بھائی میں یہ پرانی عبارت نقل کر رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ کیوں نقل کر رہے ہیں تو میں بولا کہ میں ایسی ہی چیزوں کا بیوپاری ہوں۔ شہر شہر گھوم کر پرانی چیزیں خریدتا ہوں' کتابیں خریدتا ہوں' فرامین خریدتا ہوں۔ یہ سب اسے بتایا تو اس نے کہا یہاں سے پچیس تیس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے وہاں شہنشاہ اکبر کے زمانے کے کاغذات ہیں۔ اکبر نے مان سنگھ کو جو اسناد دیئے تھے وہ بھی ہیں۔ اگر آپ چلیں تو مل سکتے ہیں۔ میں تیار ہو گیا اور پوچھا کہ کس طرح چلیں گے؟ وہ بولا اگر اونٹ پر چلیں تو آسانی سے اور جلد پہنچ جائیں گے۔ ویسے بھی اس علاقے میں کوئی گاڑی نہیں جا سکتی۔ میں نے وہ بھی منظور کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک اونٹ کرائے پر لے آیا جس پر کجاوا وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ مجھے اونٹ کی خالی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ اب وہ اونٹ ریت میں چلا تو آپ جانتے ہیں کہ اونٹ کا کوہان اونچا ہوتا ہے میں

جونہی سنبھل کر بیٹھتا نیچے سرک جاتا' جونہی بیٹھتا سرک جاتا۔ اوپر سے غضب یہ کہ اونٹ کے بال بڑے سخت ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری رانوں کی کھال اڑگئی اور بری حالت ہوگئی۔

خیر جوں توں کر کے گاؤں میں پہنچے۔ پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ اس شخص نے صحیح نشاندہی کی تھی وہاں اکبر کے فرامین ملے۔ وہ تو خیر ملے لیکن اب اسی اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر واپس جے پور آیا' حالت بہت خراب ہوگئی۔ دو روز تک تو بیمار رہا' خیر وہ اَسناد لا کر حیدر آباد کے باغ عام کے میوزیم میں محفوظ کرادی ہیں جو یہاں موجود ہیں۔''

قدرت اللہ شہاب صاحب نے ایک اور واقعہ سنایا اور یہ صرف واقعہ نہیں بلکہ نشاندہی ہے تاریخ کے ایسے ریکارڈ کی جو برصغیر کے ہر ضلع میں آج بھی موجود ہوگا اور جسے اگر محفوظ نہ کیا گیا تو ہماری تاریخ کی کتنی ہی گواہیاں مٹ جائیں گی۔ شہاب صاحب نے کہا:

''جو ریکارڈ ڈپٹی کمشنروں کے دفتروں میں ریکارڈ آفس میں محفوظ ہے وہ بڑا بیش قیمت ہے اور تاریخ کا بہت ہی بڑا خزانہ ہے۔ ایک زمانے میں جب میں ضلع جھنگ کا ڈپٹی کمشنر تھا تو مجھے شوق ہوا کہ ہیر رانجھا کی تحقیق کروں۔ تو میں نے ریکارڈ آفس کھلوایا جو سالہا سال سے بند پڑا تھا۔ اس میں رجسٹروں کے علاوہ سانپ ہی سانپ تھے۔ کسی طرح سے میں نے رجسٹر نکلوائے تو 35 سال کے رجسٹر ایک ہی شخص کے خوشخط ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کے ساٹھ سال کے رجسٹر بھی ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اتنے خوش خط کہ دیکھ کر انسان پرنٹنگ پریس کو بھول جاتا تھا۔ لیکن ہیر رانجھا کی تحقیق مجھ سے نہ ہوسکی البتہ مرزا صاحباں کا نشان ملا۔ وہ قصہ جھنگ کے علاقے کا تھا' وہاں پر مرزا صاحباں کی قبر بھی تھی۔ تو میں نے اس کی تحقیق کی۔ ان تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن ان کے خاندان کی تین پیڑھیوں تک اس ریکارڈ سے میں نے پوری تحقیق کر لی۔ تو اسی طرح ہر دفتر میں' ہر ڈپٹی کمشنر کے ہر ضلع میں جو ریکارڈ خانہ ہے اس کو بھی اسی طرح محفوظ کیا جانا چاہیے جیسے بہت ہی بڑے بیش بہا خزانوں کو محفوظ کیا جاتا ہے۔''

اور اب آخر میں کچھ ایسی پرانی عربی کتابوں کا ذکر جو کیرالہ کے ساحل پر مچھیروں کی ایک بستی میں چھینکے میں رکھی ہوئی پائی گئیں۔ ان کا واقعہ عبدالصمد خاں صاحب کو ان کے ایک دوست اے۔ جی فاروقی صاحب نے سنایا جو اپنے سرکاری فرائض کے سلسلے میں کیرالہ گئے تھے۔ صمد صاحب نے بتایا:

''فاروقی صاحب کا بیان ہے کہ وہ دیہاتی علاقے سے گزر رہے تھے تو راستے میں ایک پرانا قبرستان ملا جو بہت ہی خوبصورت تھا۔ قبریں اور ان کے کتبے اتنے عمدہ تھے کہ دیکھ کر ان سے رہا نہیں گیا اور اتر کر انہوں نے دیکھنا شروع کیا تو دس بجے صبح سے شام پانچ بجے تک اس کے مختلف کتبوں کو نقل کرتے رہے۔ پانچ بجے کے قریب کچھ گاؤں والے وہاں سے گزرے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ قبرستان کس کا ہے؟ کوئی اس کے وارث ہیں یا نہیں؟ تو

گاؤں والوں نے کہا کہ وہ جو جھونپڑیاں نظر آ رہی ہیں وہ لوگ آ کر کبھی چراغ جلا دیتے ہیں۔ وہ مچھیروں کی بستی تھی تو جب فاروقی صاحب وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہاں سب ہی مسلمان تھے جو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ہاں صاحب ہمارے باپ دادا کی قبریں ہیں۔ اچانک ان کو چھینکے پر کچھ کتابیں لٹکی ہوئی نظر آئیں، فاروقی صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا ہے تو گاؤں والوں نے کہا کہ صاحب، خدا کی کتابیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں دیکھوں؟ تو ان کا بیان ہے کہ وہ فلسفہ، منطق، طب اور ریاضی پر عربی کی بہت قدیم کتابیں تھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ تم ان کو قرآن سمجھ رہے ہو۔ یہ قران شریف نہیں ہے بلکہ حکمت کی اور حساب وغیرہ کی کتابیں ہیں۔ ان کو بیچ دو، تم کیوں رکھے ہوئے ہو؟ اس پر گاؤں والوں نے کہا کہ واہ صاحب واہ۔ ہم باپ دادا کی ہڈیاں بیچ دیں؟

تو آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ہمارے ہاں کتابوں کا ذخیرہ کس طرح منتشر ہے اور کیا کیا نایاب چیزیں دفن ہیں۔''

کل کا حال نہیں معلوم

لکھنؤ کے ٹوریا گنج سے چل کر اونچی نیچی' اور پر پیچ گلیوں سے گزر کر' کشمیری محلے سے ہوتے ہوئے ہم ایک پرانی عمارت میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی گلی میں کھلنے والی بڑی سی کھڑکی کی روشنی میں ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ بڑھاپے نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ گردن اور ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ بس یہ وہ عمر تھی جب انسان کو زندگی کے بکھیڑے چھوڑ کر عمر بھر کی تھکن کے بعد خوب بہت سا آرام کرنا چاہیے۔ مگر وہ بزرگ اپنی عمر سے بھی چار پانچ گنی عمر کی ایک کتاب پر جھکے' اس کی پرانی اور بوسیدہ جلد کو درست کر رہے تھے۔

یہ لکھنؤ کے نادر آغا تھے۔ جن لوگوں کو پرانی اور کمیاب کتابوں کی خرید و فروخت سے ذرا سی بھی دلچسپی ہے وہ نادر آغا صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔

تقریباً اسّی برس پہلے ان کے والد نے اس وقت کے رنگوں میں نہائے اور خوشبوؤں میں رچے بسے لکھنؤ میں پرانی کتابوں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ نادر آغا کو ان ہی سے یہ کاروبار اور پرانی کتابوں کو سنوارنے کا فن ورثے میں ملا۔ مگر یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے کی بس وہ آخری کڑی ہیں۔ اس کے بعد ان کے گھرانے میں اس کاروبار کو ختم ہی سمجھئے۔

پہلی بات جو ہم نے نادر آغا صاحب سے پوچھی وہ یہ تھی کہ پرانی کتابوں کی قدر کس زمانے میں زیادہ رہی۔ آج کے دور میں یا اگلے وقتوں میں؟ نادر آغا نے ایک چھوٹے سے واقعے میں سب کچھ کہہ سنایا۔ مخصوص لکھنوی لب و لہجے میں کہنے لگے۔

''مرزا رسوا کے یہاں ایک شام دوستوں کی نشست تھی۔ سب بیٹھے تھے کہ پرانی کتابوں کا تاجر ایک کتاب لے کر آیا۔ مرزا صاحب نے دام جو پوچھے تو ایسے دام تھے جو مرزا صاحب کی سمجھ میں نہیں آئے۔ کتاب واپس کر دی۔ لیکن کتب فروش کو جانتے تھے تو گھر آئے' بیوی سے کہا اپنے سونے کے کڑے دے دو اور ان کو جدا

کیا۔ جدا کر کے وہ کتاب تاجر سے جا کر لی۔ دوسرے دن مرزا صاحب کے یہاں پھر نشست ہوئی تو دوستوں سے کہنے لگے کہ میں نے وہ کتاب لے لی۔ دوستوں نے کہا وہ کیسے؟ دام تو اس کے اتنے زیادہ تھے' مرزا صاحب کہنے لگے: ہاں۔ کڑے کی جوڑی بیچ کے خریدی ہے۔ جوڑی تو دستیاب ہو جائے گی مگر کتاب نہیں ملے گی تو یہ قدر کا عالم تھا۔ لوگ اس اس صورت سے حصول کتب کے لیے جدوجہد کرتے تھے''۔

یہ واقعہ سنا کر انھوں نے حقّے کا ایک کش لیا اور ہم نے بڑے ادب سے پوچھا کہ آپ پرانی کتابوں کا یہ کاروبار کتنے عرصے سے کر رہے ہیں؟ کہنے لگے پینتالیس برس سے یہ خاکسار اس کام میں لگا اور عزت سے آج تک نبھ گئی' کل کا حال نہیں معلوم۔

اس کے بعد بات چلی تو ذکر نکلا کہ پرانی اور قیمتی کتابوں کے تاجر کو گلی کوچوں سے' پرانی رئیسوں کی حویلیوں سے' نوابوں کی ڈیوڑھیوں سے اور راجوں کے راجواڑوں سے قدیم کتاب کتنی مشکل سے ملتی ہوگی؟ اس پر نادر آغا بولے بڑی مشکل سے ملتی ہے اور اس سے زیادہ مشکل سے بکتی ہے' سمجھے جناب' قرض بکتی ہے۔ عجیب و غریب باتیں ہیں' کیا آپ سے کہیں؟ کہاں تک کہیں؟

مثال کے طور پر ایک یونیورسٹی نے ان سے کچھ پرانی کتابیں منگوائیں۔ یہ کتابیں بڑی محنت سے جمع کی گئی تھیں اور قیمتیں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ یہاں سے یہ داستان سرخ فیتے میں جکڑ جاتی ہے۔ وہ سرخ فیتہ جس میں حالات نے ایک غریب تاجر کے لیے بھوک' افلاس اور قرض کی گانٹھیں ڈال دی تھیں۔ نادر آغا اپنے کاروبار اور اپنے مصائب کے بارے میں کہنے لگے:

''ہے تو اتنی خدمت کہ انہی کتابوں سے سیکڑوں فیضیاب ہوتے ہیں۔ نہ معلوم کوئی کہیں سے کوئی کہیں سے فراہم کرتے ہیں۔ سال دو سال کے بعد فہرست مرتب کرتے ہیں پھر ادھر ادھر بھیجتے ہیں۔ اب اس یونیورسٹی سے چیک آیا ہے کہ ایک سال گیارہ ماہ کے بعد۔ اور اسے داخل کیے ہوئے آج ایک مہینہ بائیس دن ہوئے ہیں۔ آٹھ دن پیشتر تک کی خبر یہ ہے کہ بینک والوں نے کہا کہ اب ہم ریمائنڈر بھیجیں گے' آپ دس دن بعد خبر لیجیے۔ بینک والوں نے تو یہ کہہ دیا۔ اب ہم کھائیں کیا؟ لہٰذا اقتصادی حالت ایسی ہے اور وہ کشمکش ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ قرض لیجیے گا''۔

ہم نے نادر آغا صاحب سے پوچھا کہ آدھی صدی کے اس کاروبار میں آپ کو کوئی ایسا زمانہ بھی یاد ہے جب بڑے بڑے رئیسوں اور امیروں کے گھروں کی کتابیں سڑکوں پر بکنے آئی ہوں؟ کہنے لگے۔ بدنصیب راجواڑوں کے کتب خانے کوڑیوں کے مول بکے۔ مثلاً راجہ حسن پور' راجہ سلیم پور' راجہ جہانگیر آباد کا یہی ہوا۔ جہانگیر آباد کی کتابوں کا بہت برا حشر ہوا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پرانی کتابوں کے جن تاجروں سے میں ملا ان میں سے زیادہ تر کو خود بھی تحقیق اور حصول علم میں مصروف پایا۔ کوئی خود بھی مصنف ہے۔ کوئی اعلیٰ درجوں کے طالب علموں کو تحقیق میں مدد دے رہا ہے، کوئی خود اعلیٰ معیار کی تحقیق کر رہا ہے۔ یہی حال نادر آغا صاحب کا دیکھا۔ پینتالس برسوں میں جتنی بھی نایاب اور شاندار کتابیں ان کے ہاتھ لگیں، پہلے انہوں نے خود ان کتابوں پر اچھی خاصی تحقیق کی اور اپنے رجسٹروں میں ہر کتاب کا احوال لکھتے گئے۔ اس طرح اب تک ان کے پاس جو بیسیوں رجسٹر تیار ہیں وہ ڈاکٹریٹ کے بڑے بڑے مقالوں سے زیادہ بیش قیمت اور کارآمد ہیں اور کتنے ہی اہل علم حضرات نادر آغا صاحب سے درخواستیں کر رہے ہیں کہ جب کبھی وہ ریٹائر ہوں اپنے یہ رجسٹر انہیں دے دیں۔ میرے اصرار پر نادر آغا صاحب نے رجسٹر پر اپنا لکھا ہوا ایک اندراج پڑھ کر سنایا:

''کتاب کا نام ہے ''شاد نامہ'' تاریخ ہندوستان، منظوم، دو جلد۔ از بھوانی پرشاد شادؔ اور جانکی پرشاد۔ قلمی، خوش خط، پندرہ سطریں۔ کتاب کا آخری حصہ شاد کے بیٹے جانکی پرشاد نے پورا کیا۔ یہ کتاب ہندوستان کی ایک خاص اہم تاریخ ہے۔ کتاب کہیں کہیں سے چند ورق دیمک خوردہ ہے۔ 1269ھ میں مقام لکھنؤ تصنیف ہوئی۔ جلد اول کے شروع کے صفحات ناقص حالت میں ہیں۔ یہ کتاب اردو میں منظوم ہے۔ کئی ہزار ابیات ہیں، مختلف تاریخی کتابوں سے مصنف نے اقتباس کر کے یہ کتاب لکھی ہے۔ بھوانی پرشاد شادؔ آصف الدولہ کے عہد میں کم سن تھے۔ شاہی دربار سے تعلق تھا، اپنے چشم دید واقعات عہد آصف الدولہ سے لے کر عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ تک قلمبند کیے ہیں اور یہ واقعات کسی دوسری تاریخ اودھ میں نہیں ملتے۔ مصنف نے عہد نصیر الدین حیدر میں قضا کی۔ پھر ان کے بیٹے جانکی پرشاد نے اس کتاب کو 1269ھ میں ختم کیا اور تقریباً 1500 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ نایاب روزگار''۔

ایک اور تاریخی کتاب کے مصنف کے بارے میں نادر آغا صاحب نے بڑی تحقیق اور جستجو کے بعد اپنے رجسٹر میں جو اندراج کیا ہے وہ ہم نے بھی پڑھا ہے، لکھتے ہیں:

''ابراہیم سقہ دمشق میں رہتے تھے۔ سقے کا پیشہ تھا۔ پھر قسطنطنیہ میں تحصیل علم کی غرض سے قیام کیا۔ قرآن مجید خوش الحانی سے پڑھتے تھے، اس وجہ سے ان کی کافی شہرت ہوئی اور وہاں جامع مسجد حضرت ابوایوبؓ کے امام مقرر ہوئے۔ وہاں چالیس برس رہ کر پھر دمشق میں آئے اور مدرسہ جوریہ میں مدرس ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی اور ہاتھ پاؤں بھی آخر عمر میں بیکار ہو گئے تھے۔ اس حالت میں وہ بیان کیا کرتے تھے اور کافی لوگ ان سے عقیدہ رکھتے تھے اور ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ انہوں نے 1079ھ میں انتقال کیا''۔

یہ اقتباس سنا کر نادر آغا صاحب بولے: ''بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ چار سطریں تو میں نے پڑھ کر سنا

دیں مگر یہ میں نے حاصل کیسے کیں؟ اس کو بس میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی کتابیں دیکھنی پڑتی ہیں''۔

میں نے نادر آغا صاحب سے پوچھا کہ کتابوں کے متعلق اس تحقیق میں کیا ساری جستجو آپ تنہا کرتے ہیں یا اس میں کسی کا مشورہ بھی ہوتا ہے؟ کہنے لگے: پہلے بڑے بھائی کا مشورہ ہوتا تھا اب تو کوئی مشورہ دینے والا ہی نہیں۔ سمجھتے ہی نہیں کتاب، مشورہ کیا دیں گے؟ اردو کی کتاب تو سمجھ نہیں سکتے تو فارسی اور عربی کی کتاب کو کیا سمجھیں گے؟ ہم خود نہیں سمجھتے۔ صحیح کہتے ہیں آپ سے۔

میں نے ان سے پوچھا کے آپ کے گھرانے میں اسّی برس سے چلے آنے والے اس عظیم الشان کام کا مستقبل کیا ہے؟ اب اس ذمہ داری کو کون سنبھالے گا؟ میرا سوال سن کر وہ بجھ سے گئے' کہنے لگے: ہم کو افسوس ہے کہ ہماری کوئی اولاد اس لائق نہیں ہے' نہ ادھر توجہ کرتی ہے۔ ایک پڑھے لکھے صاحبزادے ہیں تو وہ کوئی توجہ نہیں کرتے۔

میں نے نادر آغا صاحب کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہا کہ آپ نے علم' ادب اور تاریخ کے اس قیمتی سرمائے کی واقعی بڑی خدمت کی ہے۔ اب جو وہ بولے تو محسوس ہوا جیسے پورا لکھنؤ بولا۔ ہنس کے کہنے لگے'' کچھ بھی نہیں کیا ہے بدنام ہو گئے ہیں''۔

آخر میں مَیں نے کہا کہ آپ نے ان کتابوں کو بہت عزیز رکھا ہوگا۔ آپ ان کتابوں کی بڑی حفاظت کرتے ہوں گے۔ میری بات سن کر ضعیف کتب فروش نے سرہانے رکھی ہوئی کتابوں پر نگاہ ڈالی اور بولا:

''جی ہاں! حفاظت تو کرتے ہیں مگر یہ کہ ہماری حد تک حفاظت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری اولاد سے نہ ہو سکے۔ ہم کو خود اپنے انجام کی فکر ہے کہ ہم نے ایک ایک کتاب کتنی محنت سے حاصل کی ہے اور اس کو محفوظ کر کے رکھا ہے' اب خدا جانے اس کا حشر کیا ہوگا''۔

اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد ہی نادر آغا چل بسے اور ان کے کاروبار پر بھی تالے پڑ گئے۔

کچھ کھویا کچھ پایا

تقریباً ایک سو سال ہوئے مصر میں ایک چھوٹا سا قدیم مقبرہ کھولا گیا۔ اس میں ایک لڑکی کی میت' ایک پرانی کتاب پر سر رکھے چین کی نیند سو رہی تھی۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھا کر کتاب نکالی گئی اور اس طرح یونان کے شاعر ہومر کی شہرۂ آفاق تصنیف ایلیڈ کا دوسرا حصہ آج کے انسان کے ہاتھ لگا۔

مصر کے مقبروں' چین کے غاروں' دریائے نیل کے کنارے ہزاروں سال پرانے کوڑے کے انباروں اور یونان اور روم کی خانقاہوں سے قدیم علم کے وہ تمام ذخیرے ملے ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو ہم اگلے وقتوں کے حکیموں' مفکروں' شاعروں' مورخوں اور ڈرامانگاروں کے نام سے بھی واقف نہ ہوتے۔

کچھ یہی حال اپنے برصغیر کا رہا ہے۔ ہزاروں کتابوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں موجود تھیں لیکن یا تو آگ' سیلاب' دیمک اور جہالت نے انہیں مٹا ڈالا یا ہو سکتا ہے کہ وہ اب بھی کہیں موجود ہوں مگر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہوں۔ یہ باب کچھ کھو جانے اور کچھ مل جانے والی کتابوں کا ہے۔

برصغیر میں پھیلی ہوئی خانقاہوں میں اب بھی قدیم کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں۔ چھ سو سال پرانے شاعر ملا داؤد کی مشہور ہندی نظم ''چنداین'' بہار میں منیر شریف کی خانقاہ سے ملی تھی۔ ملا داؤد امیر خسرو کے زمانے کے قریب ہوئے تھے اور ہندی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی مثنوی چنداین کا تاریخ کی کتابوں میں تو ذکر ملتا ہے لیکن خود یہ مثنوی کہیں نہیں مل رہی تھی۔ ہندوستان کے ممتاز تاریخ دان پروفیسر سید حسن عسکری منیر شریف کی خانقاہ میں جایا کرتے تھے۔ باقی احوال پروفیسر صاحب نے خود سنایا:

''ایک روز ہم وہاں کے سجادہ نشین کے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے ٹین کا ایک بکس منگوایا۔ اس بکس میں کچھ پاشان اوراق تھے۔ ان کی عبارت ہندی میں تھی اس لیے ہم پڑھ نہیں سکے لیکن اس کے سرنامے پر فارسی میں کچھ تھوڑا سا لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر ہم نے کہا کہ ارے یہ تو ملا داؤد کی چنداین معلوم ہوتی ہے جس کا کہ بدایونی نے

اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندی والوں کی مدد سے ہم نے اس پر لکھا۔ ہر طرف اس کا شہرہ ہوا کہ چندا ین مل گئی۔ چندا ین مل گئی۔ مطلب یہ کہ اس قسم کی چیزیں ایسے مقامات پر موجود ہیں''۔

ہندوستان کے شاعروں کا ایک نامور اور مستند تذکرہ 'آفتاب عالمتاب' کے نام سے مشہور ہے۔ وہ موجود تھا مگر گم ہو گیا۔ اور سنا ہے کہ پھر مل گیا ہے۔ اس کا احوال جناب مشفق خواجہ نے سنایا:

''قاضی محمد صادق اختر لکھنؤ کے ایک شاعر تھے۔ رہنے والے تو وہ ہگلی کے تھے لیکن لکھنؤ آ گئے تھے اور غازی الدین حیدر کے زمانے میں انہیں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ اردو، فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے آفتاب عالمتاب کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔

قاضی محمد صادق اختر کے ایک دوست تھے مولوی محمد یوسف جن کے پاس آفتاب عالمتاب کا ایک نسخہ تھا۔ بعد میں وہ بھوپال آ گئے۔ وہاں آ کر انہوں نے بھوپال کے شاہی خاندان کے افراد کے نام سے کچھ تذکرے لکھے اور ان کے پاس جو بہترین مواد تھا وہ تذکرہ روز روشن کے عنوان سے اور اپنے بیٹے کے نام سے لکھا۔ یہ تذکرے چھپ بھی گئے البتہ آفتاب عالمتاب کا کہیں پتہ نہ چلا۔ تو اندازہ یہ ہوا کہ ان کے پاس جو نسخہ تھا وہ ضائع کر دیا گیا، عمداً۔ بہر حال اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ لیکن ابھی حال میں ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے جو دہلی یونیورسٹی میں ہیں مجھے خط لکھا کہ یہ تذکرہ مل گیا ہے۔ فرخ آباد کے کسی رئیس کے پاس ہے''۔

یہ ہوئی آفتاب عالمتاب کی بات۔

ملا غواصی دکن کے بڑے نامور شاعر گزرے ہیں۔ وہ تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گولکنڈہ میں قطب شاہی دور میں موجود تھے اور ساتویں بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں گولکنڈہ سے بیجا پور تک دکنی شاعری کے میدان میں غواصی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ مگر تین صدیوں کا سفر طے کر کے ان کی صرف تین مثنویاں ہم تک صحیح سلامت پہنچیں اور غواصی کی کلیات کا نسخہ کہیں راہ میں مارا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دکنی اردو کی تاریخ کا ایک پورا باب زمانے کی نگاہوں سے چھپ گیا اور محقق کہنے لگے کہ ان کی تحقیق اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گی کہ اچانک ایک روز حیدر آباد ریڈیو سے اعلان ہوا اور دنیائے علم و ادب میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ بقول شخصے ''غواصی کی کلیات علیم الدین لا لیا ہے''۔

میں دکن گیا تو علیم الدین صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔ اب ضعیف ہو گئے ہیں۔ پرانی اور قیمتی کتابوں کے کاروبار میں عمر گزاری ہے اور کتنی ہی دستاویزیں ہندوستان کے گوشے گوشے سے لا کر اہل علم افراد اور اداروں کو فراہم کی ہیں۔

میں نے علیم الدین صاحب سے فرمائش کی کہ غواصی کا دیوان کیونکر آپ کے ہاتھ لگا' ذرا اس کی داستان ہمیں بھی سنائیے۔ یہ سوال سن کر بہت مسرور ہوئے اور اس واقعے کی ذرا ذرا سی تفصیل سنا ڈالی جس واقعے کی بدولت غواصی کا دیوان بیجاپور کے نالے میں بہنے سے بچ گیا اور دنیا میں اس کا جو واحد نسخہ ہے وہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہو گیا۔

تو علیم الدین صاحب کا وہ دلچسپ واقعہ پیش خدمت ہے' کچھ میری کتابی زبان میں اور کچھ ان کے دکنی لہجے میں۔

شہادتوں سے پتہ چلتا تھا کہ ملا غواصی کا دیوان کہیں موجود ضرور ہے۔ علیم الدین صاحب کہتے ہیں کہ وہ بیس سال سے اس کی تلاش میں تھے۔ ایک مرتبہ وہ حیدر آباد سے بیجاپور گئے اور وہاں اپنے ایجنٹ بانگی صاحب سے ملے۔ بانگی صاحب بیچارے علاقے بھر کی خاک چھاننے کے بعد جو پرانی کتابیں جمع کر کے لائے تھے وہ علیم الدین صاحب کے سامنے رکھیں تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں کلیات غواصی کے دو چار ورق موجود ہیں۔ علیم الدین صاحب حیرت اور خوشی سے اچھل پڑے اور بانگی صاحب سے پوچھا کہ یہ ورق تم کہاں سے لائے؟ بانگی صاحب نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ یہ پورا بستہ وہ صدر الصدور کی جاگیر سے لائے ہیں۔

علیم الدین صاحب فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ابھی اسی وقت صدر الصدور کی جاگیر پر چلو۔ بانگی صاحب نے بتایا کہ ان کی جاگیر بہت دور گاؤں دیہات کے علاقے میں ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے پہلے ٹرین سے پندرہ میل دور جانا ہوگا اور وہاں سے سات میل پیدل چلنا ہوگا اور وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ مگر علیم الدین صاحب اَڑ گئے۔ جس وقت وہ ٹرین میں بیٹھے' سورج غروب ہونے والا تھا اور جب گاڑی تلگی کے اسٹیشن پر پہنچی اندھیرا ہو چکا تھا اور اسٹیشن بالکل ویران پڑا تھا۔ چاروں طرف کھیت اور جنگل تھے اور دور دور تک انسان کا نام و نشان بھی نہ تھا' کیڑے اور جنگلی جانور شور مچا رہے تھے۔ بانگی صاحب نے مشورہ دیا کہ صبح کو بستی میں چلیں گے رات بھر یہیں اسٹیشن پر سو رہیں۔ مگر علیم الدین صاحب نے کہا ''میں ان کیڑوں کی آواز سے سو نہیں سکتا۔ معلوم نہیں یہاں کیا کیا ہے۔ سانپ ہے' بچھو ہیں' کیا ہے کدھر ہے۔ میں تو نہیں سو سکتا۔ جہاں تک ہو سکے پیدل ہی چلیں گے''۔

آخر بانگی صاحب کو ہار ماننی پڑی۔ انہوں نے کہا کہ سڑک کے راستے گاؤں کا فاصلہ سات میل ہے' اگر کھیتوں کے اندر سے چلیں تو گاؤں قریب پڑے گا۔ کلیات غواصی کے اشتیاق میں علیم الدین صاحب کھیتوں میں اتر گئے۔

جوار کی اونچی فصل تھی اور اس کے پتے چاقو چھری کی طرح تیز تھے۔ علیم الدین صاحب نے اپنے

ہاتھ بہتر یے شیروانی کی آستینوں میں چھپائے مگر وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ رات دو بجے یہ دونوں حضرات کڑگی نامی گاؤں میں پہنچے جو صدر الصدور کی جاگیر ہے۔ گاؤں کے کتے بری طرح بھونکنے لگے اور علیم الدین صاحب ڈرے کہ بستی والے اپنے گھروں سے نکل کر ان کی خبر لیں گے مگر بانگی صاحب انہیں پولیس چوکی کی عمارت میں لے گئے جو اس وقت خالی پڑی تھی البتہ آتش دان میں ایک بڑی سی لکڑی جل رہی تھی۔ دونوں نے باقی رات آتش دان کے سامنے گزار دی۔ نیند علیم الدین صاحب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور انہیں تو بس صبح کا انتظار تھا۔ جوں ہی دن کا اجالا ہوا انہوں نے بانگی صاحب سے کہا ''بھائی! وہ کون صاحب ہیں؟ کس کے پاس سے تم یہ ذخیرہ لائے تھے؟ ذرا ان کو بلا کے لاؤ''۔

بانگی صاحب گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک صاحب کو بلا لائے جو صدر الصدور کے رشتہ دار تھے۔ وہ کاندھے پر ناگل اٹھائے کھیتوں کو جاتے تھے۔ شہر سے آئے ہوئے شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس علیم الدین صاحب کو دیکھا تو جھک کر سلام کیا۔ ادب سے ملے اور مخصوص دکنی لہجے میں پوچھنے لگے: ''آپ کیا کھائے سو؟ اس پر بانگی صاحب نے جواب دیا ''کاں کھائے سو، رات میچ تو آئے''۔

مہمانوں کو بھوکا پا کر ان صاحب نے اپنا ناگل یعنی ہل وہیں پٹخا' دوڑے ہوئے اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر بعد آ کر مہمانوں کو اپنے ساتھ گھر لے چلے۔ وہاں جا کر علیم الدین صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ دستر خوان بچھا ہوا ہے' دہی ہے' بالائی ہے' پراٹھے ہیں اور انڈے ہیں''۔

علیم الدین صاحب رات بھر کے بھوکے تھے' اصولاً ڈٹ کر کھانا چاہیے تھا مگر ان کا دھیان تو کلیات غواصی میں لگا ہوا تھا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی اپنے ساتھی سے بولے ''بانگی صاحب! پوچھو تو سہی کہ کتابیں کہاں ہیں' کدھر ہیں؟'' اس پر صدر الصدور کے ان عزیز نے جواب دیا ''میرے پاس بھوت کتاباں تھے سب کنٹے میں بہا دیا ہوں' دو بوٹے وہاں رکھے ہوئے ہیں آپ چاہو تو دیکھ لو'' یعنی میرے پاس بہت کتابیں تھیں مگر سب نالے میں بہا دی ہیں صرف دو بوریوں میں بندھی ہوئی کچھ کتابیں پڑی ہیں آپ چاہیں تو ملاحظہ فرمائیے''۔

علیم الدین صاحب اس روز ندیدوں کی طرح ان بوریوں پر جھپٹے۔ میزبان نے کہا: آپ نے لے کر جاؤ۔ چنانچہ وہ دونوں تھیلے اٹھا کر واپس اسی پولیس چوکی میں آئے اور جلدی جلدی انہیں کھولا۔ علیم الدین صاحب کہتے ہیں ''میں نے جب کھول کر دیکھا' ماشاء اللہ سے اس میں غواصی کے اوراق موجود ہیں' علی نامہ نصرتی کا موجود ہے اس میں''۔

اب علیم الدین صاحب نے اپنے میزبان کو ان بیش قیمت کتابوں کا معاوضہ پیش کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ اس کے کچھ پیسے لے لیجیے جواب ملا۔ نکو نکو نکو۔ آپ لے کے جاؤ سب کنٹے میں بہا دیا ہوں یہ بھی کنٹے میں بہا

دینے کا تھا۔

غرض یہ کہ بڑی مشکل سے اور حجت کے بعد انہوں نے ساٹھ روپے قبول کیے اور مہمانوں کو اپنی بیل گاڑی پر بٹھا کر اسٹیشن تک چھوڑا۔ اس وقت علیم الدین صاحب کا جی چاہتا تھا کہ پر لگیں اور وہ اڑ کر حیدر آباد پہنچیں۔ بہر حال وہ گاؤں سے بیجاپور اور بیجاپور سے حیدر آباد پہنچے۔ غواصی کا دیوان ابھی ان کے بغل ہی میں تھے کہ شہر میں ڈھنڈورا ہو گیا کہ خود علیم الدین صاحب کے بقول ''غواصی کا کلیات علیم الدین لا لیا ہے''۔

یہ خبر سنتے ہی سالار جنگ نے نواب سعادت علی خاں کو بھیجا کہ وہ علیم الدین صاحب سے کلیات لے آئیں اور منہ مانگی قیمت دے دیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق ان دنوں دہلی میں تھے انہوں نے فوراً علیم الدین صاحب کو لکھا کہ کلیات کسی اور کو نہ دینا میں پانچ ہزار روپے بھیج رہا ہوں۔

مگر علیم الدین صاحب ٹال مٹول کرتے رہے اور کلیات کا نسخہ لے کر علامہ عمادی کے پاس پہنچے جو عربی کے بڑے عالم تھے اور دارالترجمہ کا ایک اہم ستون تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں کلیات غواصی کو کتب خانہ آصفیہ میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں وزیر اعظم نواب مہدی یار جنگ سے اجازت لے کر کتب خانے کی کمیٹی کا اجلاس طلب کر رہا ہوں اور کمیٹی کے اختیارات میں جتنی بھی رقم ہو گی تمہیں دلاؤں گا۔

دوسرے روز کمیٹی بیٹھی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کتاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی تھی مگر کمیٹی کے اختیارات محدود تھے۔ وہ تین ہزار روپے سے زیادہ نہیں دے سکتی تھی۔ عمادی صاحب نے علیم الدین صاحب کو بلایا اور انہیں سمجھایا کہ کمیٹی بے بس ہے ورنہ تمہیں بہت زیادہ رقم دی جاتی۔ اس وقت یہی تین ہزار روپے قبول کر لو۔ البتہ آئندہ کمیٹی تمہارا خاص خیال رکھے گی۔

علیم الدین صاحب نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

کلیات غواصی اب آندھرا پردیش آرکائیوز میں محفوظ ہے۔

دنیا میں اس کا بس یہی ایک نسخہ ہے۔

اور آخر میں دیوان غالب کے اس تاریخی نسخے کا احوال جو نسخہ بھوپال اور نسخہ حمیدیہ کے ناموں سے مشہور ہے۔ دیوان غالب کا یہ نسخہ 1821ء کے لگ بھگ لکھا گیا تھا جب غالب صرف پچیس برس کے تھے۔ پھر یہ نسخہ 1915ء کے قریب بھوپال میں کتب خانہ حمیدیہ یعنی نواب صاحب کی لائبریری سے نکل آیا۔ اس کی اشاعت ہوئی اور تقریباً تیس سال تک محفوظ رہ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ دیوان غالب کے اس نسخۂ بھوپال کے متعلق وہاں اردو کے استاد اور محقق جناب عبدالقوی دسنوی بتا رہے تھے۔

''یہاں جو نواب صاحب کی لائبریری تھی جہاں نسخہ بھوپال تھا اور وہ وہاں سے لاپتہ ہو گیا۔ پتہ نہیں کہاں

ہے، وہیں، جیسا کہ مجھے اطلاع ملی ہے، عربی فارسی کے بھی کافی نسخے تھے لیکن اب تک ان کا علم نہیں ہے۔ میں خود تلاش میں ہوں کہ کچھ چیزیں وہاں سے دستیاب ہو جائیں۔ وہ یا تو کسی صندوق میں بند ہیں یا کسی ایسے کمرے میں بند ہیں جہاں لوگ جا نہیں رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نسخہ بھوپال بھی وہیں کہیں چھپا ہوا ہے"۔

ایسی باتیں سن کر ہم جی ہی جی میں پوچھتے ہیں کہ محل میں کتابیں موجود ہوں اور خود محل والوں کو ان کا علم نہ ہو یا ان کا خیال نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے؟

اندر کہیں سے ایک سہما سہما سا جواب آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے!

غالب کوئے ملامت میں

گزشتہ باب میں دیوان غالب کے کھوئے جانے کی بات ہو رہی تھی۔ اس باب میں بھی ہم اسی کوئے ملامت کو جا رہے ہیں۔

سات اپریل، انیس سو انہتر کی صبح دلی کے ایک اردو روزنامے میں یہ اشتہار شائع ہوا: مرزا غالب کی تحریر دستیاب۔

ضروری اطلاع

ہر خاص و عام کو اور حکومت بہار، خصوصاً حاجی عبدالحمید صاحب، مالک ہمدرد دواخانہ دہلی، اور وہ ادارے جو غالب کے لٹریچر یا اس کی تحریر سے دلچسپی رکھتے ہوں، یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ میرے پاس مرزا غالب کی خود نوشت بیاض، غیر مطبوعہ موجود ہے۔ اس کی خریداری کے لیے مجھ سے ملیں یا خط و کتابت کریں۔

نوٹ: بیاض کی قیمت کم سے کم چھ ہزار روپے ہوگی۔ توفیق احمد قادری چشتی، امروہہ، ضلع مرادآباد۔

عین ان دنوں جب دنیا بھر میں غالب کی صد سالہ تقریبات منائی جا رہی تھیں، امروہہ سے پرانی کتابوں کے تاجر توفیق احمد صاحب کا یہ اعلان ایک دھماکا ثابت ہوا کہ انہیں ایک ایسا دیوان غالب مل گیا ہے جو خود غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور وہ بھی ایسا دیوان جو کبھی شائع نہیں ہوا۔ توفیق احمد صاحب نے خود اس نادر روزگار بیاضِ غالب کی قیمت چھ ہزار روپے لگائی۔

اردو کی تاریخ میں غالب کی نسبت سے یہ ایک بہت بڑا اور اہم واقعہ تھا۔ ہندوستان کے خبر رساں اداروں نے یہ خبر ساری دنیا میں پھیلا دی۔ بیاض غالب کی دھوم مچ گئی۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ کچھ عرصے بعد دہلی اور لاہور سے بیاض غالب کے عکس بھی شائع ہو گئے۔

اب ضرورت تھی کہ بیاض غالب کے اصل نسخے پر ماہرین کی تحقیق شروع ہو اور غالب کی شاعری پر

پڑے ہوئے باریک اور دبیز سارے ہی پردے اٹھیں مگر ڈرامے کا پردہ جتنی شان سے اٹھا تھا اتنی ہی خاموشی اور پر اسرار خاموشی سے گرا پڑا۔ دیوان غالب لاپتہ ہو گیا اور یہ حال اب کسی حال نہیں کھلتا کہ وہ کہاں ہے' کس کے پاس ہے' کون اسے چھپائے بیٹھا ہے اور اس چھپانے میں مصلحت کیا ہے؟

اب ہم اس داستان کو شروع سے دہراتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کہانی کے مختلف کردار خود کیا کہتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم امروہہ کے توفیق احمد قادری چشتی صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھا کہ انہیں بیاض غالب کا یہ یکتائے روزگار نسخہ کہاں سے اور کیسے ہاتھ لگا؟

انہوں نے کہا: ''ایک مخطوطہ' نسخہ غالب بخط غالب 5 اپریل 1969ء کو میں نے بھوپال سے گیارہ روپے کا خرید کیا تھا۔ میں یہاں سے تقریباً سات آٹھ ہزار روپے کی پونجی لے کر بھوپال گیا۔ وہاں جانے کے بعد وہاں کے کباڑیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ایک کباڑی نے مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو کتاب دلوائیں گے۔ وہاں ایک پرانی کتابوں کا بیوپاری تھا اس نے کہا ہم کو اپنی کتابیں دکھائیں۔ جب اس نے اپنی الماری کھولی تو بہت سی کتابیں نکلیں۔ دیوان غالب بھی نکلا۔ اب ہم نے سب سے پہلے دیوان غالب پر ہاتھ نہیں رکھا بلکہ ہر کتاب کو پوچھتے چلے گئے۔ یہ ہمارا تجارتی گر تھا اور آخر میں ہم نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب کی کیا قیمت مانگتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ بتائیں۔ ہم نے کہا آپ بتایئے۔ اس پر ہم نے وہی تاجرانہ گر اختیار کیا اور کہا کہ ہمارے ہاں ایک اصول ہے کہ بیٹے کا نام باپ ہی رکھتا ہے۔ آپ اس کی قیمت بولیے۔ انہوں نے اولاً پچیس روپے طلب کیے۔ ہوتے ہوتے دس روپے پر سودا ہوا۔ اور ایک روپیہ انہوں نے اور لیا ہم سے''۔

میں نے توفیق احمد سے پوچھا: ''کیا آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کتاب کتنی اہم ہے؟''

جواب ملا: جی! مجھے اندازہ ہو چکا تھا۔

امروہہ کے توفیق احمد صاحب کی اس روایت کی تصدیق کرنے ہم بھوپال پہنچے اور ان تاجر کتب کی تلاش شروع کی جن سے توفیق صاحب نے یہ دیوان غالب خود ان کے بقول صرف گیارہ روپے میں خریدا تھا۔

بھوپال میں ہم نے ایک صاحب' جناب محمود حسن کو ڈھونڈ نکالا جو نہ صرف ان تاجر کتب سے بلکہ اس دیوان غالب کے معاملے سے بھی واقف تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ امروہہ کے توفیق احمد صاحب کو یہ دیوان غالب کس نے دیا تھا؟

جواب ملا ''شفیق الحسن صاحب نے۔ ان کو یہ نسخہ ابراہیم پورے میں ایک پٹھان کباڑی کے ہاں سے ردی میں مل گیا تھا اور پھر انہوں نے امروہے کے تاجر کو دیا تھا''۔

اب ہم شفیق الحسن صاحب کی تلاش میں نکلے۔ قاری ہیں، بھوپال کی ایک مسجد میں ملے۔ ہم نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ مروہہ کے توفیق احمد صاحب آپ سے بیاض غالب صرف گیارہ روپے میں لے گئے تھے؟ شفیق الحسن نے کہا ''وہ تو میں نے مزید تحقیق اور تصدیق کے لیے انہیں عاریتاً اور امانتاً دی تھی۔ اسے وہ گیارہ روپے کی ایک کتاب کے اندر رکھ کر لے گئے تھے''۔

ہم نے کہا کہ وہ تو یہ بتاتے ہیں کہ آپ نے پچیس روپے مانگے تھے لیکن معاملہ گیارہ روپے پر طے ہو گیا۔ اس پر شفیق الحسن صاحب نے کہا ''یہ واقعے کے بالکل خلاف ہے، بلکہ واقعہ وہی ہے کہ انہوں نے تاریخ ٹونک مطبوعہ، گیارہ روپے میں مجھ سے خریدی تھی۔ اس میں یہ اوراق غیر مجلد رکھ کر وہ بدھوارا میں اسماعیل صاحب کے پاس لے گئے جن کا وہاں کتاب گھر ہے اور وہی کہا کہ گیارہ روپے میں خرید کر لایا ہوں۔ مفتی نورانی صاحب بھی اتفاق سے وہیں بیٹھے تھے چنانچہ وہ سمجھے کہ یہ سب گیارہ روپے میں خرید لایا ہے جبکہ وہ مخطوطہ عاریتاً اور امانتاً دیا گیا تھا، فروخت نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں صریحاً غلط بیانی ہے جس کا وہ بعد میں اعتراف بھی کر چکے ہیں اور نیاز مند قاری شفیق الحسن خان کے نام مِلک ہونا بھی عدالت میں تسلیم کر لیا ہے''۔

''گویا قانوناً اس کے مالک آپ ہیں؟''

''جی ہاں! قانوناً میں ہی اس کا مالک ہوں''۔

اس دعوے کی تصدیق کے لیے ہم نے امروہہ کے توفیق احمد صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ طے ہو چکا ہے کہ بیاض غالب کا اصل مالک کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا ''جی ہاں، مالک طے ہو چکا ہے۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ اس کا مالک میں ہوں اور مولانا عرشی کے صاحبزادے سے میرا ایگریمنٹ ہوا تھا۔ انہیں تسلیم ہے بلکہ تمام دنیا تسلیم کرتی ہے کہ اس کا مالک توفیق احمد ہے۔

یہاں سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے صاحبزادے یعنی رام پور کے اکبر علی خاں عرشی زادہ بھی اس داستان میں شامل ہو گئے۔ عرشی زادہ صاحب تقریباً بیس برسوں سے غالب کے قلم کی تمام تحریروں کے عکس جمع کر رہے ہیں اور اب تک کوئی ایک ہزار تحریریں جمع کر چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسٹیٹ آرکائیوز، آلہ آباد کے جلال الدین صاحب امروہے سے بیاض غالب کے چند صفحوں کے فوٹو اتار کر عرشی صاحب کو دکھانے لائے۔ مولانا نے وہ عکس بیٹے کو دکھائے چنانچہ عرشی زادہ کہتے ہیں ''وہ جن صفحات کے فوٹو لائے تھے ان میں آخری صفحے یعنی ترقیمے کا فوٹو بھی تھا جو ذرا زیادہ صاف بھی تھا۔ اس میں اسد اللہ خاں جہاں لکھا ہوا تھا میں نے اسے دیکھا وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا غالب کے خط میں ہونا چاہیے۔

اب اکبر علی خاں عرشی زادہ صاحب کی دلچسپی بڑھی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ پھر امروہہ میں توفیق احمد

صاحب تک آپکی رسائی کیسے ہوئی اور بیاض غالب کا اصل نسخہ آپ کو کیسے ملا؟ انہوں نے بتایا: اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے سرور صاحب نے علی گڑھ سے لکھا کہ بھئی تم اتنے عرصہ سے غالب کی تحریروں پر کام کررہے ہو۔ ذرا تم امروہہ تک چلے جاؤ اور جاکر دیکھو کہ یہ بیاض واقعی غالب کے قلم کی ہے یا نہیں؟ اس طرح میرے شوق کو مہمیز ہوئی اور میں دوسرے ہی دن امروہہ پہنچ گیا۔ وہاں توفیق احمد صاحب سے جو اس کے مالک تھے وہ مخطوطہ دیکھا۔ وہ میرے ساتھ یہاں رام پور آگئے۔ ابا نے بھی دیکھا میں نے اس سے نوٹس تیار کیے۔ وہ میرے پاس ہی چھوڑ گئے اور پھر یہ طے ہوا کہ ہم اسے شائع کردیں تاکہ اس کی معلومات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔

اس واقعے کے پانچ مہینے بعد یہ دیوان غالب دہلی سے نسخہ عرشی زادہ کے عنوان سے شائع ہوگیا۔ اس کے صرف چند سو نسخے چھاپے گئے اور فی نسخہ قیمت تین سو روپے مقرر کی گئی۔ یہاں سے کچھ اور دلچسپ واقعات شروع ہوتے ہیں۔ تقریباً ان ہی دنوں پاکستان کے مشہور ادبی جریدے نقوش کا غالب نمبر چھپا جس میں اسی بیاض غالب کا وہی سارا کا سارا عکس نسخہ لاہور کے عنوان سے موجود تھا۔ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ اب شور اٹھا کہ بیاض غالب اسمگل ہوکر پاکستان چلی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ آواز اٹھی کہ یہ بیاض غالب اصلی نہیں، کسی جعلساز کا کارنامہ ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد اور محقق انصار اللہ صاحب نے اور بعد میں ادارۂ مطالعات غالب، سری نگر کے کمال احمد صدیقی صاحب نے دعویٰ کیا کہ بیاض غالب کا مخطوطہ جعلی ہے۔ اور ابھی امروہے کے توفیق احمد صاحب نے جو اپنی اس دریافت سے بھاری منافع پانے کی توقع کررہے تھے اپنا حصہ طلب کرنا شروع کیا ہی تھا کہ بیاض غالب کا اصل نسخہ لاپتہ ہوگیا۔ ہم نے توفیق احمد صاحب سے پوچھا کہ نسخے کا کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: ''جب عرشی زادہ صاحب نے میری کتاب چھاپی تو نہ اس کا معاوضہ مجھے دیا اور نہ ہی میرا دیوان اب تک لوٹایا جو ان کے ناجائز قبضے میں اب تک موجود ہے''۔

اس پر ہم نے عرشی زادہ صاحب سے پوچھا کہ دیوان غالب کا اصل مخطوط کس کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے کہا۔ میں حتمی طور پر تو نہیں بتا سکتا۔ میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے اس کے مالک توفیق احمد کو واپس کردیا تھا۔ انہوں نے ڈاک کے ذریعے' کارڈ پر مجھے اس کی رسید بھیجی تھی وہ میرے پاس آج بھی محفوظ ہے''۔

چونکہ اسی دوران بیاض غالب کا عکس پاکستان میں بھی شائع ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں ایک قیاس آرائی یہ شروع ہوئی کہ کسی نے بھاری رقم لے کر وہ نسخہ چوری چھپے ملتان میں انگریزی کے استاد اور غالبیات کے ایک ماہر لطیف الزمان خاں صاحب کو پہنچا دیا۔ لطیف الزمان صاحب نے اسے نقوش کے مدیر محمد طفیل صاحب کے حوالے کیا جنھوں نے راتوں رات' بلکہ دہلی کے نسخہ عرشی زادہ سے بھی پہلے ہی شائع کردیا۔ اس پر ہم نے ملتان کے جناب لطیف الزماں خاں صاحب کو لکھا کہ یہ تاریخی کتاب آپ تک کیونکر پہنچی؟ انہوں نے جواب میں لکھا:

''دہلی میں جو فوٹو گرافر عرشی زادہ صاحب کے لیے بیاض غالب کے مختلف صفحات کے فوٹو اسٹیٹ تیار کر رہا تھا اس نے بھی اندازہ کر لیا کہ قیمتی نسخہ ہے' اس نے بھی فوٹو اسٹیٹ 63 صفحات کے اپنے پاس محفوظ رکھے۔ یہی صفحات میرے ایک عزیز نے بھاری قیمت دے کر خرید ے اور مجھے بھیجے اور میں نے طفیل صاحب کو ملتان بلا کر یہ صفحات سپرد کر دیئے۔ اس طرح طفیل صاحب نے بیاض غالب بخط غالب شائع کی''۔

اسی دوران بیاض غالب کی صداقت پر شبہ ظاہر کیا جانے لگا۔ کمال احمد صدیقی صاحب نے بیاضِ غالب' تحقیقی جائزہ کے عنوان سے چار سو ستاسی صفحوں کی ایک پوری کتاب صرف یہ ثابت کرنے کے لیے شائع کر دی کہ بیاض غالب کا یہ نسخہ جعلی ہے اور بخط غالب نہیں۔ ہم نے لطیف الزماں خاں صاحب سے پوچھا کہ خود آپ نے اس بارے میں کچھ تحقیق کی ہے انہوں نے جواب میں لکھا:

''میں نے کالی داس گپتا رضا صاحب کو جو غالب کے عاشق ہیں' بمبئی خط لکھا کہ وہ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ رضا صاحب کا خیال ہے کہ مخطوطہ جعلی نہیں ہے اور یہ کہ کمال احمد صاحب صدیقی تحقیق کے آدمی نہیں ہیں۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مخطوطہ جعلی ہے''۔

ہم نے ادارہ یادگار غالب' کراچی کے جناب مرزا ظفر الحسن صاحب کو لکھا کہ آپ کیا کہتے ہیں؟ ان کا جواب آیا۔

''جب کمال احمد صدیقی نے اتنی مفصل اور جامع کتاب بیاض غالب کے خلاف لکھ دی تو اب وہ لوگ جنہوں نے بیاض غالب کی تعریف میں زبردست خطبات دیئے تھے خاموش کیوں ہو گئے' انہوں نے جواب میں کچھ لکھا کیوں نہیں''۔

اس کے تین جواب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اعتراض کرنے والے تحقیق کے میدان میں اتنے مستند نہیں کہ مانے ہوئے محقق ان کے جواب دیتے پھریں۔ یا پھر اعتراضات پڑھ کر انہیں بھی یقین ہو چلا کہ بیاض غالب کا نسخہ جعلی ہے۔ یا یہ کہ اس داستان کے کسی کردار کی نیت ٹھیک نہیں رہی اس لیے اب کسی کو کیا پڑی ہے کہ بیاض غالب کی حمایت میں زبان کھولے اور ایک ایسی شے کی وکالت کرے جو نہ معلوم کہاں' کسی کی تاریک الماری میں بند ہے اور جس کے بارے میں اب یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ شاید ہمیشہ بند رہے گی''۔

جہاں رہے سلامت رہے

یہ بتائیے کہ کیا آپ کے گھر میں باپ دادا کے زمانے سے چلی آنے والی پرانی کتابیں موجود ہیں؟ کیا ان میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں؟ کہیں وہ بکسوں یا الماریوں میں بند تو نہیں پڑی ہیں؟ پڑی ہیں تو کیا آپ انہیں کبھی کبھار دن کی روشنی دکھاتے رہتے ہیں یا نہیں؟ آپ نے انہیں کیڑوں مکوڑوں سے اور گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے کچھ کیا ہے یا نہیں؟ کیا آپ کتابوں کو احتیاط سے رکھنے کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اپنی قدیم اور قیمتی کتابوں کو کسی بڑے کتب خانے میں جمع کرا دیں جہاں وہ طویل عرصے کے لیے محفوظ ہو جائیں اور آپ کی یادگار بن کر باقی رہ جائیں؟

اگر آپ نے گزشتہ اوراق پر نگاہ ڈالی ہے تو اس قسم کے سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہوں گے۔ آپ کی نمائندگی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے سوال ہم نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب سے پوچھے جن کی عمر کا بڑا حصہ کتب خانوں اور آرکائیوز میں ریسرچ کرتے گزرا ہے۔ انہوں نے غریب گھرانوں میں، رئیسوں کی حویلیوں میں، لائبریریوں میں اور سرکاری دفتروں میں ان گنت کتابیں اور بے شمار دستاویزیں دیکھی ہیں، ان کی حالت دیکھی ہے۔ ان کے مسائل دیکھے ہیں اور ان مسائل کے حل پر غور کیا ہے۔ ہم نے ڈاکٹر شکیب سے پوچھا کہ آپ نے عام لوگوں کے گھروں میں جو کتابیں دیکھیں ہیں کیا وہ محفوظ ہیں یا ان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے؟ جواب ملا:

''ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ضائع ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔ ہندوستان میں تو عام طور پر جو رجحان ہے وہ یہ کہ اب وہاں کی معیشت اور زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا ہے۔ فرد کی گرفت میں اب زیادہ چیزیں نہیں رہیں۔ اب تو زیادہ تر چیزیں عوام کی گرفت میں آ رہی ہیں وہ دن نہیں رہے جب بڑے بڑے نواب اور امراء اور جاگیر دار ہوتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے مکان تھے جن میں کتب خانے تھے، ملازمین تھے، سہولتیں تھیں اور وسائل تھے وہ

کتابیں اکٹھا کرتے تھے اور ان کی حفاظت کر سکتے تھے لیکن اب معاشرے اور حیثیت دونوں میں ایسا بڑا فرق آیا ہے کہ فرد کے بس میں یہ نہیں رہا کہ وہ ان کتابوں کو محفوظ کرے''۔

ہم نے پوچھا کہ عام لوگوں کے گھروں میں آپ نے کیسی کیسی چیزیں دیکھیں اور کیا آپ نے ان چیزوں کے مالکوں کو ان کی اہمیت اور بچانے کی ضرورت سے باخبر پایا؟ ڈاکٹر شکیب نے جواب دیا:

''وہ مخطوطے جو خوشنویسی، خطاطی اور علم و ہنر کے نادر مرقعے ہیں جن کا ایک ایک صفحہ ایسا ہے کہ اس کو کسی میوزیم میں آویزاں کیجیے تو وہاں کی رونق بڑھ جائے مگر ان کا حال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو ان کی اہمیت کا احساس نہیں یا احساس ہونے کے باوجود یہ معلوم نہیں کہ ان کا تحفظ کیسے کریں''۔

اس کے بعد ہم نے ڈاکٹر شکیب سے ان کی رائے پوچھی کہ جو افراد یا چھوٹے اور نجی ادارے پرانی کتابوں کے ذخیرے لیے بیٹھے ہیں اور اس ورثے کو بچانا ان کے لیے دشوار ہوتا جا رہا ہے، ایسے لوگوں یا اداروں کے لیے کیا بندوبست ہونا چاہیے؟ انہوں نے کہا:

''یہ بہتر ہے کہ ان کی انجمنیں بنائی جائیں جن کو ذمہ دار اور بزرگ لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے اور اس کے ایسے قوانین بنائے جائیں کہ یہ ادارے ہمیشہ ذمہ دار لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں''۔

برصغیر میں چھوٹے کتب خانے بہت سے ہیں جو بظاہر چھوٹے ہیں مگر علم کے شاندار ذخیرے ان کی تحویل میں ہیں۔ ایسے کتب خانوں کو کہاں لے جایا جائے؟ ان کا کیا کیا جائے؟

''ہونا یہ چاہیے کہ جہاں ایسی عمارتیں اور تحفظ کے وسائل اور کتابوں کو رکھنے والے اور ان کی مرمت کرنے والے ماہرین موجود ہوں، چھوٹے کتب خانوں کو ان میں ضم کر دینا چاہیے''۔

مگر یہ افراد اور یہ ادارے اور چھوٹے کتب خانے اپنے اس سرمائے پر ناز کرتے ہیں اور اسے خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اپنی کتابیں کسی بڑے ادارے کو دے دیں گے تو کیا وہ اپنے اثاثے سے محروم نہیں ہو جائیں گے۔

''بہتر یہ ہوگا کہ ایسے ادارے بنائے جائیں جن میں مختلف چھوٹے اداروں کو ان کے اپنے حق ملکیت اور حق تحفظ برقرار رکھتے ہوئے اپنی چیزوں کو وہاں محفوظ کرانے کا اختیار ہو جیسے بینک میں لے جا کے ڈپازٹ کرتے ہیں۔ یہ ادارے بھی اپنے مخطوطے وغیرہ وہاں جمع کرا دیں اور اس بات کی اجازت ہو کہ کتب خانے کے ماہرین ان کی مرمت کریں اور ان کی تصویریں بنوائیں اور ریسرچ اسکالر ان سے استفادہ کر سکیں''۔

آخر میں ہم نے ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب سے پوچھا کہ برصغیر کے گھرانوں میں اور کتب خانوں میں جو پرانی کتابیں اور دستاویزیں محفوظ ہیں ان کا، آپ کے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اور اس مسئلے کا حل کیا

ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا:

''فارسی کے جو قدیم شکستہ کے اسالیب ہیں ان کے جو نظم ونسق کے محاورے اور اصطلاحات ہیں وہ اب لوگوں کی گرفت سے نکلتے جارہے ہیں۔ اس پر نہ کوئی مناسب ریسرچ پراجیکٹ ہیں نہ اس کو جاننے والے ہیں۔ اکثر دفتروں، آرکائیوز، ریکارڈ کے آفس اور کتب خانوں کا یہ حال ہے کہ وہاں لوگ بیٹھے ہیں اور ان کے پاس ہزاروں، لاکھوں اسناد ہیں لیکن ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ بس ان پر نمبر پڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی طرح یہی حال یورپ کے بعض ملکوں میں ہے مثلاً ہنگری میں فارسی کا سب سے قدیم ریکارڈ ہے لیکن اس کے ڈبوں پر انہوں نے نمبر ڈال دیئے ہیں لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ ان کے اندر کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں قلمی کتابیں اور اسناد اس وقت تک محفوظ نہیں ہوسکتیں جب تک وہاں کی جامعات میں قدیم زبانوں کے رسم الخط، محاورے اور مسائل کے لیے باقاعدہ نصاب میں کوئی چیز شریک نہ کی جائے۔ ضروری ہے کہ لوگ قدیم رسم الخط پڑھیں اور قدیم اسناد کی پہچان پیدا کریں۔ یہ بھی ایک فن ہے جس کو زندہ کریں۔ اگر کوئی شخص کوئی کتاب یا دستاویز اٹھائے اور اس کو اندازہ بھی نہ ہو کہ وہ سیدھا اٹھائے ہوئے ہے یا الٹا اٹھائے ہوئے ہے تو وہ اس کا تحفظ نہ کر سکے گا''۔

یہ ہوئی آندھرا پردیش کے ڈاکٹر شکیب کی رائے۔ بھوپال کے جناب عبدالقوی دسنوی نے خود اپنے گاؤں دسنہ کی مثال دی جو بہار میں پٹنہ کے قریب ہے۔ وہاں بہت بڑا کتب خانہ ''الاصلاح'' تھا جس میں بہت سے نادر مخطوطے بھی تھے۔ لیکن جب دسنہ والوں نے محسوس کیا کہ اب اس کتب خانے کی حفاظت کرنا دشوار ہے تو اس کا سارا قیمتی حصہ پٹنہ میں خدا بخش لائبریری میں منتقل کر دیا۔ دسنوی صاحب نے بتایا کہ اس کے بعد وہاں ایک روش چل گئی اور ذاتی کتب خانے اور دوسرے چھوٹے کتب خانے رضا کارانہ طور پر خدا بخش لائبریری میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس لائبریری کی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ صوبے میں ہے لیکن مرکزی حکومت اسے لاکھوں روپے دے رہی ہے۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ حکومت ہر صوبے میں کم سے کم ایک بڑی لائبریری کو وسائل دے کر ایسا بنا دے کہ کتابوں کا وہ سارا سرمایہ جو ادھر اُدھر بکھرا ہوا ہے اس میں جمع ہو سکے۔ وہاں مائیکروفلمنگ اور زیروکس کاپی کا اچھا بندوبست ہو۔ جو لوگ اپنے باپ دادا کی کتابیں خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے ان کی کتابوں کے عکس اتار کر وہاں محفوظ کر لیے جائیں اور ایک انتظام یہ بھی ہونا چاہیے کہ قدیم اور کارآمد کتابوں اور دستاویزوں پر کیمیاوی عمل کی اور جھلی چڑھانے کی اور مرمت کی سہولتیں عام لوگوں کے لیے کھلی ہوں۔ جو چاہے اپنی کتابیں وغیرہ لا کر اور کچھ معاوضہ دے کر یا بلا معاوضہ اپنی قدیم دستاویزوں وغیرہ پر کیمیاوی عمل کرالے اور انہیں محفوظ کروالے۔

میں نے اس سلسلے میں اپنے بزرگوں کے روّیے میں شدت پائی۔ اپنی طویل عمر میں انہوں نے کتنے ہی کتب خانے ضائع ہوتے دیکھتے چنانچہ برصغیر کی بعض کتابوں کے برطانیہ چلے جانے پر انہیں افسوس نہیں۔ مثلاً

اورنگ آباد کے بزرگ شاعر جناب سکندر علی وجد نے کہا ''اگر ہماری کتابیں یہاں سے چلی جائیں تو مجھے کوئی غم نہیں کہ وہاں محفوظ تو رہیں گی' یہاں محفوظ نہیں رہنے والی ہیں''۔ پٹنہ کے ممتاز تاریخ دان پروفیسر حسن عسکری صاحب نے کتب خانوں کے مٹ جانے کا احوال بیان کرنے کے بعد کہا: ''اسی وجہ سے ہم کہہ رہے ہیں کہ انگریزوں کا بڑا احسان ہے کہ وہ ہماری کتابیں لے گئے''۔

پھر گزشتہ دنوں پاکستان کے سرکردہ دانشور اور انشا پرداز جناب قدرت اللہ شہاب لندن تشریف لائے۔ ہم اپنے بزرگوں کے خیالات کی بات ان سے کر رہے تھے تو انہوں نے بھی اپنی رائے ظاہر کی اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں مرحوم اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی ملاقات کا دلچسپ واقعہ یوں سنایا:

''انڈیا آفس لائبریری میری بڑی محبوب لائبریری ہے۔ وہاں سے میں نے بڑا استفادہ کیا ہے۔ جب ملک تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا تو اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لائبریری کا بٹوارہ کر کے اسے دونوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تو اس پر باقی دوسرے معاملات کی طرح بحث شروع ہوگئی۔ 1961ء میں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے' ملاقات کی درخواست کی جو مانی گئی۔ اس کے بعد دہلی کے پالم ایئر پورٹ پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں ان کا ہمرکاب تھا اور اس میٹنگ کا ریکارڈ لکھنے کے لیے ان کے ساتھ موجود تھا۔ اس موقع پر فیلڈ مارشل ایوب خاں نے کشمیر سمیت ہندوستان اور پاکستان کے مسائل بیان کیے اور ان مسائل پر اپنا رویہ تفصیل سے بیان کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو غور سے سنتے رہے اور سننے کے بعد ایک آدھ منٹ خاموش رہے۔ میں سوچتا تھا کہ یہ شاید ان مسئلوں پر اب کوئی دوٹوک جواب دیں گے لیکن انہوں نے سر اٹھا کر کہا ''فیلڈ مارشل! انڈیا آفس لائبریری کا کیا ہوگا؟'' اس موضوع پر ایوب خاں صاحب کو پاکستان سے چلنے سے پہلے کسی نے بریف نہیں کیا تھا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا تم اس کا جواب دو تو میں نے کہا: سر! آپ دونوں سے میری درخواست ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔ یہ جہاں ہے وہیں رہے اور دونوں ممالک اپنے اپنے اسکالرز کو اور طالب علموں کو وظیفے دیں کہ وہ وہاں جا کر اس سے استفادہ کریں''۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اہم بات یہ نہیں کہ کتاب کہاں رہے؟ اہم بات یہ ہے کہ جہاں بھی رہے سلامت رہے۔

کڑی گم ہو جاتی ہے

یہ ایک یونیورسٹی کا ذکر ہے۔

میں لائبریری دیکھنے گیا۔ نہایت اچھی عمارت‘ بہت کشادہ کمرے جن کی الماریوں میں چنی ہوئی قطار در قطار کتابیں اور پھر مطالعہ گاہ کا لمبا چوڑا ہال۔ اس میں خاص طور پر سنجیدہ مطالعے کے لیے آراستہ ایسی میزیں کہ ہر میز پر تین طرف اسکرین تاکہ ہر طالب سر جھکا کر دھیان لگا کر پڑھے کوئی کہیں مخل نہ ہو۔ کسی کا کوئی ہرج نہ ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں خاموشی بھی تھی۔ سکون بھی تھا سب کچھ تھا مگر پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی کرسیاں خالی اور میزیں ویران پڑی تھیں۔

یہ کسی ایک لائبریری کا نہیں یہ بے شمار کتب خانوں کا سانحہ ہے۔ کتابوں کی حالت اگر خراب ہے تو اس کی کچھ ذمے داری ان کے قاری پر بھی آتی ہے جو انہیں تنہا چھوڑ گیا ہے۔

اردو کے نامور استاذ محقق اور انشا پرداز جناب گیان چند جین ان کتب خانوں کی باتیں کر رہے تھے جن میں علوم شرقیہ کی کتابیں چُنی ہیں۔ کہنے لگے:

”جس کتب خانے میں بھی جائیے ذاتی کتب خانوں کو چھوڑیے‘ اداروں کے کتب خانوں میں بھی مخطوطات گل رہے ہیں۔ دیمک کھا رہے ہیں اور خستہ حالت ہے۔ بڑی دقت یہ ہوگئی ہے کہ موجودہ نسل میں ان کے جاننے والے بہت کم ہیں۔ یونیورسٹیوں میں یہ ہو رہا ہے کہ لوگ ریسرچ کرنے آ رہے ہیں کیونکہ ملازمت کی خاطر ڈگری لینی پڑتی ہے لیکن ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ بیسویں صدی کے کسی زندہ ادیب پر تحقیق کر لی جائے۔ کسی ناول نگار پر یا کسی شاعر پر تھیسس لکھ دی جائے۔ اس میں بڑی سہولت یہ ہے کہ اس کے پاس جائیں گے اس سے سوانح پوچھ لیں گے۔ وہی تنقید لکھ کر دے دے گا اور کتاب تیار ہے۔ ایک ایک مصنف پر کئی کئی نے کام کیا ہے۔ لیکن پرانے ادب پر اور انیسویں صدی پر تحقیق کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ اٹھارہویں صدی اور اس سے

پہلے کی دکنی پر کام کرنے کے لیے کوئی آمادہ نہیں ہے۔تو یہ جو صورت حال ہوگئی ہے اس کا کیا کیا جائے۔اردو کے اساتذہ بھی کم ایسے ہیں جنہیں قدیم ادب سے دلچسپی ہو۔اس کے لیے ضروری ہے کہ فارسی جانتے ہوں۔اب فارسی کا علم ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر مخطوطات سے دلچسپی ہو اور ان کو ترتیب دیں' شائع کریں' اس میں ایک عمر صرف ہوتی ہے جس کا فی الفور کوئی حاصل ہوتا نہیں۔تو یہ بڑی دشواری ہوگئی ہے۔اردو کے ساتھ کہ اردو کا جو پرانا ذخیرہ اور خزینہ ہے اس کو کس طرح سامنے لایا جائے۔''

ہندوستان کے برعکس پاکستان میں اردو' فارسی' سندھی' پشتو' بلوچی' سرائیکی اور کشمیری وغیرہ کی قدیم کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا مسئلہ اتنا سنگین نہیں۔ پاکستان میں زیادہ بڑا مسئلہ ان کتابوں کو بچانے کا ہے۔مختلف گھرانوں میں نجانے کیسے کیسے نوادر موجود ہیں مگر کوئی دن جاتا ہے کہ وہ ختم ہو جائیں گے اور مستقبل کا مورخ اپنی بے بسی اور ہماری بے حسی پر آنسو بہایا کرے گا اس بارے میں جناب مشفق خواجہ نے پتے کی بات کہی۔

''ہمارے ہاں کوئی قانون ایسا نہیں بنا کہ ان نوادر کی حفاظت کی جائے۔دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں حکومتیں یہ ذاتی ذخیرے دو طرح سے حاصل کرتی ہیں۔ایک تو یہ کہ انہیں ان کا معاوضہ دیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ ان لوگوں میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں آپ کی یادگار کے طور پر طویل عرصے تک محفوظ رہیں گی۔ آپ کا نام ان کے ساتھ وابستہ رہے گا تو لوگ ان دو وجوہ سے اپنے ذخیروں کو الگ کر دیتے ہیں مگر ہمارے ہاں مخطوطات کی خریداری کے سلسلے میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے جتنا بھی کام ہوا ہے ایک شخص کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اور وہ تھے مرحوم ممتاز حسن' وہ مر گئے تو یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا ہے''۔

مشفق خواجہ تحقیق کے آدمی ہیں اور کتابوں کو جتنے قریب سے وہ دیکھتے ہیں اور کتابوں کی حالت زار پر جتنی تشویش انہیں ہوگی' عام لوگوں کو نہیں ہو سکتی۔ہم نے مشفق خواجہ صاحب سے جو کراچی میں رہتے ہیں' پوچھا کہ آپ ہی بتائیے اس بارے میں کیا ہونا چاہیے؟

''میری رائے تو یہ ہے کہ حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں سب سے پہلا کام تو یہ کرنا چاہیے کہ جہاں جہاں بھی ذخیرے ہیں ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ایسے لوگوں کو متعین کیا جائے جو ان مخطوطات کو محفوظ کرنے کا کام جانتے ہوں اس کے بعد ان ذخیروں کے کیٹلاگ بننے چاہئیں اور تحقیق کرنے والوں کو سہولتیں دینی چاہئیں اور جو اہم مخطوطے لاہور میں ہیں ان کے فوٹو اسٹیٹ کراچی میں اور جو کراچی میں ہیں ان کے فوٹو اسٹیٹ لاہور میں ہونے چاہئیں۔ یہ کام حکومت ہی کر سکتی ہے کوئی فرد تو کر نہیں سکتا''۔

جہاں جہاں کتابیں ہیں ان کی فہرستیں بننی چاہئیں۔ کچھ یہی بات جامعہ ملیہ دہلی کے استاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی کہی۔ان کی تجویز یہ ہے کہ یہ کام بہت سنجیدگی سے اور بڑی باقاعدگی سے اور ضابطے کے ساتھ

ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرستوں کے بارے میں پروفیسر نارنگ نے کہا:

''کچھ فہرستیں چھپی ہیں کچھ نہیں چھپیں۔ مثلاً خدا بخش لائبریری اور رضا لائبریری کے کچھ کیٹلاگ موجود ہیں۔ لیکن جہاں جہاں نہیں ہیں وہاں سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے مخطوطات کی فہرستیں، بلکہ وضاحتی فہرستیں چھاپی جائیں اور ایک سروس ایسی ہونی چاہیے جہاں سے معلوم ہو سکے کہ کون سی کتاب کہاں کہاں دستیاب ہے۔ یہ کام صرف علوم شرقیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے علوم اور دوسری زبانوں کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ اب فرض کیجیے کہ کوئی میر حسن کی مثنوی کے مخطوطے دیکھنا چاہتا ہے یا کلیات شاہ حاتم دیکھنا چاہتا ہے تو اسے اس قسم کی ڈاکومینٹیشن سروس کی مدد سے معلوم ہو جائے کہ یہ چیزیں کہاں کہاں ملیں گی۔ یہ ایک بہت بڑی کمی ہے''۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان میں پرانی کتابوں کو بچانے اور محفوظ کرنے کے لیے بڑا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میوزیم اور آرکائیوز عام لوگوں سے اہم کتابیں خرید رہے ہیں خصوصاً تاریخ کے موضوع پر دہلی کا نیشنل آرکائیوز کچھ عرصے پہلے تک خریداری کر رہا تھا اور نیشنل میوزیم میں یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ کتب خانوں کو حکومت سے معقول رقم مل رہی ہے اور گھرانوں میں موجود کتابوں کو بچانے کی کوششیں بھی ہوئی ہیں مگر یہ کوششیں بھی مسائل سے آزاد نہیں، جیسا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا:

''اگرچہ ملک میں ایک قانون بنا تھا کہ مخطوطات چونکہ قومی اہمیت کی میراث کا حصہ ہیں اس لیے ان کو رجسٹر کرایا جائے۔ وصلیاں ہوں، مخطوطات ہوں، تاریخی دستاویزات ہوں، دوسری پرانی ہاتھ کی تحریریں ہوں، انہیں رجسٹر کرانا ضروری قرار دیا گیا اور کچھ لوگوں نے کروایا بھی۔ لیکن ایک تو اس قانون کا عرفان عام نہیں ہے دوسرے یہ کہ اگر کوئی رجسٹر نہیں کراتا تو اس قانون کا نفاذ کس طرح ہو کیونکہ قانون کا نفاذ کرنے کے لیے دیانت دار عملے کی ضرورت ہوتی ہے اور سب سے بڑی کمی اس زمانے میں دیانت ہی کی ہے۔ چنانچہ اس کا نفاذ بالکل نہیں ہو رہا ہے اور جو لوگ رجسٹر نہیں کراتے وہ نہیں کراتے اور وہ اس کا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور کبھی کبھی اتنے گھاٹے میں رہتے ہیں کہ وہ چیزیں گم ہو جاتی ہیں، چوری ہو جاتی ہیں اور کہاں سے کہاں پہنچتی ہیں۔ بعض اوقات تو چلیے کسی میوزیم میں پہنچ گئیں یا کسی دوسری لائبریری میں پہنچ گئیں۔ بیچ میں کسی نے کچھ کما لیا، کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ چیز راہ میں ماری جاتی ہے اور کسی ایسے غلط آدمی کے ہاتھ پڑ جاتی ہے جو اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا اور اس طرح قومی میراث کی وہ کڑی ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتی ہے''۔

بس ہماری کُل گفتگو یہیں ختم ہوتی ہے اور کیسی ستم ظریفی ہے کہ پروفیسر نارنگ کی بات کا جو آخری جملہ ہے وہی ہم سب کی پہلی تشویش ہے۔ دعویٰ تو ہمارا یہ ہے کہ ہمارا یہ دور شعور کا دور ہے۔ ٹھیک ہے، لیکن قومی میراث کی کڑیاں اگر ایسے دور میں گم ہوئیں تو یقین ہے کہ آنے والے زمانے میں لوگ ہمارے شعور پر اور شعور کے دعوے پر ہنسیں گے۔

یا شاید روئیں گے۔

پہلا باب

گلاچی

ڈیرہ اسماعیل خاں

جناب رضا علی عابدی صاحب! السلام علیکم

آپ کا پروگرام کتب خانہ سنا۔ بہت پسند آیا۔ اب بات یہ ہے کہ میرے پاس چند پرانے قلمی نسخے موجود ہیں۔ یہ قدیم اور قیمتی کتابیں میرے دادا جنگ آزادی 1857ء کے وقت دہلی سے اپنے ساتھ یہاں ڈیرے کے محفوظ علاقے میں لائے تھے مگر اب مجھے ان کتابوں کی طرف سے پریشانی ہے۔ آپ نے اپنے پروگرام میں نایاب کتب کے تباہ ہو جانے کی بات بار بار کہی۔ یہ بات مجھے بھی بہت ستاتی ہے اور پریشان بھی کرتی ہے۔

ان کتابوں میں پانچ سو سال پرانی تفسیر جواہر ہے جو جامع الازہر' قاہرہ میں لکھی گئی ہے۔ تقریباً تین سو سال پرانا قرآن پاک کا ایک بہت قیمتی نسخہ ہے اور شیریں فرہاد (فارسی) کا ایک بہت قدیم نسخہ ہے۔ مزید برآں کچھ اور پرانی کتابیں بھی ہیں۔ خدارا مجھے ان کتابوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ بتا دیجیے اور ان دوائیوں کے نام بھی بتا دیجیے جو ان کو کیڑوں مکوڑوں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اگر ہو سکے تو کچھ دوائیاں ذاتی طور پر لندن سے بھیج دیں، میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

یہ سب باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ یہ کتابیں مجھے بے حد عزیز ہیں۔ یاد رکھیے مر جاؤں گا لیکن یہ کتابیں

کسی اکیڈمی، لائبریری یا ادارے کو نہیں دوں گا، بلکہ کسی کو دکھاؤں گا بھی نہیں (سوائے آپ کے) اس لیے خدارا جلد کچھ کیجیے۔

والسلام

ع۔ص

☆......☆......☆